UNIVERSAL LIBRARY
OU_224461
UNIVERSAL LIBRARY

22461

دائرۃ المعارف

یعنی

معارف اعظم گڈہ

کی

۵۵ ویں جلد

از جنوری ۱۹۴۵ء تا جون ۱۹۴۵ء

مرتبہ

سید سلیمان ندوی

مطبوعہ معارف پریس اعظم گڈہ

فہرست مضمون نگاران معارف

جلد ۵۵

جنوری سنہ ۱۹۴۵ء تا جون سنہ ۱۹۴۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	اسماے گرامی	صفحہ
۱	جناب مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی	۱۳۵، ۱۵۴
۱/۲	جناب سید ابو عاصم صاحب ایم۔ اے، دیسنہ	۱۵۹
۲	جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی اعظم گڈھ،	۵۰، ۸۷، ۱۱۴
۳	جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی	۴۳، ۹۲
۴	مولانا سید ریاست علی صاحب ندوی	۱۸
۵	جناب ریاض الحسن صاحب	۱۲۰
۶	سید سلیمان ندوی	۳، ۴۳، ۷۵، ۹، ۹۹، ۱۲۹
۷	جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب ایم اے	۱۲۴
۸	جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی استاذ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی،	۱۰۷
۹	جناب غلام مصطفیٰ خان صاحب ایم اے لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی، برار	۶۷
۱۰	جناب محمد خلیل صاحب تجاروی بی ایس سی کالج علیگ، تجارہ، راجپوتانہ،	۱۵
۱۱	جناب محمد شجاع الدین صاحب ایم اے لاہور،	۹
۱۲	جناب مولوی محمد صابر صاحب ساٹری ندوی متعلم مسلم یونیورسٹی علی گڈھ،	۱۴۲
۱۳	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱۱، ۲۵، ۴۷، ۴۹، ۷۲، ۹۲، ۱۲۴، ۱۲۷
۱۴	مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن،	۲۷، ۵۱
۱۵	جناب ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی لکچرار اردو لکھنؤ یونیورسٹی،	۱۵۶
۱۶	جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صدر شعبۂ فلسفہ جامعۂ عثمانیہ	۱۳۱

شعراء

شمار	اسماے گرامی	صفحہ
۱	جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی اعظم گڈھ،	۱۷
۲	جناب روش صدیقی،	۴۶
۳	سہیل :- جناب اقبال احمد خان صاحب سہیل، اعظم گڈھ	۱۵۸
۴	ہلال :- جناب عزیز احمد صاحب ہلال، جھانسی	۱۵۸
۵	جناب یحییٰ اعظمی	۴۶

فہرست مضامین

جلد ۵۵

جنوری ۱۹۴۵ءتا جون ۱۹۴۵ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

شمار	مضمون	صفحہ
	شذرات	۳،۵۹،۲۵۹، ۹۷،۷۳، ۱۲۹
	مقالات	
۱	ابن خلکان کے فارسی ترجمے،	۴۳
۲	اردو کی دو قدیم کتابیں اور ان کا زمانۂ تصنیف،	۱۵
۳	اردو کی دو قدیم کتابیں،	۱۵۶
۴	استدراک بر ترجمۂ ابن خلکان،	۱۵۴
۵	انڈونیسیا،	۱۴۲
۶	خطبۂ صدارت	۹۹،۷۵
۷	روم کا ایک خط	۱۲۰
۸	زمانۂ حاضر کا انسان اور اقبال	۱۳۱
۹	سوزنی	۶۷
۱۰	شیخ اکبر محی الدین بن عربی کا نظریۂ علم،	۵۱،۲۷
۱۱	"عرفانیات فانی"	۸۷،۵۸
۱۲	غیر اسلامی ممالک میں سود و قمار کا حکم	۱۱۴، ۱۰۷
۱۳	کیا مدینۃ العلوم طاشکبری زادہ کی تصنیف ہے،	۹۳
۱۴	مقبرۂ ابو الحسن تربتی	۹
۱۵	واگھبٹ یا شفائے محمودی	۳۵
۱۶	ہندوستان میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت	۳
	ادبیات	
۱	"تابش سہیل	۱۵۸
۲	غزل روشن	۴۶
۳	غزل ہلال	۱۵۸
۴	کلام احسان	۱۷
۵	غزل یحییٰ اعظمی	۴۶
	باب التقریظ والانتقاد	
۱	"ادب اور زندگی"	۱۲۴
۲	مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر،	۱۸
	مطبوعات جدیدہ	۷،۱۲۴، ۱،۷۲، ۱۲۷، ۱۵۹

جلد ۵۵ ماہ محرم الحرام ۱۳۶۴ھ مطابق ماہ جنوری ۱۹۴۵ء عدد ۱

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۱-۲
ہندوستان مین مسلمانون کا نظام تعلیم وتربیت	سید سلیمان ندوی،	۳-۸
مقبرہ ابوالحسن تربتی	جناب محمد شجاع الدین صاحب ایم اے (لاہور)	۹-۱۴
اردو کی دو قدیم کتابین اور ان کا زمانۂ تصنیف	جناب محمد خلیل صاحب تجاروی، بی اس سی علیگ، تجارہ، راجپوتانہ	۱۵-۱۶
کلام احسان	جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی اعظم گڈھ،	۱۷
مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے افکار وخیالات پر ایک نظر	مولانا سید ریاست علی ندوی	۱۸-۲۳
مطبوعات جدیدہ	"ض ع"	۲۴

بسم اللہ الرحمن الرحیم

شذرات

مالوہ کی ریاست دھار کا علاقہ نوین اور دسوین صدی ہجری مین تقریبًا دو صدیون تک اسلامی حکومت کا مرکز رہ چکا ہی، اور وہان مالوہ کے خلجی سلاطین اور ان کے جانشین دوسرے مسلمان فرمانرواون کی بہت سی تاریخی عمارتین ہین، جو محکمۂ آثار قدیمہ کی نگرانی مین ہین، ان مین خلجی سلاطین کی تعمیر کردہ ایک جامع مسجد ہے، اس سے متصل سلطان محمود خلجی المتوفی ۸۷۳ھ کا مقبرہ ہے جس مین اس کے قریب زمانہ کے ایک اور بزرگ شیخ سعد اللہ المتوفی ۹۰۲ھ بھی محو خواب ہین، اس کے دوسری سمت ایک دوسرے بزرگ مولانا کمال الدین کا مقبرہ ہے، ان کے علاوہ مسجد کے آس پاس اور بہت سے مقابر و مزارات ہین، ریاست دھار اور محکمۂ آثار قدیمہ دونون نے جامع مسجد مین مسلمانون کا نماز پنجگانہ ادا کرنے کا حق قائم رکھا ہے، اور وہ برابر اس مین نماز پڑھتے چلے آتے ہین،

ہم کو دھار کی ایک اطلاع سے معلوم ہوا ہے کہ آج سے آٹھ دس سال پیشتر بعض شرارت پسند اشخاص نے مسجد کو بھوج شالہ

بنانے کی تحریک اٹھائی تھی، جو ریاست کی انصاف پسندی اور عاقبت اندیشی سے کامیاب نہ ہو سکی، اور ۱۹۳۵ء مین اس نے مسجد کی حیثیت اور مسلمانون کے حق نماز کو قانونی طور سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا تھا، معلوم ہوا ہے کہ اب پھر یہ فتنہ انگیز تحریک اٹھائی گئی ہے، اور اس سلسلہ مین گذشتہ نومبر کو دھار کے ہندو مسلمانون مین فساد بھی ہوا جس مین ریاست کے حکام کا رویہ مسلمانون کے لئے ناقابلِ اطمینان تھا، اور ان کو خطرہ پیدا ہو گیا ہے کہ یہ مسجد بھوج شالہ کی شکل نہ اختیار کرلے، ہم کو ریاست دھار کی عاقبت اندیشی سے امید ہے کہ وہ ۱۹۳۵ء کے منصفانہ فیصلہ کے مطابق مسجد کی حیثیت اور اس مین مسلمانون کے حق نماز کو قائم رکھے گی، اور اس مین کسی ایسے تغیر کو راہ نہ دے گی، جس سے کسی نئے فتنہ کا دروازہ کھل سکے، محکمۂ آثار قدیمہ کا مقصد قدیم تاریخی عمارتون کا تحفظ ہے اس لئے مذکورۂ بالا مسجد مین اس کے قانون کی رو سے بھی کوئی تغیر نہیں کیا جا سکتا،

آنریبل پرشوتم داس ٹنڈن ہندی ساہتیہ سمیلن کے پرجوش رکن ہین، اس لئے ان کی ہندی نوازی محلِ تعجب نہین، اب انھون نے ہندی کی حمایت کا ایک نیا اور اچھوتا پہلو پیدا کیا ہے، اور منطقی استدلال سے سوراج کا ہندی زبان سے تعلق ثابت کر دکھایا ہے، چنانچہ آل انڈیا ہندی جرنلسٹ کانفرنس کانپور کا افتتاح کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ "ہندی قومیت ہے، قومیت کانگریس ہے، اور کانگریس سوراج ہے۔" (لیڈر ۲۵ دسمبر ۴۴ء) گویا دوسرے الفاظ مین ہندی سوراج ہے، اس استدلال کے بعد کس ہندستانی کے لئے اختلاف کی گنجایش باقی رہ جاتی ہے، معلوم نہیں سوراج کی اس نئی تعبیر سے کانگریس کے دوسرے ذمہ دار ارکان کو کہان تک اتفاق ہے، اگر کل کو ٹنڈن جی نے ہندو مذہب کو سوراج قرار دیدیا، تو ہندوستان کی دوسری قومون کا ٹھکانا کہان ہوگا، ٹنڈن جی کو ہندی کے پرچار کی پوری آزادی حاصل ہے لیکن کانگریس کے ذمہ دار رکن کی حیثیت سے اس قسم کے مسائل مین کانگریس اور سوراج کو درمیان مین لانا کانگریس کے ساتھ نادانی کی دوستی ہے،

ان کے ایک دوسرے ہم مشرب مسٹر ساورکر نے ہندو مہاسبھا کے اجلاس بلاسپور مین ہندوستان کی تقسیم کے جواب مین گندھارا (افغانستان) کو بھی ہندوستان مین شامل کرنے کا عزم ظاہر کیا ہے، (لیڈر ۲۸ دسمبر ۴۴ء) یہ ارادہ نہایت مبارک اور تجویز بہت معقول ہے، غالباً پاکستان کے حامیون کو بھی اس کے ماننے مین کوئی تامل نہ ہو، بلکہ اگر مسٹر ساورکر ایران و ترکستان کو بھی جہان تک کسی زمانہ مین بدھ مذہب کا اثر پہونچا تھا شامل کر لین تو اور زیادہ مناسب ہے، لیکن اس بارہ مین ان کو پہلے مالوی جی اور ڈاکٹر مونجے سے مشورہ کر لینا چاہئے، ورنہ کہین سعدی "از دست خویشتن فریاد" کی مثل نہ صادق آجائے،

ناظرین کو معلوم ہے کہ معارف کی ضخامت اب کل ایک تہائی رہ گئی ہے، گو صفحات کی سطرین زیادہ کر دی گئی ہین، اور خط خفی کر دیا گیا ہے، لیکن اس سے اس کمی کی پوری تلافی نہیں ہو سکی ہے، اس لئے معارف کے ابواب کے صفحات بھی گھٹا دینا پڑے اور اس سے متعلق مضامین، استفسارات، ادبیات و مطبوعات جدیدہ کی آمد کا سلسلہ ویسے ہی جاری ہے، اور ان کی اشاعت و جواب خصوصاً ریویو کے تقاضے کے خطوط برابر آتے رہتے ہین اس لئے گذارش ہے کہ صفحات کی کمی کی وجہ سے کچھ تاخیر ضروری ہوگی لیکن انشاء اللہ دیر سویر مضامین، منظومات کی اشاعت و استفسارات کے جوابات اور کتابون پر تبصرہ ہوتا رہے گا، اور یہ جبری تاخیر قابلِ معافی تصور کی جائے گی،

مقالات

ہندوستان مین مسلمانون کا نظامِ تعلیم وتربیت

(۲)

مصنف کے نزدیک جدید و قدیم کے توازن کی یہ شکل ہے کہ مثل سابق نصاب تعلیم مین دینیات تفسیر وحدیث وفقہ کی ایک ایک کتاب مثلاً جلالین ومشکوٰۃ وشرح وقایہ رکھکر باقی دینی کتابون کو ہٹا کر ان کی جگہ غیر دینیاتی علوم منطق وفلسفہ وریاضی وہندسہ واصول وکلام وادب کو دی جائے، ان کا منشا یہ ہے کہ جس طرح گذشتہ اسلامی حکومتون کے زمانہ مین تعلیم کی صورت یہ تھی، کہ فارسی اور متوسطات تک تعلیم کاروباری اور مذہبی اشخاص دونون کی مشترک تھی، کاروباری، وسرکاری ملازمت پیشہ یہان تک پہنچ کر اپنے کاروبار مین لگ جاتے تھے، اور جو باقاعدہ عالم ہونا چاہتے تھے، وہ پھر باقی علوم کی تکمیل کرتے تھے، اسی طرح اب بھی ہوسکتا ہے کہ ایک ہی نظامِ تعلیم ونصابِ تعلیم ساری قوم مین جاری ہو جس مین ابتدائی دینی واخلاقی تعلیم اردو وفارسی وعربی یا انگریزی اور قدیم وجدید علوم کی تعلیم متوسطات کی حد تک بشمول کتب مختصرۂ تفسیر وحدیث وفقہ مشترک سب کو یکسان دی جائے، اور اس کے بعد کاروباری لوگ کاروبار مین لگ جائین، اور علوم وفنون کی تکمیل والے اپنی تکمیل کے اسباق وعلوم پڑھین، بات کہنے مین تو صاف ہے لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ گذشتہ اسلامی حکومتون اور ان کے زمانون کو بھی واپس لایا جائے، یا موجودہ حکومت کو اس اصلاح کے قبول کرنے پر آمادہ کیا جائے، یا پھر نمونہ کے طور پر کوئی ایسی درسگاہ قائم کی جائے اور اس کی کامیابی کو آزمایا جائے، اور دیکھا جائے کہ مصنف نے اپنے اس نظریہ سے جو دینی ودنیاوی کامیابی وابستہ کی ہے، وہ کہان تک درست ہے، دار العلوم ندوہ مین اوس کے قریب قریب ایک طریقہ اختیار کیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے کہ وہان عالمیت کے نام سے چھ برس کی تعلیم مشترک ہے جس مین صرف ونحو وادب وفقہ واصول وحدیث وقرآن پاک وعقائد اور انگریزی حساب وجغرافیہ تاریخ وجومیٹری کی تعلیم ہوتی ہے اس کے ختم کرنے کے بعد عالمیت کی سند دی جاتی ہے، اب اس کے بعد یا طالب علم یہین تین برس کی فضیلت کی تعلیم پاکر عالم ہوتا ہے، اور یا انگریزی اسکول مین داخل ہوکر کاروباری تعلیم حاصل کرتا ہے، لیکن نتیجہ اس کا یہ دیکھا گیا ہے کہ یہ چھ برس کی تعلیم اسکول جاکر بالکل دھل جاتی ہے،

اب ایک نیا نظامنامۂ تعلیم مولانا سید ابو الاعلیٰ صاحب مودودی امیر جماعت اسلامی نے پیش کیا ہے، جس کو انھون نے آج سے چار سال پیشتر دار العلوم ندوہ کے ایک جلسہ مین پیش کیا تھا، اب وہ اسی اساس پر خود ایک درس گاہ قائم کرنا چاہتے ہین جس مین دینی ودنیاوی کی تقسیم نہ ہوگی، بلکہ ایک تعلیم ہوتی، اور یکسان ہوگی،

بہرحال ایک خیال ہے جب وہ مجسم ہو تو اُس کا عیب وہنر معلوم ہو، خود راقم نے ۱۹۲۶ء مین خطبۂ صدارت مجلس العلماء ترچناپلی مین جو کچھ بیان کیا ہے اور "مسلمانون کی آیندہ تعلیم" کے عنوان سے ۱۹۳۲ء مین جامعۂ ملیہ مین جو مقالہ پڑھا تھا، اور ۱۹۳۷ء مین شعبۂ علوم وفنون ایجوکیشنل کانفرنس کی صدارت اور ۱۹۳۸ء مین جامعۂ دار السلام عمرآباد کے خطبۂ اسناد مین جو کچھ عرض کیا ہے وہ پرانے

ہونے کے باوجود بھی اس وقت پڑھنے کے قابل ہے،

مصنف نے اس کے بعد اپنی ابتدائی تعلیم کا اجمالی نقشہ کھینچا ہے، اور پانچ امور اساسی بیان کئے ہین، (۱) صرف وہی چیزین پڑھائی جائین، جو استادون سے پڑھے بغیر نہین آتین (۲) اردو کی تقویت کے لئے فارسی اور فارسی کی تقویت کیلئے عربی پڑھائی جائے (۳) صرف وہ عربی پڑھائی جائے، جس مین ہماری دینی کتابین ہین، (۴) اس عربی کو قرآنی پارون اور فقہی وحدیثی متون کے ذریعہ سے پڑھایا جائے (۵) صرفی ونحوی طول طویل مباحث کی جگہ صرف کام کے مسائل کے رسالے پڑھائے جائین، مصنف کا خیال ہے کہ ان پانچ اصولون کے زیر نظر نو سال کا کورس میٹرک تک انگریزی زبان اور حساب کے ساتھ پڑھایا جائے، اور اس کے بعد قرآن وحدیث وفقہ کی تعلیم جلالین، مشکوٰۃ اور شرح وقایہ کے ذریعہ سے بی اے تک دی جائے، اور اس کے ساتھ چار سال مین دوسرے جدید اختیاری ومناسب مضامین پڑھائے جائین، اس کے بعد ایم اے کا اختصاصی درجہ آئے گا، جس مین کسی ایک مضمون کی تخصیص کی جائے گی،

مصنف نے جو کچھ اوپر فرمایا ہے اس کے رو سے جامعۂ عثمانیہ کا شعبۂ دینیات، مسلم یونیورسٹی کا شعبۂ تھیالوجی ایم اے اور ڈھاکہ یونیورسٹی کا شعبۂ اسلامک اسٹڈیز اس کے قریب کا خاکہ ہے، مصنف کا خیال ہے کہ اس وحدتِ تعلیم سے قدیم وجدید دینی اور دنیاوی اور علما، اور تعلیم یافتہ کے سارے فرقِ مراتب ختم ہو جائین گے، فنعم الوفاق،

اس کے بعد مصنف نے بعض اون علما کا تذکرہ چھیڑا ہے جنھون نے ہندوستان سے باہر جا کر ناموری حاصل کی، اس سلسلہ کے لکھتے وقت خود مصنف کو بھی شک تھا کہ یہ بیان یہان بے محل تو نہین، مگر افادہ کا سیلاب محل اور بے محل کو نہین دیکھتا، وہ تو اپنی روانی مین آپ بہتا ہے،

آخر مین درجۂ فضیلت کی تعلیم کے متعلق گفتگو فرمائی ہے (صفحہ ۳۰۵) سے یہ گفتگو شروع ہوئی ہے، مصنف کے خیال کے مطابق اس درجہ کی تعلیم حسب ذیل چند اساسی اصول پر قائم کی گئی تھی،

۱- علوم عالیہ سے پہلے چند علوم آلیہ یعنی ورزشی علوم سکھائے جاتے تھے، یعنی ایسے علوم جن کے مسائل اور دعاوی واضح اور صاف نہ ہون، بلکہ ان مین ابہام، پیچ اور پیچیدگی زیادہ ہو، جن کا ہر دعویٰ آسانی سے ثابت نہ ہو سکتا ہو، بلکہ جو کلیہ بھی بنایا جائے، وہ ٹوٹ سکتا ہو، اعتراض اور جواب کے سلسلہ کی اپنے اندر کافی گنجائش رکھتا ہو، مقصد یہ تھا کہ طلبہ مین خود سوچنے اور تنقید کرنے اور مسائل کے دقیق پہلوؤن تک پہنچنے کی مشق پیدا ہو، لیکن مصنف اپنی نئی تجویز مین دوبارہ اوس کو لانے کی کوشش کرکے اپنے بیان مین تضاد پیدا کرنا چاہتے ہین،

پھر معلوم نہین ان علوم آلیہ یا ورزشی علوم سے مصنف کی مراد کیا ہے، عام طور سے تو صرف ونحو اور منطق کو علوم آلیہ کہا جاتا ہے، مگر علوم آلیہ کی یہ تعریف تو ان علوم پر صادق نہین آتی، ہان یہ سچ ہے کہ ان علوم آلیہ پر جو کتابین زیر درس تھین اون کتابون مین یہ اغلاق، اہمال، اور پیچیدگی اور سوال وجواب کے ایک سلسلۂ دراز کی صورت .... موجود تھی، دوسرے قدیم علما کی طرح مصنف کا بھی یہ خیال ہے کہ ان مغلق وپیچیدہ اور اعتراض در اعتراض کتابون کے رکھنے سے غرض محض طالب علم کے ذہن کی تشحید اور جولانی تھی، ہو گی، اس وقت اس کی ضرورت ہو گی، مگر اب تو وہ نقائص سے معمور ہے، اول یہ کہ طالب علم اسی اعتراض در اعتراض کی بھول بھلیون مین پھنس کر رہ جاتا ہے، اور اصل حقیقت سے کوسون دور ہو جاتا ہے، دوم یہ کہ شروع ہی سے اوس کی ذہنیت اس طریقۂ تعلیم کے بدولت کج ہو جاتی تھی، سیدھی بات بھی ان کو الٹی معلوم ہوتی تھی، ہر بحث

کو سمجھنے کے بجائے اوس کے توڑنے کی فکر غالب ہوتی ہے سوم یہ ہو کہ فنی مسائل کے بجائے حواشی و شروح و قال اقول کو علم سمجھا جاتا ہو

یہ علوم آلیہ اب بھی پڑھائے جاتے ہیں، مگر ندوہ نے اس میں یہ اصلاح کی ہے کہ مغلق کتابوں پر سہل و رواں کتابوں کو ترجیح دی جائے، فن کے اصل مسائل پر زور دیا جائے، ان علوم سے جو غرض ہے، وہ حاصل ہو، شروح و حواشی ہنہیات و قال اقول سے پرہیز کیا جائے، ہم کو تسلیم ہے کہ ہمارا نیا مولوی پرانے درس یافتہ مولویوں کی طرح بات میں بات اور بال کی کھال نہیں نکال سکتا، اور نہ ہر سیدھی بات کو ٹیڑھے طور سے کہنے کا خوگر ہوتا ہے، اور اسی لئے وہ اس نظر سے اگلوں کے مقابلہ میں سطحی ہوتا ہے لیکن یہ علم کے باب میں قدیم و جدید خیال کے نقطۂ نظر کا فرق ہے،

۲- دوسری اساسی بنیاد مصنف نے یہ بتائی ہے، کہ تلاش کرکے ایسی کتابیں ان فنون میں رکھی جاتی تھیں، جو نسبتہً تفصیل کے بجائے مجمل زیادہ ہوں، عبارت اتنی سلیس نہ ہو کہ بآسانی مطلب سمجھا جا سکے، اور اوس سے مقصود ان کے خیال میں یہ تھا کہ دوسروں کی سوچی ہوئی باتوں کے سمجھنے میں تعلیم سے فراغت کے بعد طلبہ کو دشواری نہ ہو،

درس نظامی میں اس قسم کی کتابوں کے رکھنے کا جو حاصل بتایا گیا ہے، اس کا دوسرا مخالف رُخ دکھانا بھی ضروری ہو اس طرز تعلیم کے عیوب یہ ہیں کہ ہمارے طلبہ فن کے مسائل کے علم کے بجائے مشکل کتابوں کی عبارت کے حل کرنے ہی کو علم سمجھنے لگے، فصول اکبری، شافیہ، کافیہ، ملاجامی تہذیب، سلم اور مسلم، میرزاہد، افق المبین میں مسائل سے زیادہ وقت عبارتوں کے اجمال و اشکال کے دفع اور فقروں سے مضمون کا مطلب نکالنے میں صرف ہوتا ہے، اور اوس سے جو حاصل ہوا، یعنی دقتِ نظر اوس سے عملی کام لینے کا موقع یہی ملتا ہے، کہ اسی قسم اور اسی ذوق کی کتابوں کے پڑھنے پڑھانے کا کام جاری رکھا جائے، اور فن جاننے کے بجائے کتاب جاننے کا نام علم رکھا جائے، اور لفظی گورکھ دھندوں میں پھنس کر پھر نہ نکل سکے، مصنف نے اپنے خیال کی تائید میں یہاں تمثیلات کے استدلال سے کام لیا ہے، مگر انہی نے ہم کو بتایا ہے، کہ تمثیل کا درجہ شاعری سے زیادہ نہیں، تمثیلات اس کے خلاف بھی پیش کیجا سکتی ہیں، اور اب اعادۂ معدوم انہی کے اصول پر محال ہے،

۳- مصنف نے اس تیسرے نمبر پر بحث و جدال کو رکھا ہے، جس سے ان کا مقصود یہ ہے کہ شاگرد اور استاد دونوں مل کر مسائل کی تحقیق اور شبہات کے ازالہ میں زور آزمائی کریں، تاآنکہ بحث منفصل ہو جائے، بات بالکل ٹھیک ہے اور درس نظامی کے ممتاز طالب علموں کے قصوں میں یہ ذکر بار بار آیا ہے، مگر افسوس ہے کہ اس بحث و جدال کی قوت بھی فن کے مسائل میں کم اور کتاب کے مطلب میں زیادہ صرف ہوتی ہے، یہ تحقیق و تدقیق کتاب کی صحت و خطا اور ایک خاص کتاب کے مصنف کے الفاظ کے درستی کے سمجھنے کے بجائے اصل مسئلۂ زیر بحث پر صرف ہونی چاہئے، ہمارے اساتذہ میں جناب مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی، اور مولانا شبلی نعمانی کا یہی طریق تھا، وہ کتاب سے نہیں بلکہ اصل مسئلہ سے بحث کرتے تھے،

حقیقت یہ ہو کہ درس نظامی کے طریق میں فن دانی سے زیادہ کتاب خوانی پر وقت صرف ہوتا تھا، اس دور سے پہلے قدما کا دستور کتاب پڑھائے جانے کے بجائے فن پڑھانے کا تھا، اور اسی کا نام طریق املا تھا، قرآن و حدیث و فقہ سے لیکر صرف و نحو و ادب اور علوم عقلیہ تک اسی طرح پڑھائے جاتے تھے، اور اس طریق تعلیم کی قوت و افادہ کا حال سب کو معلوم ہے تاہم مسائل زیر درس میں طلبہ اور اساتذہ کا کبھی کبھی بحث و مباحثہ اور ازالۂ شبہات کی کوشش کی حوصلہ افزائی بہت ضروری ہو اور تعلیم کا یہ گر جیسا کہ ابن خلدون کے بیان سے بھی مصنف نے ثابت کیا ہے، بہت مفید ہے، مگر اسی کے ساتھ بے مغزی کی گفتگو کج فہمی کی خو کی درستی، اور گفتن برائے گفتن کی عادت سے بچانا بھی بیحد ضروری ہے،

۴۔ چوتھا قدیم اصول درس اعادہ و تکرار تھا یعنی یہ طریقہ تھا کہ مدرس جب درس دے چکے، تو ممتاز طلبہ میں سے کوئی ایک استاد کی تقریر کو دوبارہ باقی طلبہ کو سمجھا جاتا تھا، یہ بیحد ضروری اور مفید اصول درس تھا جس کو افسوس ہو کہ اب چھوڑ دیا گیا،

۵۔ پانچواں اصول یہ تھا کہ ممتاز طلبہ اپنی طالب علمی ہی کے زمانہ میں اپنے نیچے کے طلبہ کو پڑھایا کرتے تھے، یہ بیحد مفید طریقہ تھا اس سے دو فائدے ہوتے تھے، ایک تو یہ کہ پڑھانے والے طلبہ کی کتابیں منجھتی تھیں، پھر کسی چیز کو پڑھاتے وقت نفسیاتی طور سے پڑھانے والے کے ذہن پر ایسا اثر پڑتا ہے کہ وہ اس وقت وہ سمجھنے لگتا ہے جس کو وہ پڑھتے وقت نہیں سمجھ سکا تھا، یا نہیں سمجھ سکتا تھا، اور دوسرا فائدہ یہ تھا کہ ہر درس گاہ میں صرف ایک دو مدرس کی اعلیٰ جماعتوں کے لئے ضرورت پڑتی تھی، اور نیچے کے طلبہ اوپر کے طلبہ سے پڑھ لیتے تھے، اور اس طرح درس گاہوں کے مصارف میں بہت کمی ہوتی تھی،

آج کل مدارس میں ندوہ کی مصطلحہ تکمیل کا جو ذوق پھیل رہا ہے، یہ بھی کوئی نئی چیز نہیں، یہ وہی چیز ہے جس کی صورت ہمارے بزرگوں کے ہاں یہ تھی، کہ ممتاز طلبہ فراغت کے بعد اپنے اساتذہ کے زیر نظر اور ان کی صحبت میں رہکر چند سال درس تدریس کا کام انجام دیتے تھے، اور آخر وہ ایسے تیار ہو جاتے تھے، کہ بعد کو بڑے بڑے شہروں اور بڑے بڑے مدرسوں میں جاکر اپنا حلقۂ درس قائم کرتے تھے، اور ایک عالم کو اپنے فیوض سے سیراب کرتے تھے، اب مدارس سے یہ چیز تقریباً مفقود ہو رہی ہے، اب انگریزی کی تقلید میں طالب علم امتحانات کے کاغذی اسناد کے پھیر میں مبتلا ہے، اور اسی کو حاصل علم سمجھ رہا ہے، نتیجہ یہ ہے کہ سفینہ اسناد سے معمور ہے، لیکن سینہ علم سے خالی ہے، یہی سبب ہو کہ آج ہمارے عربی مدرسوں میں کامیاب مدرسین کی بیحد کمی محسوس ہوتی ہے، ایک بھی کامل مدرس جب اٹھ جاتا ہے، تو دوسرا اس کا قائم مقام نہیں ملتا، انگریزی تعلیم نے اس نقص کا ازالہ ٹریننگ اسکولوں اور کالجوں، اور ڈاکٹریٹ کے طریقہ سے کر لیا ہے، مگر ہمارے عربی مدارس میں اس کا علاج یہی ہے، کہ ممتاز طلبہ کو فراغت کے بعد روک لیا جائے، اور ان کو مزید دو تین سال پڑھنے پڑھانے اور توسیع علم، مطالعۂ کتب اور تحقیق مسائل کا موقع دیا جائے، خوشی کی بات ہو کہ اب دار العلوم ندوہ کے علاوہ بعض دوسرے مدرسوں میں اس تجویز پر عمل کیا جا رہا ہے،

جاگیرداری سسٹم مصنف نے کتاب کے آخر میں طالب علمی کے پرانے "طریق جاگیرداری" کی حمایت کی ہے، اور اس کے لئے آیندہ کچھ زیادہ لکھنے کا وعدہ کیا ہے، اور اوس کو اس زمانہ کے "فیملی اسٹوڈنٹ" کے طریقہ کا معزز نام دیا ہے، بے شبہہ ایک محدود تعداد کی حیثیت سے اس طریقہ پر عمل کیا جا سکتا ہے، مگر اس زمانہ میں اس کو اگلی سی مقبولیت حاصل نہیں ہو سکتی، درس گاہوں کا بڑے بڑے شہروں میں ہونا، آبادی سے دور واقع ہونا، امراء و اہل ثروت کا شہر کے دور دور مقام پر ہونا، امراء کے طریق تمدن اور طریق تفکر اور طریق معیشت اور جنس و نقد کے معیاروں کے اختلاف کے سبب سے پرانا "جاگیرداری سسٹم" اب دوبارہ قائم نہیں ہو سکتا، اب اوس کی جگہ زیادہ آسان یہ ہے کہ وظائف نقدی کو جس پر اب عمل ہو رہا ہے وسعت دی جائے،

امتحان مصنف نے موجودہ امتحان کی گرانباری اور زیرباری کو جس کا ذاتی تجربہ انکو حاصل ہے پوری طرح دکھایا ہے، آجکل کے ماہرانِ تعلیم نے بھی اس مسئلہ کو اہمیت دی ہے، اور اوس کے نقائص اور معائب پر بحث کی ہے، ہمارے عربی مدرسوں میں جہاں جدید نظام تعلیم انگریزی کی تقلید میں دوسری بلائیں پھیلی ہیں، اور پھیل رہی ہیں، وہاں ایک یہ امتحان بھی ہے، ہمارا قدیم طریق تعلیم اس بلا سے واقف نہ تھا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب عربی طالب علم کا مقصود بھی فضل و کمال کا اکتساب نہیں، بلکہ امتحان میں نمبروں کا حصول رہ گیا ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ طالب علم سال بھر سوتا ہے، اور صرف امتحان

کے دنون مین جاگتا ہے، اور جس کو سال بھر مین لقمہ بہ لقمہ چبا کر کھانا چاہئے تھا، اس کو ایک دم ایک ساتھ اور ایک ہی مہینہ مین کچا پکا کھا کر ہمیشہ کے لئے سوء ہضم کی بیماری اپنے معدہ مین پیدا کر لیتا ہے،

امتحان کی یہ بلا جیسا کہ مولانا شبلی فرماتے تھے، ہمارے عربی مدرسون مین دیوبند سے شروع ہوئی، اور ہر جگہ پھیل گئی، میرے خیال مین اوس کی وجہ یہ ہوئی، کہ مدرسہ دیوبند کے بانیانِ کرام اور ارکان عظام عموماً سرکاری مدرسون سے پہلے متعلق رہ چکے تھے، مولانا مملوک العلی صاحب مولانا یعقوب کے والد اور مولانا قاسم صاحب اور مولانا رشید احمد صاحب گنگوہی رحمہم اللہ تعالیٰ کے استاد عربک کالج دہلی مین مدرس تھے، اور ان دونون بزرگون نے بھی اسی کالج مین تعلیم پائی تھی، اور امتحانات دیئے تھے، مولانا محمود الحسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے والد ماجد مولانا ذوالفقار علی سرکاری مدارس کے انسپکٹر تھے، خود مولانا یعقوب صاحب مدرس اوّل دیوبند سرکاری مدارس کے انسپکٹر رہے تھے، اس لئے ان جدیدیات کی بعض باتین جن مین سے ایک امتحان بھی ہے، ان مقدس ہاتھون سے عربی مدارس مین داخل ہوگئین،

یہ بے شبہہ صحیح ہے کہ امتحان یا کسی اور معیار کے کلیۃً نہ ہونے کے سبب سے پچھلے زمانہ مین بلا امتیاز ہر قسم کے طالب علم ایک ہی درجہ مین یکسان پڑھتے چلے جاتے تھے، مگر اس تدبیر سے اس بیماری کا علاج کسی طرح مفید نہین، چنانچہ یہ اختلاط و عدم امتیاز اگر پہلے بے قاعدہ تھا، تو اب باقاعدہ ہے، موجودہ امتحان ایک گر ہے، جو طالب علم اس کو جانتا ہے، یا جان گیا ہے، وہ بے پڑھے بڑھتا چلا جاتا ہے، اور جو نہیں جانتا وہ جاننے پر بھی گر جاتا ہے، پھر اس امتیاز کے جاننے کے لئے جس قدر وقت، روپیہ اور محنت اور کاغذ صرف کیا جاتا ہے، اوس کا حاصل صرف اس قدر ہے کہ کچھ پاس ہون اور کچھ فیل ہون، حضرات ممتحنین کی سہل انکاریان اور تشدد آمیزیان دونون کے نتائج ہر سال سامنے آتے ہین، اور جن معیارون سے غریب طالب علمون کو جانچا جاتا ہے، اور ان کی قسمت کا فیصلہ کیا جاتا ہے، اور فضل و کمال اور استعداد و عدم استعداد کو ہندسی رقمون کے ذریعہ سے تولا اور ناپا جاتا ہے، وہ تمام تر اجنبی اشخاص کے ذاتی میلان کا نتیجہ ہوتا ہے، اسی لئے ایک ہی کاپی کا نمبر دو ممتحن دو دے سکتے ہیں، اور دیتے ہیں،

ہمارا پرانا طریقہ یہ تھا کہ خود استاد اپنی معرفت اور تجربہ سے ہر طالب علم کو خوب جانتا اور سمجھتا تھا، اور اپنے ہر طالب علم کو ایک دن کے امتحان کے بعد نہین، بلکہ تین سو ساٹھ دنون کے امتحان سے اچھی طرح سمجھ لیتا تھا، اور ہر ایک کا مخصوص علاج اپنے روزانہ کے اسباق مین کرتا رہتا تھا، ہم نے ندوہ مین خود مدرسین کے زیر نگرانی اسی لئے ماہوار امتحانون کے سلسلہ کا آغاز کیا ہے، اور انہی کو معیار بنایا جا رہا ہے،

درجہ بندی انگریزی کی تقلید مین عربی مدارس مین دوسری بلا درجہ بندی کی پھیل رہی ہے، عربی مدرسون مین یہ بلا سب سے پہلے دار العلوم ندوہ سے شروع ہوئی جس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارے مدرسون مین طالب العلمی ایک طرح سے پیشہ اور ذریعہ رزق بن گئی تھی، بڑے بڑے طالب علم اپنی پوری عمر مدرسہ کی روٹیون پر ایک کتاب سے دوسری کتاب اور دوسری کتاب سے تیسری کتاب، اور پھر پہلی کتاب پڑھنے مین صرف کر دیتے تھے، اور فراغت نہین پا جاتے تھے، اس کا اندازہ آپ کو بھوپال کے سرکاری عربی مدرسون کی اوس روداد اور مولانا شبلی مرحوم کی اصلاحیات سے ہوگا، جس کو حیات شبلی مین قصداً شائع کر دیا گیا،

اس درجہ بندی سے اس طالب علمی کے مرض کا تو سدباب ہو گیا، مگر اوس سے اور امراض پیدا ہو گئے یعنی کہ ایک ہی درجہ مین ناقص و کامل، غبی و ذہین، اور چھوٹے اور بڑے طالب علمون کو ایک ہی مدت معینہ کے اندر متعینہ کتابون کو ختم کرنا ضروری ہے،

حالانکہ یہ علانیہ فطرت سے اعلان جنگ ہے، نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف ذہین غبی کے سبب سے اپنے وقت کے ضائع کرنے پر، اور غبی ذہین کے سبب سے بے سمجھے بوجھے تیز قدم بڑھانے پر مجبور ہوتا ہے،

دوسری خرابی یہ ہے کہ ہر طالب علم کو خواہ اوس کا ذوق کچھ ہی ہو، اور اس کا میلان طبع کسی طرف ہو، اوس کو زبردستی درجہ کے متعینہ علوم و فنون پڑھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے، حالانکہ پڑھنے کے بعد بھی وہ ان سے کورا ہی رہتا ہے، اگر درجہ بندی نہ ہوتی جیسا کہ پہلے تھا، تو فرداً فرداً ہر طالب علم کو اپنے مذاق اور میلان کے مطابق مختلف علوم و فنون میں انتخاب کا موقع رہتا، اور خاطر خواہ فائدہ ہوتا، اور بے توجہی کے ساتھ بے مذاق اور بے میل کتابوں کے پڑھنے کا بار جو اس پر عائد ہوتا ہے، وہ اس پر نہ ہوتا،

امتحان اور درجہ بندی سے مل کر جو بلائے عظیم آئی ہے، وہ یہ ہے کہ اگر ایک کتاب میں بھی ۳۳ کی مقدار مبرم سے چند نمبر کم آگئے تو اس کی ساری کتابوں کی کامیابی حرف غلط کی طرح مٹ گئی، اور اس کی عمر کا ایک سال ضائع کر دیا گیا، اکثر دیکھا گیا ہے کہ ان ناکام لڑکوں کا یہ امتحان ہی نہیں بلکہ تعلیم ہی ناتمام رہ جاتی، اور عمر ہی ناکام ہو جاتی ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ درجہ اخیر کے علاوہ نیچے کے درجات میں مدرسین کے ماہانہ امتحانات کے نتیجہ کو فیصلہ میں اہمیت دی جائے،

ہمارے عربی مدارس میں قلبی مرض النوم

مصنف نے اپنے مقدمہ میں قلبی نوم کے نام کی بیماری کا تو تذکرہ کیا ہے، مگر اوس کی تفصیل اور تشریح اور علاج کا ذکر نہیں کیا ہے، شاید آئندہ کریں،

عربی مدارس کی بنا خالص دینی و مذہبی غایت پر رکھی گئی تھی، مگر جیسے جیسے انگریزی مدارس کی پیروی میں جدید اصلاحات مدرسوں میں پھیل رہے ہیں، انگریزی کالجوں اور اسکولوں کی ہر چیز کی ارادی اور غیر ارادی نقالی کی بلا بھی عام طور سے پھیل رہی ہے، یہاں تک کہ بڑی بڑی عربی مدرسوں تک میں یہ بلا پہنچ گئی ہے، دین کا جذبہ مفقود ہو رہا ہے، اساتذہ کی عزت اور قدر دلوں سے رخصت ہو رہی ہے، کسب کمال کی جگہ کسب مال کا جذبہ بڑھ رہا ہے، عجز اور گہرائی کی جگہ سطحیت آرہی ہے، اور حریت و آزادی کا جھوٹا طوفان اس قدیم طریق نظم و نسق کو جو بزرگوں کے احترام اور خوردوں پر شفقت پر قائم تھا یا تو بالکل مٹا چکا یا مٹا رہا ہے، الزام خورد و بزرگ کو اور بزرگ خورد کو دے رہے ہیں، اور دونوں ہی الزام صحیح ہیں کیونکہ یہ اصول دونوں طرف سے یکساں ہی برتے اور توڑے جا سکتے ہیں، اس سے زیادہ قابل افسوس حالت یہ ہے کہ ہمارے عربی مدرسے بے مقصد ہو رہے ہیں، اور اکثر کی بنا للّٰہیت کے بجائے پیٹ پر ہے، کہیں اہل حدیث و حنفیت کے دنگل ہو رہے ہیں، کہیں سرکاری امتحانات کے میلان کو بڑھایا جا رہا ہے، کہیں سوئی کی جگہ بڑھ مولوی بنانے کی تیاری ہو رہی ہے، کہیں انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں داخلہ کی تیاری ہے، مگر دین کا ولولہ، دین کی خدمت، ایمان کا حصول، دین کی خدمت، علم نافع کا سوال، اور عمل صالح کا خیال قلوب سے محو ہو رہا ہے، مدرسین میں بھی اخلاص و قناعت کی جگہ جو ہمارے علماء کا طرۂ امتیاز تھا، داد و ستد اور گریڈ اور ترقی اور عہدہ اور منصب و لفظی اعزاز و اکرام کے حصول کا شوق نمایاں ہے، پرنسپل اور پروفیسر اور لکچرر بننے اور کہنے اور کہلانے پر مٹ رہے ہیں، فانّی تسحرون، طلبہ میں انگریزی طالب علموں کی نقالی میں آرائش و نمائش اور فیشن اور مال کی خدمت اور کپڑوں کی نئی تراش و خراش اور ظاہری ٹیپ ٹاپ اور سیر و تماشا کا شوق اتنا نمایاں ہے کہ اس کے پیچھے علم کی سچی طلب دلوں سے رخصت ہو رہی ہے، ہم جن باتوں کا الزام کبھی انگریزی طالب علموں کو دیتے تھے اب ان میں سے ایک ایک عربی طالب علموں میں پایا جاتا ہے، اگر کمی ہے تو اس لئے کہ ہمارے طالب علموں کے پاس وافر روپیہ نہیں، عصمت بی بی از بے چادری کا، یہ امور ہمارے علما کے سوچنے اور غور کرنے کے قابل ہیں، ان صفحات میں کتاب کے اہم مباحث پر اجمالی گفتگو آگئی ہے، لیکن مصنف کا قلم چونکہ منطقی ترتیب اور مصطلحی تعیینی رسوم کے بجائے افادیت کا خوگر ہے، اس لئے کتاب میں ضمناً جابجا سے معلومات، فوائد، اور مباحث بھی آگئے ہیں جن کا علم بجائے خود مفید ہے، اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے قدیم طریقۂ تعلیم اور اصول تعلیم پر اس سے زیادہ جامع کتاب نہیں لکھی گئی، مگر ضرورت تھی کہ جامع کے ساتھ مانع بھی ہوتی، ان معلومات و نتائج کو سامنے رکھ کر آئندہ تعلیم کا نقشہ بنایا جا سکتا ہے،

مقبرہ ابو الحسن تربتی

از

جناب محمد شجاع الدین صاحب ایم اے، لاہور

بیا و نقش عمارات شہریاران بین
کہ این سپہر جفا پیشہ چون بہ بست و شکست

عہدِ مغلیہ مین اکثر باکمال ایران خراسان اور توران وغیرہ ممالک سے تلاشِ روزگار کے سلسلہ مین واردِ ہندوستان ہوا کرتے تھے، اور ان کی قسمت کا ستارہ فضائے ہند مین چمک کر شامِ غربت کو صبحِ وطن سے زیادہ تابناک بنا دیتا تھا، اکثر کا ت رسا انھین سپہ سالاری صوبہ داری اور وزارتِ عظمیٰ کے عہدون تک پہنچا دیتا تھا، علماء ہون یا شعراء، ماہرانِ انتظام ملکی ن، یا نبرد آزمایانِ جنگی، ہر جوہر قابل کے لئے سرزمین ہندوستان کئی موجود تھی، یہ الگ بات ہے کہ بعض تیرہ بختون کا حال نی زشتی جیسا بھی ہوتا ہو،

بہرکیف ابو الحسن تربتی کو آب و دانہ اور خاکِ گور اس کے وطنِ مالوف تربت حیدری سے اکبر اعظم کے عہد مین ہندوستان کھینچ لائی، تربتِ حیدری اُن دنون خراسان کا مشہور اور مردم خیز شہر تھا، اور آج بھی مملکت ایران کے شمال مشرقی حصہ مین صوبہ خراسان کے دار السلطنت حضرت امام رضاؑ کے مشہد مقدس سے جنوب کی سمت مائل بمغرب تقریباً ۵۰ میل کے فاصلے پر آباد ہے، اور ایک متوسط درجے کا قصبہ ہے،

جوہر شناس اکبر نے ابو الحسن کو ہاتھوں ہاتھ لیا[۱]، اور دکن کے نو مفتوحہ علاقون کا دیوان مقرر کیا، اکبری دور کی دکنی م ۱۰۰۸ء مین احمد نگر اور ۱۰۰۹ء مین اسیر گڈھ کی فتح کے بعد مکمل ہوئی، چنانچہ اسی زمانے مین ابو الحسن یہان آیا، اس کے آباؤ اجداد اس کی ابتدائی زندگی اور تعلیم و تربیت کے متعلق ہم کوئی واقفیت نہین رکھتے، لیکن اس کی کامیاب زندگی، بڑے عہدون کے فرائض کی خوش اسلوبی سے بجا آوری یہ ظاہر کرتی ہے، کہ وہ کسی اچھی کان کا بے بہا لعل اور کسی بلند فلک کا درخشان ستارہ تھا، ابو الحسن پانچ چھ سال تک بطور دیوانِ دکن اپنے فرایضِ منصبی کو جانفشانی اور تندہی سے بجا لاتا رہا، دورِ جہانگیری کے دوسرے سال جب آصف خان میرزا جعفر کو وکیلِ سلطنت کا عہدہ تفویض ہوا، تو یہ اس کا سررشتہ دار بنایا گیا، اور ۱۰۳۰ء مین میر بخشی کے عہدے پر فائز کیا گیا، اعتماد الدولہ کی وفات کے بعد ابو الحسن اس کی جگہ دیوانِ کل مقرر ہوا، اُسے پنج ہزار ذات اور پانچ ہزار سوار کا منصب عطا ہوا، جلوس جہانگیری کے انیسوین سال دیوانی کا عہدہ نورجہان کے بھائی آصف خان کو اور کابل کی صوبہ داری ابو الحسن تربتی کو مرحمت ہوئی، مگر یہ خود دربار ہی مین رہا، اور اپنے فرزند احسن اللہ ظفر خان کو نائب مقرر کرکے کابل روانہ کیا، مہابت خان کے ہنگامے مین ابو الحسن نے نہایت دلیری اور اولوالعزمی سے ملکہ نورجہان کی حمایت مین جنگ کی اور دریاے جہلم مین ڈوبتا ہوا بمشکل بچا،

---

۱ مآثر الامراء جلد اوّل صفحہ ۳،

شاہ جہان کے عہد مین اُسے چھ ہزار ذات اور چھ ہزار سوار کا منصب عطا ہوا، ۱۰۴۲ھ/۱۶۳۲ء مین ابو الحسن کو کشمیر کا صوبہ دار بنایا گیا، مگر یہان بھی اُس کا فرزند ظفر خان ہی باپ کا نائب بن کر گیا، اور وہ شاہی دربار مین رہا، اس واقعہ کے ایک سال بعد ۱۰۴۳ھ/۱۶۳۳ء مطابق ۱۰۴۳ھ مین ابو الحسن تربتی ستر سال کی عمر مین راہیِ ملکِ عدم ہوا، صاحب مآثر الامراء اس کے فرزند ظفر خان کے حالات مین لکھتا ہے[51] کہ

"در لاہور بساطِ ہستی در نوردد و در مقبرۂ پدر مدفون گشت"۔

اس سے معلوم ہوا کہ ابو الحسن تربتی کا لاہور مین مقبرہ تھا، جس مین اس کا فرزند ظفر خان بھی دفن ہوا،

دورِ مغلیہ مین دستور تھا، کہ جو غیر ملکی یہان آکر شاہی ملازمت کے سلسلہ مین منسلک ہوتے، وہ پھر اپنے وطن واپس نہ جا سکتے تھے، اور اس صورت مین ان کو اپنی کل دولت یہین چھوڑنا پڑتی تھی، اس لئے وہ ہندوستان ہی کے کسی شہر مین عمارتین بنوا کر اقامت اختیار کر لیتے تھے، اگرچہ سرکاری خدمات کی ادائیگی کے سلسلے مین انھین مختلف شہرون مین پھرنا پڑتا تھا، مگر پیرانہ سالی کا زمانہ اور ایام تعطیلات بسر کرنے کے لئے اسی شہر مین آجاتے جسے اپنا مستقر قرار دے کر عمارتین بنوائی ہوتین، لاہور کی آب و ہوا دہلی اور آگرہ سے بہتر اور ایران و خراسان سے مقابلتہً نزدیک تر ہونے کی وجہ سے اکثر غریب الوطن اُمرا نے اسی شہر کو اپنا وطن قرار دیا تھا، اور یہان فلک بوس محلات رشکِ فردوس باغات اور عالیشان منازل اور مقابر بنوا کر اس شہر کی گوناگون خوبیون کو چار چاند لگا دیئے تھے، موسم گرما بسر کرنے کے لئے لاہور کے پاس ہی کشمیر کی حسین سرزمین تھی، مگر اس تمام سامانِ تعیش کے باوجود جو انھین میسر ہوتا تھا، وطن کی یاد ان کے دل سے نہ جاتی تھی، اور ہندوستان مین "بادشاہی" کرنے کے باوجود خراسان و ترکستان کا گدا بننے کی خواہش ان کے دل مین چٹکیان لیتی تھی، جیسا کہ خود ابو الحسن تربتی کے فرزند ظفر خان احسن کے ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے،

ز بعد اکبر آباد است لاہور	کہ در خوبی بعالم گشتہ مشہور
برون آرد ہوایش از فراقت	دہ یاد از خراسان و عراقت

(۲)

الٰہی تا بود کشمیر آباد	تو از باغ خراسانم مدہ یاد
بہر کس ہرچہ خواہد بے سخن دہ	مرا کشمیر و بلبل را چمن دہ

چنانچہ بہت سے مقامی اور غریب الدیار امرار کی سربہ فلک عمارتون نے اس شہر کو عروس البلاد بنا دیا تھا جن مین ملا نظام الدین تجنشی، شیخ فرید بخاری، امانت خان خوافی، آصف خان علی مردان خان علامی افضل خان نواب میان خان، وزیر خان جیسے جلیل القدر امرار شامل تھے، ابو الحسن تربتی بھی جب ہندوستان آیا، تو اس نے بھی اسی شہر مین عمارتین بنوائین مغل امرار کے مشہور محلہ مغل پورہ مین واقع تھین، اور اسی جگہ اس کا مقبرہ بھی تھا،

اس وقت لاہور مین مقبرہ ابو الحسن کے نام سے کوئی عمارت نامزد نہین، لیکن لاہور کی قدیم یادگارون کے متعلق پچھلی صدی کی لکھی ہوئی کتابون مین اس کا ذکر ملتا ہے، صاحب تحقیقاتِ چشتی[52] اپنی کتاب مین ابو الحسن کے مقبرے کا ذکر

[51] مآثر الامرا، جلد دوم ص ۷۶۵، [52] تحقیقاتِ چشتی صفحہ ۵-۳۷۷، ۱۸۶۴ء/۱۸۶۲ء مین یہ کتاب مولوی نور احمد چشتی نے جو لاہور کے ایک علمی خاندان سے تعلق رکھتے تھے، انگریز حکام کے ایما پر لکھی تھی، اس مین اُن تمام قدیم یادگارون کے حالات درج ہین، جو موجود

کرتے ہیں، مگر کسی جگہ اس کو ابو الحسن آصف خان برادر نور جہان سے خلط ملط کیا ہے، اور کہین ان کا فرزند بتایا ہے، ایک جگہ البتہ اس کی وضاحت کر دی ہے کہ یہ ابو الحسن آصف خان سے علیحدہ کوئی اور ابو الحسن تھا، غرض

ع شد پریشان خوابِ من از کثرتِ تعبیر ہا

رائے بہادر کنہیا لال[۵۱] کا بیان کے مطابق صاحبِ مقبرہ ابو الحسن یوسف خان طہرانی نور جہان کے ماموں تھے، سید محمد لطیف صاحب بھی اس مقبرے کا ذکر کرتے ہین، وہ لکھتے ہین کہ یہ ابو الحسن، ابو الحسن آصف خان برادرِ نور جہان سے علیحدہ کوئی اور شخص تھا، مگر چشتی اور لطیف مین سے کوئی صاحب اس امر کی توضیح نہین کرتے ہین، کہ یہ ابو الحسن، رکن السلطنہ خواجہ ابو الحسن تربتی تھے، مگر جب یہ تمام مورخ مقامی روایات کی بنا پر ایک مقبرے کو "ابو الحسن" سے منسوب کرتے ہین، اور مآثر الامراء جیسی معتبر کتاب مین خواجہ ابو الحسن تربتی کے مقبرے کا لاہور مین واقع ہونا تحریر ہے، تو اس "مقبرہ ابو الحسن" کو خواجہ ابو الحسن تربتی کا مقبرہ قرار دینے مین کیون شک وشبہ کیا جائے، ذیل مین اس مقبرہ کا حال بالترتیب قلمبند کیا جاتا ہے،

۱۰۴۲ھ مین ابو الحسن اس دارِ فانی سے رخصت ہوا، اور شاہجہانی عہد کے لاہور کے خوب ترین علاقے یعنی محلہ مغل پورہ مین ایک عالیشان مقبرہ اُس کی آرامگاہ قرار پایا، یہ ظاہر نہین ہوتا، کہ یہ مقبرہ علی مردان خان کی طرح وہ اپنی زندگی مین خود تعمیر کرا چکا تھا، یا بعد مین بنوایا گیا، خان مذکور کے مقبرے کی طرح یہ بھی اندر سے دو منزلہ تھا، اور چارون طرف آٹھ کمرے تھے، جن کی چھت پر خوبصورت چھوٹے گنبد، اور ان کے درمیان مین بڑا گنبد تھا، جن پر سنگِ سُرخ لگا ہوا تھا، مقبرہ میں اندر اور باہر نہایت اعلیٰ قسم کی پچی کاری گلکاری اور کاشی کاری تھی، مقبرے کے گرد ایک باغ تھا، اور اس باغ کو سیراب کرنے کے لئے اتنا بڑا کنوان تھا، جس پر دس رہٹ "باسائش و فراغت" چل سکتے تھے، مقبرہ مذکور کے نیچے ایک وسیع تہ خانہ تھا، جو اندر ہی اندر کنوین تک آیا ہوا تھا، اور کنوین مین اس کی کھڑکی بھی تھی، مولوی نور احمد معمر لوگون کی زبانی لکھتے ہین، کہ اس وسیع تہ خانے کے اندر بھی گلکاری کی ہوئی تھی،[۵۲]

اسی باغ مین مذکورہ بالا مقبرہ کے شمالی جانب ایک اور میانہ کاشی کار گنبد تھا، اس مین ابو الحسن کی بیوی مخدومہ بیگم تہِ خاک محوِ خواب تھی، اوس نے یہ مقبرہ اپنی زندگی مین خاوند کی وفات کے بعد بنوایا تھا، اور اس کا ادب ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے اپنا مقبرہ بہت چھوٹا بنوایا، مخدومہ بیگم اس زمانے کی دیگر خاندانی بیگمات کی طرح بہت ہی قابل اور فاضل خاتون تھی، دیگر علوم وفنون کے علاوہ فنِ شعر گوئی مین بھی دسترس رکھتی تھی، ابو الحسن تربتی جیسے امیر کی بیوی اور ظفر خان احسن جیسے شخص کی مان کو ایسا ہی ہونا چاہیے تھا، مخدومہ بیگم نے بروز دوشنبہ بتاریخ ۴ شعبان ۱۰۶۶ھ مین اس عشرت کدۂ فانی کو الوداع کہی، ظفر خان احسن ۱۰۷۳ھ میں عالمگیر کے عہدِ حکومت مین فوت ہوا، اور اسی جگہ باپ کے پہلو مین دفن کیا گیا، ہوسکتا ہو کہ ظفر خان احسن کی بیوی بزرگ خانم بنت سیف خان (جو کہ ممتاز زمانی زوجہ شاہنشاہ شاہجہان کی بڑی بہن ملکہ بانو کی لڑکی تھی) بھی اسی خاک کا پیوند بنی ہو، اور اپنی ساس کے پاس دفن ہوئی ہو،

مخدومہ بیگم نے اپنی زندگی مین اپنے جلیل القدر فرزند کے ایما سے اس مقبرے مین ایک مدرسہ قائم کرکے بہت سی جائداد

(بقیہ حاشیہ ص ۸) زمانے میں شہر لاہور کے باہر موجود تھین، چونکہ یہ کتاب محض باخبر لوگون اور مجاورون کے بیانات سے مرتب کی گئی تھی، اس لئے اس مین تضاد بیان بہت زیادہ ہے تاہم اس سے لاہور کے متعلق بہت سی بے بہا اور دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہین [۵۱] تاریخ لاہور (مطبوعہ ۱۸۸۴ء) ص ۲۶۲ و ۲۶۳ [۵۲] "لاہور" (بزبانِ انگریزی مطبوعہ ۱۸۹۲ عیسوی) صفحہ ۱۵۲،

وقف کی تھی، مدرسہ کے طلبہ اور اساتذہ مقبرے کی جملہ عمارات مین رہتے تھے، ان کے تمام اخراجات اوقاف کی آمدنی سے پورے ہوتے تھے، اس مدرسہ مین تمام دینی اور اوس زمانہ کے مروجہ علوم سکھائے جاتے تھے، اور اس عہد کے لاہور کے دوسرے مدارس کی طرح اس میں بھی دور دور سے طلبہ آتے تھے، ایک ہزار نفر خوان قاری[۵۱] نواب کی قبر پر شب و روز قرآن خوانی کے لئے مقرر ہوئے،

اس مقبرے اور باغ کے پاس ہی نواب کے عالی شان سنگین اور کاشی کار محلات تھے، جن کے ساتھ دیگر امراء کے ایوانات مقابر اور باغات کا سلسلہ دور تک چلا گیا تھا، بازارون کی رونق محلات کی شان وشوکت، دولت و ثروت کی افراط اور تجارت وصنعت کی بہتات کی وجہ سے یہ محلہ مغل پورہ لاہور کے تمام محلون سے گوے سبقت لے گیا تھا، اور اس کی گلی کوچوں مین تب و زرنجین بستے تھے،

ذرا چشم تصور سے ملاحظہ فرمائیے کہ فلک بوس محلات، عالی شان مساجد اور جنت نظیر باغات کے حامل اور پاکیزہ محلہ مین ایک فرحت افزا مقام تھا، جس مین کاشی کار دیوارون، سنگ سُرخ کے فرشون اور سرخ پتھر کے گنبدون والے مکانات کے اندر ایک پرطرب اور رنگین ماحول مین طلبہ تمام تفکرات سے بے نیاز ہو کر تحصیل علوم مین مشغول رہتے تھے،

شہنشاہ فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد مین جب غازی عبد الصمد خان اور نواب زکریا خان دونوں باپ بیٹے یکے بعد دیگرے ناظم لاہور کے عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے، تو اس مدرسہ کی شہرت کو چار چاند لگ گئے. اس کے قریب ہی بیگم پورہ کے فلک رفعت محلات مین ان کا قیام تھا، اونھون نے اس دار العلوم کی سرپرستی قبول کی، اور ہمیشہ طلبہ اور اساتذہ پر انعامات واکرامات کی بارش کرتے رہتے تھے، اس زمانہ میں اس مدرسہ کے مدرس اعلیٰ حضرت حامد قاری تھے، یہ بزرگوار اس مبارک زمانہ کے جید علماء مین سے تھے، تبحر علمی کے علاوہ قدرت کی طرف سے انھین لحن داؤدی بھی عطا ہوا تھا اور اون کے زہد و تقوی کا ایک عالم معترف تھا،

جب تک سرزمین پنجاب اسلامی حکومت کے سایۂ عاطفت مین رہی، اس مقبرے کی رونق اور آبادی قائم رہی، لیکن جب نااتفاقی اور دون ہمتی کے سبب ہندی مسلمانون کی سطوت اور ثروت نکبت و عسرت مین بدل گئی، تو اون کی ہیبت سے لرزہ براندام رہنے والے اسلامی حکومت کی لاش کے گرد بھوکے گدھوں کی طرح منڈلانے لگے، اس پر مستزاد یہ ہوا کہ دُرّانیون کے بیرونی حملون نے پنجاب کی مسلم حکومت کی رہی سہی طاقت کو بھی ملیامیٹ کر دیا، اور یہان سکھوں کا اقتدار قائم ہو گیا، اس گیرودار مین جہان شہروں کی اینٹ سے اینٹ بج گئی، اور بے گناہ مسلمانون کے خون سے پنجاب کی سرزمین لالہ زار ہو گئی، وہان مقبرے اور مدرسہ بھی اس کی زد مین آ گئے، اور اٹھارہوین صدی کے آخری ربع مین محلہ مغل پورہ کے ساتھ ہی یہ مدرسہ بھی ختم ہو گیا،

رنجیت سنگھ کے عہد مین نواح لاہور کی تمام اسلامی یادگارون سے سنگ مرمر اور دیگر قیمتی پتھر نوچ لئے گئے، اور انھین دربار صاحب امرتسر اور دوسری عمارتون کی تعمیر مین خرچ کیا گیا، مفتی غلام سرور[۵۲] مرحوم کا بیان ہے، کہ اس پر آشوب دور مین دو ہزار کے قریب مقبرے مسجدین اور دیگر اسلامی یادگارین تباہ و برباد ہو گئین، بہت سی یادگارین پتھر اتارتے ہوئے گر گئین اور بقیہ عمارات جن مین مسجدین مقبرے حمام سرائیں اور حویلیاں وغیرہ سب شامل تھین، حکومت کے قبضے میں تھیں اور ان میں سے کسی میں چھاؤنی تھی کسی مین

---

۵۱ یہ بیان تحقیقات چشتی کا ہے (ص ۸۰۳) جو مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے، تاہم اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بہت سے حافظ اور قاری باری باری سے قرآن شریف کی تلاوت کے لئے ملازم رکھے گئے ہون گے ۵۲ تاریخ مخزن پنجاب (۱۸۶۹ء) ص ۲۰۰،

سرکاری گودام یا کارخانہ، کسی میں گولہ بارود کا ذخیرہ تھا، کسی میں فوجی افسرون کی رہایش گاہ تھی، مقبرہ ابو الحسن میں رنجیت سنگھ کے فرنگی جرنیل[1] ایوی ٹیبل (Avitabile) کی ماتحت فوجون کا ذخیرۂ بارود رہتا تھا، اور بھوپ سنگھ کمیدان اس کا محافظ تھا، زمانہ کی نیرنگیان دیکھئے، کہ جس پاکیزہ عمارت میں تقریباً سوا سو سال تک خوش الحان قاری شب و روز قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہے، اس مین بارود بھردی گئی، زمانہ نے اسی پر اکتفا نہ کی، بلکہ شیر سنگھ کے عہدِ حکومت مین بجلی گری، اس سے بارود کے ذخیرہ میں آگ لگ گئی، دھماکے کی آواز دور دور تک سنائی دی، بہت سے محافظ جل مرے، مقبرے کی عمارت کو از حد نقصان پہنچا، اس کا بہت سا حصہ جل گیا، اور دیوارین بارود کے پھٹنے سے اڑ گئین،

قفس مین مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیان کیون ہو

مگر مغلیہ عمارتون کی سخت جانی اور استحکام ملاحظہ ہو کہ سوختہ محرابون پر سیاہ رنگ کا جھلسا ہوا گنبد پھر بھی قائم رہا، اگر یہی بچا رہتا، تو بھی غنیمت ہوتا کہ اسلامی آثار کے فریفتہ اسی کو دیکھ کر عہدِ رفتہ کی یاد تازہ کرلیتے، لیکن زمانہ نے اس نقش کو بھی نہ چھوڑا، ۱۸۴۹ء مین پنجاب مین انگریزی حکومت کا آغاز ہوا، یہ وہ دور ہے جس مین محققینِ آثارِ عتیقہ اور علماے تاریخ نے قدیم ٹیلون کو کھود کر، جنگلون اور ویرانون کی خاک چھان کر، پتھرون، شکستہ برتنون، اور سنگ ریزون کی زبانی عہدِ عتیق کی تاریخ مدوّن کی ہے، لیکن شومیٔ بخت دیکھئے، کہ اسی عہد مین لاہور کی اکثر قدیم اسلامی یادگارین تباہ و برباد ہوئین، یا کارکنانِ محکمۂ آثارِ قدیمہ کی تغافل شعاری کا شکار ہو کر کس مپرسی کی حالت مین بہت جلد مٹنے کو ہین،

جدا ہے مقسوم اپنا اپنا الگ ہے تقدیر اپنی اپنی
دیا ہے اس شوخ دلستان نے کسی کو بوسہ کسی کو گالی

بہرکیف ۱۸۶۴ء تک مقبرے کی عمارت موجود تھی، تحقیقاتِ چشتی مین اس کے حالات مرقوم ہین، مگر ۱۸۸۴ء کی شائع شدہ تاریخ لاہور مؤلفہ راے بہادر کنہیا لال سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس وقت اس مقبرے کا نشان صفحۂ ہستی سے مٹ چکا تھا، اور صرف محترمہ مخدومہ بیگم صاحبہ کا مقبرہ اور کنوان باقی رہ گئے تھے، مقابر کی فصیل اور ملحقہ محلات کے کھنڈرات

---

[1] رنجیت سنگھ کی ملازمت مین بہت سے افرنجی لاصل جرنیل تھے، جن مین سے اکثر نپولین شاہ فرانس کے قدیم ملازم تھے، اور اس کی وفات کے بعد تلاشِ روزگار میں ادھر آگئے تھے، ان مین ونتورا، الارڈ کورٹ اور ایوی ٹیبل وغیرہ مشہور ہین، ان کی مدد سے رنجیت سنگھ نے اپنی فوجی قوت کو پنجاب کی جنگجو اقوام پر مسلط کرنے کے لئے ایک زبردست لشکر تیار کیا تھا، جب ایوی ٹیبل پشاور کا فوجی گورنر ہوا، تو اُس نے غیور پٹھانون کو غلامی پر رضامند کرنے کے لئے ان پر بڑے ستم ڈھائے، روزانہ بیسیون پٹھانون کو پھانسی دینا اس کا معمول تھا، عوام اس کا نام بگاڑ کر اسے طبلہ صاحب کہا کرتے تھے [2] اٹھارہوین صدی عیسوی کے دوسرے نصف مین جب پیہم بیرونی حملون سے مسلمانانِ پنجاب کا شیرازہ بکھر گیا، تو سکھون نے موقع پاکر پنجاب کے شہرون کو تاخت و تاراج کرنا شروع کردیا، اسی دور مین لاہور بھی جو کہ ایک وسیع اور خوبصورت شہر تھا، لٹ گیا، ۱۷۹۹ء مین جب رنجیت سنگھ نے اس شہر پر قبضہ کیا، تو تمام شہر بے چراغ تھا، اور میلون تک کھنڈرات پھیلے ہوئے تھے، اوس نے قدیم اکبری شہر کے گرد خندق اور ڈبل فصیل بنوا کر اُسے آباد کیا، اور بیرونِ شہر کے کھنڈرات کی اینٹین نئی عمارات مین استعمال کی جانے لگین، کھنڈرات کے علاوہ اینٹ پتھر کے لالچ نے بہت سی دیدہ زیب یادگارین بھی صفحۂ ہستی سے محو کردین، انگریزی عہد مین بھی کئی سال تک یہ اینٹین بکتی رہین، اکثر عمارات کی بنیادین کھودتے کھودتے گہرے گڑھے

کی اینٹیں بک چکی تھیں، اور باغ نذرِ خزان ہو گیا تھا، ۱۸۴۸ء کے بعد مخدومہ بیگم کا مقبرہ بھی نیلام ہو کر گرا دیا گیا،

ترے کمالِ ستم کی یہ یادگار رہے
نہ ہم رہیں نہ ہمارا کہیں مزار رہے

سید محمد لطیف کی کتاب "لاہور" مطبوعہ ۱۸۹۲ء سے معلوم ہوتا ہے، کہ اس فلک نشان عمارت کی یادگار صرف اسکا بڑا کنواں باقی رہ گیا تھا، باغ مقابر اور حویلیوں نے لق و دق میدان کی صورت اختیار کر لی تھی، مگر آج اس کنوئیں کا نشان بھی ڈھونڈے نہیں ملتا، جس جگہ یہ مقابر تھے، وہاں اب ریلوے جنرل سٹورز اور کارخانے تعمیر ہو چکے ہیں،

محلہ مغل پورہ کی شوکتِ رفتہ کی یادگار اب صرف علی مردان خان کا فلک بوس مقبرہ، مدرسۂ ابو الحسن تربتی کے مذکورہ بالا معلم اعلیٰ حضرت حامد قاری کا مزار اور نصرت خان کا مقبرہ باقی رہ گئے، اوّل الذکر دونوں یادگاریں ریلوے سٹور کے اندر ہیں، انھیں بلند دیواروں میں محصور کرکے ایک چھوٹا سا راستہ بنا دیا گیا ہے، اور ہر شخص ان کی زیارت کر سکتا ہے، مقبرہ نصرت خان ریلوے کیرج شاپ کے اندر ہے، اس کی ملحقہ مسجد اور دیگر مکانات گرائے جا چکے ہیں، اور وہاں تک جانے کے لئے کوئی راستہ نہیں، ان کارخانوں کے پاس ہی لاہور سے امرت سر کی جانب جانے والی ریلوے لائن کا پہلا اسٹیشن واقع ہے، جس کا نام قدیم مغلیہ محلے کے نام پر مغل پورہ رکھا گیا ہے،

ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت
رفت منزل بدیگرے پرداخت

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۱۳) بن گئے تھے، مگر اینٹیں ختم نہ ہوتی تھیں، آخر انگریزوں نے شہر میں ان گڑھوں کا وجود حفظ صحت و جان کے لئے خطرہ قرار دے کر انھیں بند کرا دیا، اور اینٹوں کا نکالنا حکماً روک دیا، انگریزی عہد کے آغاز میں جو مایۂ ناز یادگاریں سرکاری محکمۂ نزول یا بعض افراد کی مہربانی سے برباد ہوئیں، ان میں ان مقابر کے علاوہ جامع مسجد جہانگیر (عیدگاہ) مقبرہ قاسم خان، دروازہ نخاس، مسجد دارا شکوہ، مسجد شاہ بدر، سرائے گوئیاں والی، مسجد خواجہ نور اللہ وغیرہ قابلِ ذکر ہیں، ۱۸۵۲ء یہ مقابر یکے بعد دیگرے بعض دیگر یادگاروں کی طرح حکومت پنجاب کے محکمۂ نزول نے نیلام کرا دیئے، اور خریدنے والے ٹھیکہ داروں نے انھیں گرا کر اینٹیں فروخت کر دیں،

خط و کتابت کے لئے

ضروری اطلاع

معارف کے مضامین اور علمی استفسارات اور ان کے متعلق جملہ خط و کتابت شخصی نام کے بجائے صرف اڈیٹر معارف کے پتہ سے، اور معارف اور دار المصنفین کے انتظامات اور فرمایشات کے متعلق منیجر صاحب دار المصنفین کے نام سے کی جائے، ان تمام امور کے متعلق میرے نام خط لکھنے سے تعمیل میں دقت ہوتی ہے، امید ہے کہ احباب مجھے زحمت سے بچانے کے لئے اس کا خاص طور سے خیال فرمائیں گے

سید سلیمان ندوی

اردو کی دو قدیم کتابیں

اور

ان کا زمانہ تصنیف

از

جناب محمد خلیل صاحب تجاروی بی ایس سی علیگ

رسالہ معارف بابت ماہ مارچ ۱۹۴۴ء میں جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی نے دیوان منعم کے متعلق چند شبہات ظاہر فرمائے ہیں، یہ تحریر اب میرے مطالعہ میں آئی ہے جواباً اس کے متعلق اپنے معلومات پیش کرنے کا خیال ہوا،

(۱) تاریخ ادب اردو مطبوعہ نولکشور پریس جو اس وقت پیش نظر ہے اس میں صفحہ ۶۳ پر سلطان محمد قلی قطب شاہ ولد ابراہیم قطب شاہ کا سنہ وفات ۱۶۱۱ء لکھا ہے، اور سلطان محمد قطب شاہ کا سنہ وفات صفحہ ۶۷ پر ۱۶۲۵ء ہے، لیکن ہاشمی صاحب نے اسی کتاب کے حوالہ سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کا سنہ وفات ۱۶۲۵ء تحریر فرمایا ہے، اسی طرح ہاشمی صاحب کو کتاب سب رس کے بارہ میں بھی شاید سہو ہوگیا، ورنہ تاریخ ادب کے صفحہ ۷۰ پر سب رس کا سنہ تصنیف ۱۰۴۰ھ تا ۱۰۴۵ھ تحریر ہے، اور محمد قلی قطب شاہ کی وفات کا سنہ ہجری ہاشمی صاحب نے ۱۰۲۰ھ لکھا ہے، بہار منظر میں ۱۰۲۲ھ ہے،

(۲) مثنوی واقعات امامیہ کے تصنیف رسولی ہونے کا ثبوت طلب کیا ہے تو واضح ہو کہ مثنوی میں مصنف کا نام وطن بادشاہ وقت ہمایوں بادشاہ کا نام اور اسکی تعریف موجود ہے جس سے زمانہ کا تعین ہوتا ہے، اور ایک جگہ سنہ تحریر ہے، پھر کتاب مراۃ الانساب، مراۃ احمدی، نسب نامہ مفتیان ریواڑی ارمغان دلی وغیرہ سے مصنف اور اس کے آبا و اجداد کے حالات علم میں آتے ہیں جس میں ان کا شجرۂ نسبی و شجرۂ قرآنی و شجرۂ شاعری وغیرہ بھی درج ہیں، اور اس کے بعد کا سلسلۂ شاگردی قاری حافظ حکیم سید شاہ نجم الدین صاحب نصیری کو ڑی کے شاگرد تک پہنچا ہے،

حضرت شاہ غلام رسولؒ کے مزار شریف کے متصل قلندری مسجد کی دیوار پر (جس کو قناتی مسجد بھی کہتے ہیں) اس کا قطعۂ تاریخ پتھر کے ابھرے ہوئے حرفوں میں لکھا ہے، دیوار گر جانے سے کچھ عبارت کے حروف ٹوٹ گئے ہیں، بقیہ یہ ہیں ؎

زگلزار نظام الدین گلے رفت — رسولش نام می گویند باغم
سیہ دل ماند لالہ از رحیلش — ......فخر دین از گشت داغم

(۳) دیوان منعم کی بابتہ لکھتے ہیں، کہ اس کو ۹۳۰ھ (۹۴۴) یا اس زمانہ کا دیوان قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی، ہو سکتا ہے کہ محمد اشرف منعم تخلص رکھتے ہوں، مگر کسی اور شخص کا تخلص منعم ہونا خارج از قیاس نہیں ہو سکتا، الخ

اس سلسلہ میں عرض ہے کہ حضرت مولانا شاہ محمد اشرف، حضرت شاہ غلام رسول (قدس اللہ اسرارہما) کے برادر زادہ ، ، (کتب مسطورۂ بالا) اور حضرت سجادہ نشین صاحب خانقاہ شعیبیہ تجارہ آفتاب میوات کے بزرگان گذشتہ سے ہیں، یہاں سوا اور کہیں یہ دیوان موجود نہیں، مولانا عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اردو ہند بھی اپنے گرامی نامہ نمبر ۵۳۴۹ میں ارقام

فرماتے ہین کہ

"میرے کتب خانہ مین قدیم اردو کے کئی سو قلمی نسخے موجود ہین، مگر آپ کے حضرت شاہ غلام رسول اور دیوان منعم کا کلام نہین ملا، آپ کی بدولت اس کی اطلاع پہلی بار ملی، کیا یہ ممکن ہے کہ مین آپ کی وساطت سے اس کی زیارت کر سکون، مثنوی مین ہمایون بادشاہ کا نام اور اس کی مدح موجود ہے، جو کافی ثبوت اس امر کا ہے کہ اس وقت کی لکھی ہوئی ہے، مین آپ سے مل کر اس مثنوی اور دیوان منعم کے متعلق گفتگو کرنا چاہتا تھا، یا یہ ممکن نہ ہو تو پھر دوسری صورت یہ ہے کہ اُن کی نقلین مل جائین"

رہا بعض شعرون کا کچھ صاف ہونا تو ہو سکتا ہے مضمون نگار نے صاف اشعار خاص طور پر منتخب کرکے اس لئے لکھے ہون کہ جس طرح کلام ولی و مثنوی میر حسن مین جو ڈیڑھ سو سال پیشتر کی زبان مین ہے، بہت سے اشعار کس قدر صاف ہین، ولی کے بعض اشعار بالکل آج کل کے معلوم ہوتے ہین، جیسے :-

خوب رو خوب کام کرتے ہین اک نگہ میں غلام کرتے ہین

آرزوے چشمۂ کوثر نہین ہون پیاسا شربت دیدار کا

اے ولی رہنے کو دنیا میں مقام عاشق کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

مثنوی میر حسن کے متعلق مولانا آزاد حیرت سے پوچھتے ہین "کیا اسے سو برس آگے والوں کی باتین سُنائی دیتی تھین کہ جو کچھ کہا صاف وہی محاورہ اور وہی گفتگو ہے، جو اب ہم تم بول رہے ہین" اور دیکھئے کتاب "دکن مین اردو" کے اندر خواجہ گیسو دراز قدس سرہٗ متوفی ۸۲۵ھ کا یہ شعر موجود ہے،

پانی مین نمک ڈال مزا دیکھنا اسے جب گھل گیا نمک تو نمک بولنا کسے (از بیاض مظہر)

اس کے ساتھ کلام منعم پڑھا جائے :-

منعم جو نشہ سبز سین سرخوش ہین ان کے تئین می سیتی زیادہ بخشتے ہین دیکھو بہار خط

تو نمک والے شعر سے کہین زیادہ قدامت کلام منعم مین پائی جاتی ہے،

اسی طرح سلطان محمد قلی قطب شاہ متوفی ۱۰۲۲ھ یا ۱۰۲۰ھ کا یہ شعر ہے :-

کرتے ہین دعوی شعر کا سب اپنی طبع سون بخشا فصیح شعر معانی کے تئیں خدا

اور سلطان محمد قطب شاہ متوفی ۱۰۳۵ھ کا یہ شعر لکھا ہے،

ساقیا آشراب ناب کہان حیدر کی پیالی میں آفتاب کہان

سلطان عبد اللہ قطب شاہ متوفی ۱۰۸۳ھ کا یہ شعر بھی ملاحظہ ہو ؎

آب حیات سے ہے زیادہ یہ لب ترا کرتے ہین مجھ سے خضر علیہ السّلام بحث

اس کے مقابلہ مین کلام منعم دیکھئے :-

منعم جو نشہ سبز سین سرخوش ہین ان کے تئین می سیتی زیادہ بخشتے ہے، دیکھو بہار خط

جس سے اشعار مذکورۂ بالا سے کہین زیادہ قدیم زمانہ کا اندازہ ہوتا ہے،

———•———

ادبیات

کلامِ احسان

از جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے، ال ال بی، علیگ، اعظم گڈھ

عبث ہوش و خرد کا ادعا معلوم ہوتا ہے
جنون ہی زندگی کا رہنما معلوم ہوتا ہے

یہ کیسا اب سکونِ جانفزا معلوم ہوتا ہے
مگر دل وقفِ تسلیم و رضا معلوم ہوتا ہے

کوئی شوریدہ سر محوِ دعا معلوم ہوتا ہے
کہ جنبش مین حریم کبریا معلوم ہوتا ہے

نظر سے گرچہ وہ میری جدا معلوم ہوتا ہے
مگر پھر بھی عجب اک ربط سا معلوم ہوتا ہے

یہ ریزش اشک پیہم کی یہ سوزش جان پرغم کی
تمھاری یاد مین سب کچھ بھلا معلوم ہوتا ہے

زبان آمادۂ شکوہ سرائی ہو تو کیونکر ہو
کہ مجھ کو حسن بالکل بے خطا معلوم ہوتا ہے

کسی محمل نشین کی جنبشِ ابرو سے کیا ہوتا
غبارِ قیس خود اٹھتا ہوا معلوم ہوتا ہے

کرون کیا درد کو مرہونِ منت چارہ سازون کا
کہ آپ اپنا یہ خود مشکل کشا معلوم ہوتا ہے

نظر آتی کسی کو ہو گی ذوقِ عشق کی منزل
مجھے تو اک غمِ لا انتہا معلوم ہوتا ہے

یہ سازِ دہر گو خاموش ہے لیکن پسِ پردہ
عجب اک مطرب آتش نوا معلوم ہوتا ہے

عجب ذرہ ہے یہ دل بھی کہ جس کی وسعتِ جولان
یہ سارا عرصۂ ارض و سما معلوم ہوتا ہے

غبارِ زندگی ہے خود ترا اک پردۂ حائل
دگرنہ اس کا جلوہ برملا معلوم ہوتا ہے

بچاتا پھر رہا ہے یون جو کشتی موجِ طوفان سے
عجب بے راہ رو یہ ناخدا معلوم ہوتا ہے

چلا ہے ساتھ شاید لیکے عقلِ مصلحت بین کو
یہ دل کیون ٹھوکرین کھاتا ہوا معلوم ہوتا ہے

یہ کیسی ہو رہی ہے آج جنبش چشمِ ساقی کو
کہ اک خمخانۂ اسرار وا معلوم ہوتا ہے

یہ ہے کس کے تصور کی تجلی سامنے جس کے
مجھے سب محوِ نقشِ ماسوا معلوم ہوتا ہے

اشارہ اس نظر کا دیکھتا ہون وجد کرتا ہون
عجب اک نغمہ بے ساز و صدا معلوم ہوتا ہے

نظر حیران، زبان خاموش، دل مجبور، جان عاجز
بس اب تو کچھ ترا ہی آسرا معلوم ہوتا ہے

جنون کیسے کہوں تیرے جنون کو مین کہ تو اب تک
غمِ سود و زیان مین مبتلا معلوم ہوتا ہے

جہان تک ان کے اندازِ ستم پر غور کرتا ہون
سراپا عالمِ مہر و وفا معلوم ہوتا ہے

کہان جائین کسے دیکھیں کہ ہم شوریدہ جانون کو
ترے ہی در پہ ہو جانا فنا معلوم ہوتا ہے

نظر کیا پردہ ہائے ساز کی جنبش یہ ہے تیری
یہ سب کیفِ دلِ رنگین نوا معلوم ہوتا ہے

یہ کیون آزردہ دل بیٹھے ہین اربابِ چمن آخر
خزان کا رنگ بھی کچھ دلربا معلوم ہوتا ہے

ادائین تو ذرا احسان کی اہلِ نظر دیکھین
بظاہر گو فقیرِ بے نوا معلوم ہوتا ہے

باب التقریظ والانتقاد

"مولانا عبید اللہ سندھی اور ان کے افکار و خیالات پر ایک نظر"

مرتبہ مولانا مسعود عالم صاحب ندوی، حجم ۱۹۰ صفحے، تقطیع چھوٹی ناشر مکتبہ دین و دانش، کھنیان کنوان بانکی پور پٹنہ قیمت ؎ ۱۲

از

سید ریاست علی ندوی

مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے افکار و خیالات پر چند مستقل کتابیں شائع ہوئی ہیں، زیر نظر رسالہ ان کے جواب و نقد میں ترتیب پایا ہے، مولانا سے مرحوم اپنی پوری زندگی میں پرشور انقلابی حوادث سے دوچار ہوتے رہے، اور ان کی زندگی کے ہر نئے موڑ پر نیا ماحول اور نئے افکار اُن کے سامنے آتے گئے، دیوبند کی دینی و مذہبی فضا سے نکل کر لادینیت کے مرکز ماسکو میں پہنچا پھر ترکی میں عین اُسی زمانہ میں جا جب کہ تجدد پسند ترک پوری ترکی قوم کی قلب ماہیت میں مصروف تھے، پھر اچانک حجاز میں چلا آنا جہاں نجد کی دینی تحریک کو نیا غلبہ حاصل ہوا تھا، ان کے افکار میں تزلزل پیدا کرنے کے لئے کچھ کم موثرات نہ تھے، ان سب ملکوں میں دینی، سیاسی، معاشی اور معاشرتی افکار و خیالات میں شکست و ریخت کا عمل غیر معمولی سرگرمی سے جاری تھا، مولانا مرحوم نے ان متضاد ماحولوں میں اپنی غیر معمولی فطری ذہانت پر اعتماد رکھ کر ان متضاد افکار و خیالات کو تولنے اور انھیں رد و قبول کرنے کا عمل جاری رکھا، اور اپنی فطری ذہانت سے متضاد افکار نظریوں اور رایوں کو ہم آہنگ کرنے اور اپنے فہم کے مطابق ان میں باہم رابطہ قائم کرنے میں اپنی ذہانت کا حیرت انگیز کمال دکھایا،

اتفاق کی بات ان کے خیالات کی ترجمانی کے لئے جو ذی علم نوجوان پروفیسر محمد سرور (جامعی) نامزد کیے گئے، انھیں بھی چھوٹے پیمانہ پر تقریباً اسی قسم کے متضاد ماحول سے سابقہ رہ چکا تھا، ایک طرف وہ جامعہ ملیہ سے وابستہ تھے، دوسری طرف وہ اسی چہار دیواری میں مولانا سورتی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے تھے جنھیں بقول موصوف "اسلاف کے تتبع میں بڑا تشدد تھا، اور طالب علم کے لئے شریعت کی معمولی سے معمولی شعار کی بھی عدم پابندی کو گوارا نہ کر سکتے تھے" پھر وہ مصر پہنچے، اور ایک طرف وہ جامعہ ازہر کے شیوخ کے حلقۂ درس میں بیٹھے، اور دوسری طرف مشہور مصری بے دین ملحد، ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے لکچروں میں شریک رہے، اور جب وہ مصر سے لوٹے تو بقول خود "ایک مسلسل ذہنی کوفت، ہر لمحہ اضطراب کی کیفیت، نہ کامل یقین، اور نہ پورا انکار، تشکک جو ہر وقت دماغ کو مصروف اور دل کو پریشان رکھے، ...... یہ حاصل تھا، جو وادی نیل سے لیکر راقم الحروف وطن لوٹا" (مقدمہ مولانا عبید اللہ سندھی" ص ۱۴) در اصل یہ موزون ترین ذہنی آئینہ ہو سکتا تھا جس میں مولانا سندھی کے متضاد افکار و خیالات کی عکاسی کا کام بڑی خوش اسلوبی سے انجام پا سکتا تھا، اور یہ حقیقت ہے کہ ترجمان نے بڑی دلکشی و خوش سلیقگی سے اپنا فرض انجام دیا، متضاد افکار و خیالات کو ایک سلسلہ میں پرونے انھیں تشبیہات و تمثیلات سے سنوارنے، کسی ایک ہی واقعہ کو دو متضاد زاویوں سے دیکھنے، اور دونوں کو بظاہر دلنشیں انداز میں سمجھا دینے کی ایسی کم مثالیں ملیں گی، لیکن حق و باطل کو

خواہ جتنے پردون مین چھپایا جائے جس قسم کا آب ورنگ دیا جائے، اور ذہانت کی مدد سے جیسے نتائج مرتب کئے جائین، اہل نظر پران کی حقیقتین آشکارا رہین گی ــ مگر اسلام اور مسلمانون کی مذہبی، تمدنی اور ملی زندگی کے لئے ایسی کتابین زیادہ نقصان رسان نہین، جو کھلے طور پر الگ شاہراہ اختیار کرکے تیار کی گئی ہون لیکن ایسی کتابون سے جیسی کہ مولانا سندھی کے سلسلہ مین شائع ہوئی ہین، خصوصاً نوجوان اور دین اور اسلامی تاریخ و تمدن سے ناواقف مسلمان طبقون مین جس قسم کے زہریلے اثرات کے پھیلنے کا امکان ہوسکتا ہے، اس کا حقیقی اندازہ لگانا بھی دشوار ہے،

مولانا سندھی نے جب ابتداءً اپنے خیالات ظاہر کئے، تو ان کے دیرینہ عقیدت مند حلقون مین ان کے مفہوم و معانی پر شک و شبہہ کی نظر ڈالی گئی، الفرقان کے ولی اللہ نمبر مین مدیر الفرقان نے ان کی عبارتون کے مختلف مفہومون کے اعتبار سے ایسے پہلوؤن کو اختیار کرنا چاہا، جو مسلمہ حقائق کے مخالف نہ ہون، اور دبی زبان سے ان کے مخالف پہلوؤن کے مطالب سے اختلاف کرکے ان کی تردید کی، لیکن مولانا سندھی اپنے افکار کی اشاعت کے لئے ایک مستقل مجلس کی تاسیس عمل مین لا چکے تھے، بنا بریں وہ مستقل تصنیفات کی شکل مین بڑی آب و تاب سے شائع کئے گئے، اور ملک کے سنجیدہ حلقون مین ان کی مستقل تردید کی ضرورت محسوس کی گئی، چنانچہ اس سلسلہ مین سب سے پہلے مولانا مسعود عالم صاحب ندوی نے معارف مین ان کی دو کتابون پر اپنا سلسلہ مقالات شائع کرایا، اب ان مضامین کا مجموعہ عام افادہ کے لئے عنوان بالا سے رسالہ کی شکل مین شائع کیا گیا ہے، موصوف کا پہلا سلسلہ مضامین مولانا سندھی کی زندگی مین شائع ہوا تھا، چنانچہ مولانا سے مرحوم اور ناقد کے درمیان بعض خیالات کی تشریح و توضیح مین مراسلت بھی ہوئی، خطوط بھی رسالہ مین منسلک کر دیئے گئے ہین جن سے رسالہ کی افادیت مین اضافہ ہوگیا ہے، نیز رسالہ کی ابتدا مین حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی مدظلہ کا ایک مختصر و جامع مقدمہ ثبت ہے، جس مین ہندوستان مین مسلمانون کے دور تنزل اور اس کے دور کرنے کے لئے مختلف مصلحین و مفکرین کی مساعی کا ذکر آیا ہے، اور ان کے نتائج اختصار سے پیش کئے گئے ہین پھر مولانا سندھی کے سوانح حیات کے پس منظر سے ان کے افکار کا جائزہ لیا گیا ہے، اور ان کی بعض غلطیان نمایان طور پر دکھائی گئی ہین، افسوس ہے کہ اس سلسلہ مین صفحہ ۱۵ پر مولانا سے موصوف کے افکار کے تذکرہ مین اُن کے ماخذ کا حوالہ شائع ہونے سے رہ گیا ہے، انشاء اللہ معارف کے کسی آیندہ نمبر مین یہ مقدمہ مع حوالون کے نقل کر لیا جائے گا،

مولانا مسعود عالم کا پہلا سلسلہ مضمون مولانا سندھی کی تصنیف "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک پر استدراک و تنقیح" کے عنوان سے ہے، مولانا سندھی نے اس تصنیف مین حضرت شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادہ کو ایک منظم سیاسی تحریک چلانے والے کی حیثیت سے پیش کیا ہے، ناقد نے اس پر فاضلانہ نقد کیا ہے، اور اس سلسلہ مین مولانا سے مرحوم نے مرکزیت ثابت کرنے کے لئے واقعات کو جس رنگ مین پیش کیا ہے، اس کی اصل حقیقت ظاہر کی ہے، مولانا نے "پارٹی" کی اس تشکیل مین حضرت مولانا سید احمد شہید اور حضرت مولانا اسمٰعیل شہید رحمہما اللہ کے ان مجاہدانہ خدمات کو جو ان کے ہاتھون انجام پائے، اور جس کا غلغلہ ایک زمانہ مین پورے ہندوستان مین بلند ہوا، گویا ایک ضمنی حیثیت دے دی ہے، پھر اس تحریک کے بڑے بڑے اکابر جو مختلف صوبون مین گذرے، ان کا تذکرہ بھی ایسے اسلوب مین کیا ہے، جو حقیقت سے دور تھا، ناقد نے تاریخی حقائق و شواہد سے ان بزرگون کا اصل مقام دکھایا ہے، نیز چونکہ اس تحریک کے اکابر اپنے عقائد کے لحاظ سے مولانا سندھی کے بقول اسلام کی حجازی تعبیر کے بجائے "عجمی" یا "ایرانی بائی لاز" کے پیرو نہ تھے، اس لئے مختلف موقعون پر ان کے ساتھ انصاف قائم نہ رہ سکا ہے، ناقد نے اپنی بحث و نظر مین ان مسائل کو بھی صاف کیا ہے، نیز بعض دوسری تحتانی بحثین بھی آئی ہین،

دوسرا مقالہ "مولانا عبید اللہ سندھی" نام تصنیف پر لکھا گیا ہے، اس کتاب مین مولانا کے مختلف نوعیتون کے افکار پیش کئے گئے ہین، جن کا تعلق عقائد، کلام، تصوف، فقہ، تاریخ و سیاست سب ہی سے ہے، اس کے ساتھ مولانا کے چند خاص مذہب آمیز سیاسی افکار و خیالات ہین، اس سلسلہ مین مولانا نے ایک طرف پوری اسلامی تاریخ اور دوسری طرف ہندوستان کے پورے اسلامی عہد حکومت کا اپنے نقطۂ نظر سے جائزہ لیا ہے، اور عجیب و غریب تضاد کے ساتھ اپنے نظریے بیان کئے ہین، ناقد نے اسلامی علوم و عقائد کے مباحث پر جامعیت سے نقد کیا ہے، اور اسلام کے صحیح نقطۂ نظر کو پیش کیا ہے، اور تاریخی مباحث مین اجمالی تبصرہ کر دیا ہے، اور واضح اغلاط کو نمایان کیا ہے،

مولانا کے افکار کا جائزہ لینے کے لئے مستقل تصانیف کی ضرورت ہے، وہ ایک ہی سانس مین متضاد باتین کہہ جانے مین اپنا ثانی نہین رکھتے، ایک ہی بات کو جداگانہ زاویۂ نگاہ سے پیش کرتے ہین، اور ایک دوسرے سے متضاد نتائج نکالتے ہین، مثلاً ایک طرف تو وہ اسلام کو "انٹرنیشنل مذہب" کی صورت مین پیش کرتے ہین دوسری طرف "فی کل ارض ادم مثل آدمکم و نوح مثل نوحکم" ایک حدیث کا حوالہ دیکر کہتے ہین :-

"یہاں ارض سے مراد قوم ہے اور دنیا کو سات بڑی بڑی قومون، تہذیبون یا عالمین مین تقسیم کیا جا سکتا ہے، توریت انجیل اور قرآن صرف اس طرح کی ایک قوم کی تاریخ ہے، اسی قسم کے واقعات تقریباً سب قومون مین گذرے ہین" (مولانا عبید اللہ سندھی ص)

اس طرح قرآن مجید صرف ایک قوم یعنی عرب کی تاریخ بن گیا،

پھر فرماتے ہین :-

"مخاطبین کی رعایت سے اسے ایک خاص زبان اور مکان سے مخصوص کرنا ہوتا ہے، قرآن کے پیرایۂ بیان کی محدودیت بھی اسی بنا پر ہے" (ص ۸۶)

اس کے بعد عالمگیریت اور جامعیت کے تصور کو لاتے ہین، مگر محض "بین السطور مفہوم" کے اعتبار سے چنانچہ فرماتے ہین :

"لیکن اس کے باوجود جا بجا بین السطور مفہوم کی عالمگیریت اور جامعیت نمایان ہے، اگر آدمی قرآن کے مطالعہ مین تدبر و تعمق سے کام لے تو اس پر واضح ہو جائے گا، کہ کل نوع انسانی قرآن مین اپنا مافی الضمیر و مقصد پا سکتی ہے" (ص ۸۶، ۸۷)

گویا اس کا "کافۃ للناس" ہونا، یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رحمۃ للعالمین ہونا وغیرہ سب کے سب قرآن مجید کے بین السطور مفاہیم ہین، اور اس کے اصل مخاطب محض عرب ہین، با این ہمہ وہ انٹرنیشنل مذہب ہے،

اسی طرح مولانا کے نزدیک حقیقی مومن و کافر کی وہ نشانیان نہیں، جو قرآن مجید نے اپنی واضح آیات مین پیش کی ہین، بلکہ

"انانیت کا بیدار نہ ہونا مولانا کے نزدیک کفر ہے، اور جس کی انانیت بیدار ہو جائے، گو رسمی طور پر اسے لوگ کافر کہتے ہون، وہ حقیقت مین مسلمان ہوتا ہے" (صفحہ ۱۱۰)

گویا خواہ کوئی توحید، ذات و صفات کا قائل ہو یا نہ ہو، رسالت محمدی کا خواہ کوئی اقرار کرے یا انکار، یا بدرجۂ اعلیٰ سکوت اختیار کرے، لیکن اس کی انانیت بیدار ہو چکی ہے، تو وہ مسلمان ہے، اور عند اللہ بری الذمہ، ظاہر ہے، کہ ان عقائد کو اسلام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے ؟

مولانا کے نزدیک "اسلامی تصوف پر سب سے زیادہ اثر ہندو ویدانتی فکر کا ہوا ہے" (ص ۱۳۱) حالانکہ اسلامی تصوف کا

استرواد و مدار خالصتہً کتاب و سنت پر ہے۔ تصوف وہی ہے جس کو شریعت کی اصطلاح میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے، اور ن کو مولانا جذبۂ تصوف سے موسوم کرتے ہیں (ر ر ۱۳۰) البتہ یکسوئی کے حاصل کرنے کے لئے ذریعہ و آلہ کے طور پر بعض طریق عمل با ے اختیار کئے گئے ہیں، لیکن ان کی حیثیت ویسی ہی ہے، جیسے کہ بعض بزرگوں کی تمثیل کے مطابق نماز کے اوقات کے انضباط ے لئے گھڑی سے مدد لی جاتی ہے" اس طریق عمل کو عقائد و روحانیات سے تو کوئی علاقہ نہیں ہے،

مولانا مرحوم کا خیال ہے کہ ایران و ہندوستان کے مسلمانوں میں "آریائی ذہنیت" ہمیشہ باقی رہی، "عقیدہ کی تبدیلی ے فرد یا جماعت کی ذہنیت نہیں بدلا کرتی، ایرانی و ہندوستانی مسلمان ہوئے تو انھوں نے پیروں اور پیغمبروں کو وہ درجہ یدیا، جو قبل از اسلام اپنے بزرگوں کو دیتے تھے، اور پیر کا حکم خدا کا حکم سمجھا جاتا تھا" (ایضاً ۱۵۶)

اسی طرح حضرت شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق ارشاد ہے کہ "انھوں نے تجلی کا مسئلہ حل کر کے ایک طرف تو ایرانی فلسفی لت) اور سامی نبوت میں اس اختلاف کو رفع کر دیا، اور دوسری طرف غیر مسلموں پر اسلام کی حقانیت ثابت کر دیا اسا مو ن گیا (ایضاً ۱۵۶)

ان مسائل میں جن کا تعلق خالصتہً کتاب و سنت اور نفس اسلام سے ہے، ان میں آریائی ذہنیت کا سراغ لگانا ران بزرگوں پر وطنیت کے جذبہ و اثر سے آریائی ذہنیت کو قبول کرنے کا الزام لگانا کیسی صریح ناانصافی ہے، اگر اس موقع اسلام میں اتباعِ رسالت کی جو تشریح کی گئی ہے، اور تصوف میں شیخ کا جن اوصاف سے متصف ہونا، اور اس کے باع میں جن جن قیود و حدود کے قائم رکھنے کی تلقین کی گئی ہے، مولانا انھیں اپنی نگاہ میں رکھتے، تو وہ اس قسم کے ائے قائم نہ کر سکتے تھے،

مولانا فرماتے ہیں:۔

> "نبوت انسان کی جبلی استعداد کا انکار نہیں کرتی، اور انسان کی جبلی استعداد اس کے خاص ماحول سے ہی بنتی ہے، مثلاً ہندوستان میں فطرۃً "ذبح حیوانات" پسندیدہ نہیں، اس لئے اگر کوئی ہندوستانی ذبح حیوانات سے بچے، تو اس کا یہ فعل خلافِ نبوت نہ ہوگا، کیونکہ انسانوں کی جو فطرت ہوتی ہے نبوت اس کے خلاف نہیں جاتی، نبوت کا کام یہ ہے، کہ وہ افراد کے فطری رجحانات اور ان کی جبلی استعدادوں کے مطابق ان کے لئے ترقی کی راہیں بتائے" (ر ر ص ۵۵-۲)

یہاں اوّلاً یہ سوال ہو سکتا ہے، کہ یہ کلیۃً صحیح کیونکر ہے، کہ ہندوستان میں قدرۃً "ذبح حیوانات پسندیدہ نہیں" ر ایسا ہوتا، تو قربانی کے جو احکام ویدوں میں آئے ہیں، وہ کیوں پائے جاتے، یا آج بھی ہندوؤں (جینی، بودھ نہیں) ت عام طور پر قربانی کی رسمیں کیوں انجام پاتی ہیں، ان میں رسومِ قربانی کے ترک کرنے کی تلقین تو صرف پارس ناتھ مہابیر اور دھ نے کی ہے، لیکن نرگرنتھ جین اور بودھ مت کے ماننے والوں کی کتنی تعداد ہندوستان میں پائی جاتی ہے، بودھ مت ، فروغ کے بعد جب برہمنوں کے دورِ حکومت میں اس کے خلاف تلقین کی گئی، تو ہندوستان کی فطرت و جبلت کے مخالف نے کے باوجود قربانی کی رسموں کو دوبارہ کیوں فروغ حاصل ہوا،

اگرچہ یہ صحیح ہے کہ ویدک دھرم کے کچھ پیروؤں نے جین اور بدھ مت کے ایک اصول "اہنسا" کو اپنے دھرم ن وسعت دے کر قبول کر لیا، لیکن ان کی فطرت و جبلت سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے، یہ تو قربانی کے سلسلہ میں یوں میں جو بے شمار خرافات رسمیں پھیل گئی تھیں، اور جن سے ان کا دھرم رسموں کا ایک گورکھ دھندا بن گیا تھا، اس کے خلاف

اہنسا کے اصول کا پرچار ایک موثر اصلاحی قدم تھا، اگر آریوں کی فطرت و جبلت ذبح حیوانات کو ناپسند کرتی، توان مین قربانی اور اس سلسلہ مین بے شمار رسمون کو مقبولیت مہرے سے حاصل ہی نہ ہوتی، اور نہ ان مصلحین کوان کی اصلاح کی ضرورت پیش آتی، علاوہ ازین کسی خاص مصلحت سے کسی خاص جانور کے ذبح سے دستکش ہو جانا بھی نفس ذبح حیوانات سے جبلتہً انکار کرنے کے مترادف نہین ہے،

علاوہ ازین اگر ہندوستان مین ذبح حیوانات کی ممانعت "خلاف نبوت" نہین تھی تو مولانا کے بقول فقہ حنفی کی تشکیل و تدوین آریائی نسل کے مسلمان اکابر کے ہاتھون ہی انجام پائی تھی، اور ان کے بقول فقہ حنفی دراصل ایرانی بائی لاز ہو جو آگے چل کر فارسی بولنے والی قومون کے مرکز دہلی مین اسلام کی ایک مستقل فقہ کی حیثیت سے نو پذیر ہوئی (شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ ص) اور "قرآن کے بین الاقوامی قانون کی حجازی تعبیر عربون کیلئے قومی مذہب تھی اور اس کی حنفی تعبیر عجم کا قومی دین قرار پائی (ص ۲۶۲) اور اسی سبب سے ان معانی ہی کو قرآن سمجھے (ص ۲۶۲) بایں ہمہ ان ایرین نژاد مسلمان فقہا نے اسلام کے اس ایرانی بائی لاز یا عجم کے اس "اسلامی قومی دین" مین بھی جو مدون ہوا اور احکام نبوت کے خلاف بھی نہ تھا، پھر بھی ذبح حیوانات کو اس فقہ مین بھی ممنوع یا ناپسندیدہ نہین کیا گیا جب اس ایرانی بائی لاز نے ایرین قومون میں سے ایک بڑی قوم کی جبلت و فطرت تک کا کوئی لحاظ نہین کیا تو آخر کس قسم کی وطنی و نسلی رعایتین ان بائی لاز مین رکھی گئی ہین، کہ اس کو "ایرانی بائی لاز" سے موسوم کیا جائے مولانا اپنے خیالات کے تولنے کے لئے جو ترازو تیار کرتے ہین ان کے نظریے اس ترازو پہ بھی پورے نہین اترتے، مولانا کے افکار و خیالات اسی قسم کے خلاف واقعہ و خلاف قیاس تعبیرات کا ایک خوشنما انبار ہے،

اکبر کے متعلق مولانا کا دلچسپ نظریہ ہو وہ اس کے دین الٰہی کے بڑے مداح اور اسکو فکر کی عظیم ترین بلندی تصور فرماتے ہین دین الٰہی کے مبادی عقائد اور اسلام کی تعلیمات مین جو بین تضاد ہو وہ اہل علم پر پوشیدہ نہین ناقد نے اس کی طرف اشارے کیے ہین نیز اس سلسلہ مین حضرت مولانا شاہ ولی اللہ صاحب کے متعلق جو غلط فہمی پھیلائی گئی تھی کہ ان کے نزدیک اس کا اقدام عین صواب تھا (ص ۳۲) اس کے متعلق حضرۃ الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے مقدمہ مین شاہ صاحب کی کتاب "انفاس العارفین" کے اقتباس کو پیش کرکے اس کا پردہ چاک کیا ہے،

اکبر کے سلسلہ مین مولانا سندھی کے افکار عجیب قسم کے تضاد کے حامل ہین، ایک طرف وہ فرماتے ہین :-

"اکبر پہلا مسلمان فرمانروا تھا جس نے اس ملک میں آزاد اسلامی ہندوستانی سلطنت کی بنیاد رکھی، جو نہ ایران کی حلقہ بگوش تھی، اور نہ عثمانی سلاطین کے تابع، یہ مسلمانون کی قیادت مین ہندوستان مین قومی حکومت کی تشکیل تھی، اور اسلام کے اصول و قوانین کے اندر ہندوستانی قومیت اور اس کے تمدن اور تہذیب کو زندہ کرنے کی کوشش" (ص ۲۹۳)

پھر اسی سانس مین فرماتے ہین :-

"حکومت کا دین اسلام نہ رہا، اکبر اب صرف مسلمانون کا بادشاہ نہ تھا، بلکہ سارے ہندوستانیون کا فرمانروا تھا، اور ساری رعایا بادشاہ کی نظر مین یکسان اور مساوی تھی" (ص ۲۹۴)

اب صرف سوال یہ رہ جاتا ہے کہ جس حکومت کا دین اسلام نہ رہا ہو، اور جس کی نظر مین مسلم او غیر مسلم مین کوئی ذاتی امتیاز نہ ہو، اس کو آزاد اسلامی ہندوستانی سلطنت (ص ۲۹۳، ص ۳۰۹، ص ۳۱۳) وغیرہ سے کیونکر موسوم کیا گیا، وہ آزاد ہندوستانی سلطنت تو کہی جا سکتی ہو مگر اس پر اسلامی کا انطباق کس حیثیت سے کیا جا سکتا ہو،

اسی سلسلہ مین دوسری دلچسپ بات یہ ہو کہ مولانا کے بقول "اکبر کے دین الٰہی کی بنیاد عقیدۂ وحدۃ الوجود کی اصل حقیقت پر ہے" (ص ۲۹۰) پھر خود ہی ارشاد فرماتے ہین کہ "ابن عربی جو مسلمانون مین اس فکر کے بانی اور مبلغ ہین ان کی اپنی زندگی اتباع حدیث کا نمونہ تھی، چنانچہ وہ (ابن عربی) خود فرماتے ہین، کہ ہر حقیقت جو خلاف شریعت ہو گمراہی ہے" (ص ۲۹۰)

یہاں یہ سوال ہو سکتا ہو کہ اکبر کا دین الٰہی خلاف شریعت تھا یا نہیں، اگر خلاف شریعت تھا تو اس فکر کے بانی و مبلغ ابن عربی کے فیصلہ مطابق وہ گمراہی قرار پاتا ہو یعنی انہی کے فلسفہ پر اس کی بنیاد ہو، اور انہی کی نظر میں وہ گمراہی ہے۔

اورنگ زیب کے متعلق مولانا کا خیال ہے کہ اس کی خواہش تھی کہ

"وہ اس ہندستانی اسلامی سلطنت کے دائرۂ اثر کو اتنی وسعت دے کہ اس کے اندر خیبر پار کے ملک بھی آجائیں اور جنا پر بھی اس کا اقتدار ہو اور یہ اس وقت تک ممکن نہ تھا جب تک وہ اپنی حکومت کو اسلامی رنگ نہ دیتا، اور اکبری سیاست کے بارے میں اسلامی دنیا میں جو غلط فہمیاں پیدا ہوگئی تھیں، ان کو رفع نہ کرتا" (ایضاً ص ۳۱۴)

اس طرح غریب اورنگ زیب عالمگیر نے اسلامی آئین و احکام کی جو کچھ پابندی کی اور اپنے حدود حکومت میں شریعت کے نفاذ کے لئے قدم اٹھایا، وہ نیت و اخلاص کے بجائے تمام تر سیاسی حکمت عملی پر مبنی قرار پاتا ہو، اور اکبر کی روش کی جو انہی مذمت کی وہ اپنے نہیں کہ اسکے دینی نظر سے ایسا کرنا ضروری تھا بلکہ وہ "غلط فہمیوں" کو دور کرکے عالم اسلامی پر قبضہ کرنے کے لئے اپنی فضا کو ساز گار بنانا چاہتا تھا، ا کے سیاسی تدبر و دوراندیشی، اور فکر عالی کے پردہ میں اس کے سر یہ سارے بہتان اس لئے تھوپے گئے کہ اس کے ہاتھوں ہندوستان سی و ذہنی ارتقاء کی اس منزل پر پہونچ سکے، کہ وہ ایشیائی ممالک میں بین الاقوامی سیاست کا ایک اہم مرکز بن سکے (ص ۳۱۳) لیکن مگیر کے ہاتھوں ہندوستان کو بین الاقوامی سیاست کا مرکز دکھانے کی کوششوں میں خود غریب عالمگیر کے دین و اخلاق کا دامن کس قدر داغدار ہوگیا، اس پر نگاہ نہ جاسکی، اور نہ اس نظریہ کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے میں یہ نظر آسکا کہ ایسی حالت میں حکمران و کشورکشا کی یت سے خود عالمگیر کا مرتبہ کس قدر گر جاتا ہے، کہ وہ اپنے ۵۰ سالہ دور حکومت کے باوجود اس مقصد کے حصول میں اس قدر ناکام مغرب میں اپنے حدود حکومت سے باہر کی سرزمین کا ایک چپہ بھی اپنے قبضہ میں نہ لاسکا، بلکہ اپنے خیال کو عمل کا جامہ پہنانے کے لئے یائی حکومتوں میں سے کسی ایک حکومت کے حدود میں بھی قدم رکھنے کا حوصلہ نہ کرسکا، اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ صرف ہندوستان ئے ایشیائی سلطنتوں میں بین الاقوامی مرکزیت کا طغرائے امتیاز حاصل کرنے کے لئے عالمگیر کی ثناخوانی ہی کے پردے میں اس کے دین ب، سیرت و کردار کو کس قدر مسخ کیا گیا ہو، اور اس مرقع میں اس کی جیسی تصویر اتاری گئی ہے کیا اس کے عہد کی تاریخ کے پڑھنے والے لمحہ کے لئے بھی اس کو صحیح باور کرسکتے ہیں،

لائق ناقد نے اس رسالہ میں مولانا کے اسی قسم کے افکار و خیالات کا جائزہ پوری کامیابی کے ساتھ لیا ہے، اور مختلف دینی ی، وتاریخی مسائل و مباحث میں ان کے بے بنیاد نظریوں، اور قیاسوں، اور غیر صحیح دلیلوں کی نشان دہی کی ہے، امید ہے کہ حلقوں میں مولانا کے افکار پڑھے گئے ہیں، ان میں اس رسالہ کو خاص طور پر مطالعہ میں لایا جائے گا، کہ اہل نظر حقائق کے صحیح سراغ ب اجمالی خاکہ دیکھ لیں اور غلطیوں کی انہی نشان دہیوں پر مولانا کے بے شمار نت نئے افکار اور نظریوں کا اجمالی تصور کرسکیں اور لامی حلقے ان مضرتوں کے پھیلنے سے محفوظ رہیں، جو ان افکار کی ترویج سے پیدا ہوسکتی ہیں،

روح الاجتماع

(جدید اڈیشن)

موسیو لیبان کی کتاب "جماعتہائے انسانی کے اصول نفسیہ" کا اردو ترجمہ جس میں انسانی جماعت کے اخلاق، پبلک رہنماؤں مخصوصیات اور جماعتوں کے بننے بگڑنے کے قوانین نفسی بیان کئے گئے ہیں، ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت عہ

"منیجر"

مطبوعات جدیدہ

مارننگ نیوز کا عید نمبر (انگریزی)، مرتبہ جناب عبدالرحمٰن صدیقی صاحب تقطیع بڑی ٹائٹل پیج رنگین و دیدہ زیب۔ کاغذ کتابت وطباعت بہتر ضخامت ۸۰ صفحے قیمت عہ ملنے کا پتہ، مارننگ نیوز، ۲۵، چورنگی، کلکتہ،

مارننگ نیوز کلکتہ کا روزانہ انگریزی اخبار ہے، جو جناب عبدالرحمٰن صاحب صدیقی کی ادارت میں کئی سال سے برابر نکل رہا ہے، اور اپنے طرز نگارش اور پالیسی کے لحاظ سے معاصر اخباروں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے، ہر سال عید کے موقع پر اس کا ایک عید نمبر بھی نکلتا ہے جس میں مختلف قسم کے مفید مضامین ہوتے ہیں چنانچہ اس سال کے عید نمبر میں نہ صرف سیاسی، بلکہ تاریخی، ادبی اور مذہبی مقالات بھی ہیں جن کے لکھنے والے بیشتر ملک کے مشاہیر ہیں، نیاز احمد خان صاحب آئی سی، ایس نے جاوید نامہ اقبال کے لفظ میں" کے عنوان سے جاوید نامہ کی اس تلخیص کو پیش کیا ہے، جو اقبال مرحوم نے گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن میں ان کو لکھائی تھی، مضمون نگار کا بیان ہے کہ جاوید نامہ کی تلخیص ختم کرتے وقت اقبال مرحوم کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے، جو دیر تک نہ رک سکے ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب نے اقبال کے فلسفۂ خودی کی روشنی میں دل نشین انداز سے "شخصیت" پر بحث کی ہے، اخبار کے فاضل اڈیٹر نے محمد علی شاہ تقی جار سے استنبول میں اپنی ملاقات کا حال بہت دلچسپ پیرایہ میں بیان کیا ہے، ایک یورپین اہل قلم نے مغربی موسیقی پر مسلمانوں کے اثرات بتائے ہیں، قاضی عبدالغفار صاحب نے ایک فرانسیسی مصنف کی ایک کتاب سے انگریزی زبان کے کچھ اقتباسات پیش کئے ہیں، جس سے چینی مسلمانوں کے متعلق بعض تفصیلات معلوم ہوتی ہیں، جناب مودود الرحمٰن صاحب بیرسٹرایٹ لانے بنگال کے اردو کے ہندو اور مسلمان شعرا پر ایک اجمالی تبصرہ کرتے ہوئے دعویٰ کیا ہے کہ بنگال اردو کی خدمت میں کسی دوسرے صوبہ سے پیچھے نہیں رہا، اے، اے فیضی صاحب نے اپنے مقالہ "ہندوستانی زبان کا لسانی جائزہ" میں یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ہندوستان کی عام بول چال کے لئے ایک ایسی آسان ہندوستانی زبان ہونی چاہئے جس کے ایک ہزار بنیادی الفاظ ہوں، ڈاکٹر محمود حسین نے اپنے مضمون میں ہندوستان کی وہابی تحریک کی اجمالی تاریخ بیان کی ہے، ان خاص مضامین کے علاوہ حیدرآباد، بھوپال، رامپور، بہاولپور، اور پالن پور کی صنعتی و تجارتی ترقیوں پر پُر ازمعلومات مقالات ہیں، مجموعی حیثیت سے اس کو صحیح معنوں میں عید کا قابل قدر علمی تحفہ کہا جا سکتا ہے،

رزم نامہ مصور اڈیشن (انگریزی) مولفہ جناب ام عبداللہ چغتائی صاحب تقطیع اوسط، کاغذ کتابت، طباعت بہتر ضخامت ۴۸ صفحے، قیمت ندارد، ملنے کا پتہ دکن کالج ریسرچ انسٹیٹوٹ، پونا،

جناب ڈاکٹر عبداللہ صاحب چغتائی (دکن کالج، پونا) کا اسم گرامی ہندوستان کی علمی دنیا میں کافی روشناس ہے، ہندوستان کے اسلامی عہد کا تعمیری آرٹ اور مصوری موصوف کا خاص موضوع ہے، جس پر انگریزی میں برابر ان کے مضامین نکلتے رہتے ہیں، ان کا ایک مقالہ مندرجۂ بالا عنوان سے دکن کالج ریسرچ انسٹیٹوٹ کے جرنل میں شائع ہوا تھا، جو کتاب کی صورت میں زیر نظر ہے، اکبر کے حکم سے مہابھارت کا فارسی ترجمہ رزم نامہ کے نام سے کیا گیا تھا، اور اس کے کئی مصور نسخے بھی اکبر اور اس کے درباریوں کی خواہش سے تیار کئے گئے تھے، فاضل مؤلف نے اس مقالہ میں ان نسخوں کی مصوری پر ناقدانہ بحث کی ہے، جو تیموری عہد کی مصوری سے ذوق رکھنے والوں کے لئے مفید و دلچسپ ہے، کتاب میں رزم نامہ کی تصویروں کی مختلف پلیٹیں بھی دی ہیں، مگر کسی وجہ سے تمام پلیٹیں شامل نہیں ہو سکی ہیں اس لئے فاضل مولف نے پلیٹوں کی روشنی میں جو تنقیدیں کی ہیں، ان کو سمجھنے میں جا بجا دقت محسوس ہوتی ہے۔ "ص ع"

جلد ۵۵ ماہ صفر ۱۳۶۴ھ مطابق ماہ فروری ۱۹۴۵ء عدد ۲

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۲۵ - ۲۶
شیخ اکبر محی الدین بن عربی کا نظریۂ علم،	مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ	۲۷ - ۳۴
واگھ بھٹ یا شفائے محمودی،	مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورنیکلر سوسائٹی احمد آباد	۳۵ - ۴۲
ابن خلکان کے فارسی ترجمے،	جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جوناگڈھی	۴۳ - ۴۵
غزل	از جناب روش صدیقی	۴۶
	از جناب یحییٰ اعظمی	"
مطبوعات جدیدہ	" م "	۴۷ - ۴۸

شذرات

ہندوستان کے مسلمانوں میں اسلامی علوم و فنون کی خدمت اور اسلامیات سے متعلق تحقیقات کا ذوق اب خاصہ ترقی کر گیا ہے، اور بہت سے اصحاب علم اور متعدد ادارے اس کام کو انجام دے رہے ہیں، لیکن کام کی اہمیت اور وسعت کے لحاظ سے ابھی اس کی رفتار نا کافی ہے، خصوصاً مسلمانوں کے علمی و تعلیمی مرکزوں میں جہاں اصحاب علم کی جماعتیں موجود ہیں تحقیقاتی اداروں کی بڑی ضرورت ہے، اس کی توقع سب سے زیادہ علی گڈہ سے ہو سکتی تھی، لیکن اس میدان میں اس کا قدم سب سے پیچھے تھا، مگر اب وہاں کی فضا بھی بدلنے لگی ہے، اور ادھر چند برسوں کے اندر سنجیدہ علمی کاموں کی طرف بھی کافی توجہ ہوگئی ہے جس کا ایک مفید نتیجہ انڈین انسٹیٹیوٹ ہے، اس نے تھوڑی مدت میں متعدد مفید علمی کتابیں شائع کیں مجلس مصنفین کے نام سے اردو کی بھی ایک علمی مجلس قائم کی ہے جس کا رسالہ مصنف کئی سال سے علمی و ادبی خدمت انجام دے رہا ہے، مجلس مذکور میں وقتاً فوقتاً مفید مقالات بھی پڑھے جاتے ہیں، جو رسالہ مصنف کے علاوہ علحدہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوتے رہتے ہیں،

تازہ خوشخبری یہ ہے کہ کمال یار جنگ تعلیمی تحقیقاتی کمیٹی کی سفارش کے مطابق آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے زیر نگرا ایک آل انڈیا اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے قیام کی اسکیم منظور ہوئی ہے جو ابتدائی تعمیری مراحل سے گذر رہی ہے، یہ انسٹی ٹیوٹ اسلا علوم و فنون کی خدمت اور اسلامیات سے متعلق تحقیقات کے تمام شعبون پر حاوی ہے، کانفرنس کو ایک ایسے علم دوست بزرگ ت کی سرپرستی حاصل ہے، اسلامی علوم و فنون کے ساتھ جن کی شیفتگی معلوم و مشہور ہے، اس لئے امید ہے کہ یہ مجوزہ اسکیم جلد عملی شکل اختیا کرے گی، ہم علمی برادری مین اس قیمتی اضافہ کا دلی مسرت سے خیر مقدم کرتے ہین،

انسٹی ٹیوٹ مذکور کے مقاصد مین علمی کتابون کی اشاعت کے لئے اس کے ذاتی پریس کا قیام بھی ہے یہ سب سے مقدم ا ضروری چیز تھی، اب علمی کام کرنے والون کی اتنی کمی نہین جتنی اس کی طباعت و اشاعت کی دشواریان ہین، عموماً مصنفین کو تصنیف کی محنت و جانکاہی کے ساتھ اس کے طبع و اشاعت کی زحمتون کا بار بھی اٹھانا پڑتا ہے جس کے متحمل کم اشخاص ہو سکتے ہین، گو اب بعض ناشرین کتب ایسے پیدا ہو گئے ہین جنھون نے کسی حد تک مصنفین کو اس زحمت سے بچا لیا ہے، لیکن اس سے دشواری کا پو حل نہین ہوا ہے، اور ایک ایسے پریس کی ضرورت باقی تھی جس کا مقصد صرف علم و فن کی خدمت و اشاعت ہو، امید ہے، کہ اس انسٹی ٹیوٹ سے یہ ضرورت بھی پوری ہو جائے گی،

یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ بنگال کے مسلمانون مین اردو زبان سے دلچسپی پیدا ہونے لگی ہے وہان انجمن ترقی اردو کی شاخ قائم ہے، اردو سے متعلق تقریبین اور یادگارین بھی منائی جاتی ہین، بنگالی زبان مین اردو کی بعض مفید کتابون کے تراجم کا سلس بھی شروع ہو گیا ہے لیکن اولاً یہ ذوق و شوق زیادہ تر کلکتہ کے اندر محدود ہے، دوسرے صرف اتنی دلچسپی سے اردو زبان سے واقفی کا مسئلہ جو اصل مقصود ہے حل نہین ہوتا، ضرورت ہے کہ اس کے وسائل اختیار کئے جائین اور ان کو تعلیم یافتہ طبقون مین پھیلایا جائے،

بنگال کے مسلمانون کے لئے مختلف حیثیتون سے اردو سے واقفیت ضروری ہے، مذہب کے بعد اردو ہی ایک ایسا رشتہ ہے جو مختلف صوبون کے مسلمانون کو باہم مربوط اور ایک دوسرے سے قریب کر سکتا ہے، اس سے بیگانگی کا نتیجہ یہ ہے کہ بنگال مین مسلمانون کی بڑی آبادی کے باوجود دوسرے صوبون کے مسلمانون سے ان کا رابطہ بہت کم ہے، ان کے مقابلہ مین ان صوبون کے مسلمان جو اقلیت مین ہین، اور جن کی صوبائی زبانین بھی ہین محض اردو سے واقفیت کے بدولت ایک دوسرے سے زیادہ قریب ہین، ہندوستان تمام زبانون مین اسلامی علوم و مذہبیات کا سب سے بڑا ذخیرہ اردو ہی مین ہے جس سے بنگالی مسلمان بہت کم فائدہ اٹھا سکتے اس لئے قومی اور مذہبی دونون حیثیتون سے ان کے لئے اردو کی جانب توجہ کی ضرورت ہے،

ابھی حال مین بنگلہ کتابون کی ایک فہرست پر نظر پڑی، اس مین پارہ عم کا منظوم ترجمہ دیکھ کر حیرت ہوئی، کلام مجید کے جزو کا بھی منظوم ترجمہ احتیاط کے سخت خلاف ہے، کلام مجید کا ایجاز یہ ہے، کہ اس کے نثر کے ترجمہ مین بہت سی آیات کا پورا اور صحیح مفہوم قوسین مین تشریحی الفاظ بڑھائے بغیر ادا نہین ہوتا، اور نظم کی پابندیون کی وجہ سے منظوم ترجمہ مین تو اصل الفاظ مین کمی زیا اور حذف و اضافہ ناگزیر ہے جس سے تحریف کا دروازہ کھلتا ہے اس لئے خواہ نیت کچھ بھی ہو کلام مجید کے کسی جزو کا منظوم ترجمہ نازیبا ہے

مقالات

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی رحمۃ اللہ علیہ
کا
نظریۂ علم (Theory of Knowledge)

از مولینا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبۂ دینیات، جامعۂ عثمانیہ

مشہور اسلامی عارف حضرت شیخ محی الدین ابن عربیؒ جو عموماً مسلمانون مین شیخ اکبر کے نام سے یاد کئے جاتے ہین، خاکسار نے مجلس دائرۃ المعارف کی ایک علمی بزم مین جو غالباً ۱۹۳۳ء مین حیدرآباد ہی مین منعقد ہوئی تھی، شیخ ہی کے متعلق ایک مقالہ عربی زبان مین سنایا تھا، اس مقالہ مین حضرت شیخ کے علمی نقاطِ نظر پر ایک اجمالی تبصرہ کیا گیا تھا، جو طبع ہو کر شائع ہو چکا ہے، منجملہ اور باتون کے اُن کے متعلق مین نے یہ بھی لکھا تھا:-

"منجملہ ان امور کے جن کی طرف شیخ نے خاص توجہ مبذول کی ہے، جہان تک میرا خیال ہے، وہ انسانی فکر و نظر کی حد پرواز کا مسئلہ ہے"

مین نے اسی سلسلہ مین اس پر بھی تنبیہ کی تھی، کہ:-

"جس چیز کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، اور آدمی مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے، وہ یہ ہو کہ یورپ والے اور جو، ان یورپ والوں کے طفیلی یا ان کی ہان مین ہان ملانے والے ہین، ان سبھون نے اس مسئلہ کی ایجاد و تنقیح کا سہرا جرمنی کے حکیم کانٹ کے سر باندھا ہے، اپنی اور اپنی قوم کے لئے اس چیز کو یہ مایۂ فخر و فضل بنائے ہوئے ہین"

(مقالۃ الشیخ الاکبرؒ و طریقہ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن)

پھر عرض کیا گیا تھا کہ اس سلسلہ مین شیخ اکبر کے نظریات اور افکار پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہو سکتا ہے کہ حکیم کانٹ المانی سے وہ کم اہمیت نہین رکھتے،

مجھ سے خواہش کی گئی کہ آج کی مجلس مستشرقین کے شعبۂ اسلامیات مین شیخ اکبر کے اسی نظریہ کے متعلق بعض چیزین آپ کے سامنے پیش کرون، امتثالاً للامر اپنی محدود فہم کے مشورہ سے اس مجلس مین شیخ کے کلام سے جن اجزاء کا انتخاب مین نے کیا ہے، وہ آپ کے سامنے ہے۔ علماء قدیم کے حلقون مین اگرچہ شیخ اکبر کی ذات والاصفات کسی تعریف سے یقیناً مستغنی ہے، لیکن ظاہر ہے آپ کی اس مجلس مین قدیم عناصر کے ساتھ جدید اصطلاحات بھی ملے جلے ہین، ہو سکتا ہے، کہ ان مین بعض حضرات کے لئے یہ نام نیا ہو، اس لئے کام سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے، کہ ان کے نام کا تعارف کرا دیا جائے اور اب تو جدید کے ساتھ علمی

* گذشتہ سال سے پیوستہ سال انڈین اورینٹل کانفرنس کا سالانہ اجلاس حیدرآباد ہی مین جامعہ عثمانیہ کی زیر نگرانی منعقد ہوا تھا، خاکسار نے بھی اس کانفرنس مین ایک مختصر مقالہ پڑھا تھا، اسی کا مسودہ پڑا ہوا تھا، آج خیال آیا کہ معارف مین بھیج دون شاید کسی کے لئے سعید کو وریعۂ ذکری کا کام دے

کا قدیم طبقہ بھی جہاں تک میں جانتا ہوں شیخ اور ان کے کارناموں سے تقریباً نامانوس ہو چکا ہے، اس تعارف کی ضرورت اس وجہ سے اور زیادہ بڑھ جاتی ہے،

شیخ اکبر کا اجمالی تعارف | مرسیہ جو اندلس کے مشرقی علاقہ کا ایک مشہور شہر ہے، حضرت شیخ کی ولادت اس شہر میں ۵۶۰ھ میں ہوئی اندلس کا یہ وہ زمانہ ہے جب اسلامی دولت اس سرزمین میں اپنے بچے کھچے وقار و اقتدار کو بھی ختم کر رہی تھی، ملک میں عام طور سے طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا، تھوڑے تھوڑے دن کے بعد مختلف علاقوں میں مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہو ہو کر ختم ہوتی رہتی تھیں، بدامنی فتنہ و فساد کا ہر طرف بازار گرم تھا، چاہئے تو یہی کہ بے اطمینانی کے ایسے دور میں علم و کمال کو پھلنے پھولنے کا موقع نہ ملے، لیکن قدرت کا شاید یہ بھی قانون ہے کہ سحر کا چراغ دم توڑنے کے لئے جب آخری دفعہ بھڑکتا ہے، تو اس کی انتہائی روشنی میں بسا اوقات بعض عجیب و غریب ہستیاں نمایاں ہوئی ہیں،

ہندوستان میں شاہ ولی اللہ، مغرب میں ابن خلدون اس نظریہ کی بہترین مثالیں ہیں،

شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ملی موت کے اسی افق کا ایک عجیب و غریب منظر سمجھتا ہوں، یہ واقعہ ہے کہ جس جامعیت کو ہم شیخ اکبر میں پاتے ہیں، اسلامی علماء و صوفیا کی طویل الذیل تاریخ میں اس کی نظیر صرف مشکل ہی نہیں، بلکہ غالباً ناممکن ہے اس زمانہ کے مروجہ علوم خواہ عقلی ہوں یا نقلی، ادبی ہوں یا دینی، شیخ کی کتابیں بتا سکتی ہیں، کہ مشکل ہی سے کوئی ایسا علم یا فن اس زمانہ میں پایا جاتا ہوگا جس سے صرف معمولی لگاؤ نہیں، بلکہ تحقیقی رشتہ قائم نہ تھا،

شیخ کے تصنیفات کی تعداد | یوں تو ان کی کتابیں حد شمار سے باہر ہیں، لیکن حروب صلیبیہ کے بطل اعظم سلطان صلاح الدین انار اللہ برہانہ کے صاحبزادے جن کا ذکر شیخ نے خود اپنی کتاب فتوحات مکیہ کی جلد ۴ ص ۵۰۰ میں بایں الفاظ کیا ہے،

"بعض بادشاہوں کے پاس میری بات سنی جاتی تھی، اور یہ حلب کے بادشاہ ملک ظاہر غازی ہیں، خدا کی ان پر رحمت ہو، الناصر لدین اللہ سلطان صلاح الدین بن ایوب کے یہ صاحبزادے ہیں،" (ص ۵۰۰)

شیخ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ میں نے سلطان سے ایک سو اٹھارہ سفارشیں مختلف معاملات میں کیں، فقضاها کلها یعنی ہر بات منظور کی، آگے ایک طویل قصہ ہے، جس کے ذکر کی حاجت نہیں، مجھے کہنا یہ ہے کہ اسی سلطان غازی کو شیخ نے ایک علمی سند دی تھی، جسے مشہور لغوی عالم مجد الدین فیروزآبادی صاحب قاموس نے خود دیکھا تھا، صاحب قاموس کا بیان ہے کہ اپنی تصنیفات کی اجازت کے سلسلہ میں کتابوں کے نام درج کرتے ہوئے

عد منیفا و اربعمائة مصنف (مقدمہ فتوحات) — شیخ نے چار سو سے اوپر کتابیں شمار کی ہیں،

ان میں بعض ایسی کتابیں بھی ہیں مثلاً فتوحات مکیہ جو مصر و قسطنطنیہ میں متعدد بار طبع ہو چکی ہے چار جلدوں میں یہ کتاب ابتدا کی دو جلدیں تقریباً ہزار ہزار صفحات پر ختم ہوئی ہیں، اور آخری دو جلدیں سات سات سو صفحات پر مشتمل ہیں، گویا چار سو سے اوپر کتابوں میں سے صرف یہی ایک کتاب تین ساڑھے تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے، اسی سے ان کی دوسری کتابوں کا اندازہ کیجئے،

صاحب قاموس نے ان کی ایک تفسیر کا بھی ذکر ان الفاظ میں کیا ہے،

"جن میں ان کی کبیر تفسیر بھی ہے، جو سورہ کہف کی آیت وَعَلَّمْنَاهُ مِنْ لَدُنَّا عِلْمًا تک پہنچ کر رہ گئی کہ شیخ کی وفات ہوگئی، اس وجہ سے پوری نہ کرسکے، یہ ایک ایسی تفسیر ہے جس کا ہر حصہ اور اس کی ہر جلد ایک ایسے دریا کی شکل رکھتی ہے جس کا کنارہ نہ ہو،" (صفہ ۷)

اور غالبًا یہی تفسیر شیخ کی ہو جس کا ذکر البطل الغازی المجاہد صاحب السیف والقلم، الامیر عبد القادر الجزائریؒ نے اپنی کتاب "المواقف" مین بایں الفاظ کیا ہے :-

"معلوم ہو کہ ایک تفسیر شیخ محی الدین بن عربی کی پائی گئی ہے جس کا نام کتاب الجمع والتفصیل فی اسرار التنزیل ہے، اور مقدار اس کتاب کی (۶۶۰) چھ سو ساٹھ جلدین ہین" (مواقف ص ۲۲۲)

الجزائری نے یہ بھی لکھا ہو کہ مصر مین سورۂ کہف تک اس تفسیر کے اجزاء ملے ہین، "واللہ اعلم بالصواب" جس شخص کے لکھنے کا یہ حال ہو، کہ فتوحاتِ مکیہ جب لکھ رہے تھے تو

"جہان کہین ہوتے (غالبًا سفر وحضر ہر جگہ) روزانہ مین کراسہ (جزء) لکھا لیا کرتے تھے"

اور اس کا اعتراف تو انھون نے خود کیا ہے، کہ

"اپنی تصنیفون مین سے کسی تصنیف کا مین نے مسودہ نہین لکھا یعنی بس جو مسودہ ہوتا تھا، وہی مبیضہ بھی تھا" (فتوحات)

جس کے یہی معنی ہوئے کہ ان کی کتابین عمومًا بر داشتہ قلم لکھی گئی ہین، اور اس کا پتہ خود ان کی کتابون سے بھی کچھ چلتا ہے جس کی تفصیل کا یہ مقام نہین ہے،

بہرحال ان کی اسی ایک کتاب فتوحاتِ مکیہ سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اپنے زمانہ کے کسی علم مین ان کا پایہ معمولی نہ تھا، اگرچہ ظاہر ہے کہ ان پر اصلی مذاق جس علم کا غالب تھا، وہ تصوف ہی کا فن ہے، اور دنیا مین عام طور پر ان کی شہرت ایک صوفی عالم ہی کی حیثیت سے ہے بھی، شیخ کے ان سارے علمی اور قلمی مجاہدات کے پیچھے کیا چیز عمل کر رہی تھی، مین نے اس کا کچھ ذکر اپنے اس عربی مقالہ مین بھی کیا ہے، ان کے دل مین جس چیز کی آگ لگی ہوئی تھی، اور اسی سوزش کو ان عجیب وغریب کتابون کا مین سبب قرار دیتا ہون، کچھ اس کا اندازہ ان کے منظوم خط سے بھی ہوتا ہے، جو روم (ایشیائے کوچک) کے سلطان عز الدین کیکاؤس کے ایک مکتوب کے جواب مین اونھون نے لکھا ہے، شیخ نے اپنے اس خط کو فتوحات ج ۴ کے ص ۶۹۲ مطبوعہ بولاق مصر مین درج فرمایا ہے خط منظوم ہے جس کے چند اشعار یہ ہین :-

کتبت کتابی والدموع تسیل — وما لی الی ما ارتضیه سبیل

مین اپنا خط لکھ رہا ہون اور آنسو بہ رہے ہین — اور میرے بس مین نہین ہو کہ ان کو راضی کرون

ارید اری دین النبی محمدا — یقاد ودین المبطلین یزول

چاہتا ہون مین کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کو دیکھون کہ وہ بلند کیا جائے، اور جھوٹون کا دین مٹ جائے

فلم ارالا الزور یعلو واھلہ — یعزون والدین القویم ذلیل

مگر بجز بناوٹی سخن سازیون کے اور اس کے کاروبار کرنے والون کے سوا کسی کو معزز ہوتے ہوئے نہین پا رہا ہون

فیا عز دین اللہ سمعا لناصح — شفیقا نصاح الملوک قلیل

اے اللہ کی دین کی عزت ایک ہی خواہ کی نصیحت سُن، جو تجھ پر مہربان ہے یاد رکھ کہ بادشاہون کو نصیحت کرنیوالے کم ہین

وحاذر ربتا ئید الالہ بطانۃ — یشیر بامر ما علیہ دلیل

اور بچو اللہ کی مدد سے ایسون کو راز دار بنانے سے، جو اشارے ایسی باتون کی طرف کرتا ہو جس کی دلیل نہ ہو،

ان اشعار سے شیخ کے باطنی محرکات کا کچھ اندازہ ہوتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ ان کے مولد یعنی اندلس پر کفر کا تسلط دن بدن

بڑھتا جا رہا تھا، اور جیسا کہ ان کا خیال تھا جس کا ذکر مختلف مقامات مین انھون نے کیا بھی ہے یعنی ان ساری تباہیون کی ذمہ داری اسلام کے سلاطین اور علماء کے سر عائد ہوتی ہے، مختلف مضامین لکھتے لکھتے کہین ان کے قلم سے ان پوشیدہ جذبات کا اظہار ہو جاتا ہو، خود اپنے وطن اندلس کو خیرباد کہہ کے جب وہ مشرقی ممالک کی طرف چلے آئے، اور اس طرح آئے جیسا کہ ان کے سوانح نگار نے لکھا ہے :-

"اپنے وطن مرسیہ سے شیخ ۵۶۸ھ میں اشبیلیہ روانہ ہوئے، اور ۵۹۸ھ تک وہین رہے، پھر اس کے بعد مشرق کی طرف روانہ ہوئے، حج کے ارادے سے جس کے بعد پھر اندلس واپس نہ ہوئے"

اندلس سے روانہ ہو کر جب جبل الطارق کی آبنائے کے پاس آئے ہین تو سبتہ نامی شہر مین ان کی ملاقات ایک درویش سے ہوئی، اس ملاقات مین شیخ کا ان سے جو مکالمہ ہوا ہے، اس کا ذکر ان الفاظ مین فرمایا ہو:-

"سمندر کے آبنائے کے پاس سبتہ میں بعض صالحین کے یہان حاضر ہوا، مجھ مین اور حکومت مین بعض ایسی باتین ہوئی تھین جن کا نتیجہ قلب کی تنگی تھی، اور قدر و منزلت جس سے گر تی تھی، ان بزرگ کو اس کی خبر ملی تھی، مجھ پر ان کی جب نظر پڑی، تو بولے کہ بھائی ایسا آدمی ذلیل ہو جاتا ہے جس کی اعانت کوئی ظالم نہ کرے، مین نے عرض کیا کہ جی ہان ایسا بادشاہ بھی گمراہ ہو جاتا ہے جس کی رہنمائی کوئی عالم نہ کرے، بزرگ نے فرمایا کہ نرمی نرمی (یعنی ذرا نرمی اختیار کرنا چاہئے) مین نے عرض کیا کہ جی ہان جب تک اصل پونجی پر آنچ نہ آئے، یعنی دین محفوظ ہو، بزرگ نے یہ سن کر فرمایا کہ سچ کہتے ہو، اور خاموش ہو گئے، (ج ۳ ص ۱۰)

جہان تک میرا خیال ہے شیخ کی ان ہی تلخ نوائیون اور اندرونی بےچینیون نے ان کو اندلس چھوڑنے پر مجبور کیا، اور مشرق کو اونھون نے اپنا وطن بنا لیا، کیونکہ یہان ان کو بعض ایسے سلاطین مل گئے، جو ان کی باتون پر کان دھرتے تھے، شیخ ہمیشہ ان سلاطین کو اس طرف متوجہ کراتے تھے، کہ علماء سوء کی اصلاح کرو، دین ان ہی کی وجہ سے برباد ہو رہا ہے، فتوحات ہی مین ایک جگہ اونھون نے علماء سوء کے متعلق ایک واقعہ درج کیا ہے، اس واقعہ سے اس کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ سلاطین سے ان کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی، فتوحات ج ۴ ص ۹۱ مین ارقام فرماتے ہین :-

"ذہبی صلاح الدین ایوبی کے بیٹے ملک الظاہر غازی نے ایک دن مجھے خبر دی، یعنی مجھ سے اور ان سے بعض معاملات کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی، اس وقت اونھون نے مجھے بتایا کہ میرے ملک اور میری حکومت مین جو قابل اعتراض باتین ہین، اور جو مظالم ہو رہے ہیں ان کے متعلق آپ مجھے منع فرماتے ہین، اور یہ واقعہ ہے کہ جو کچھ اس باب مین آپ کا خیال ہے وہی میرا بھی ہے، کہ یقیناً یہ ساری باتین غلط ہین لیکن سیدی! خدا کی قسم یہ جتنی بری باتین ہین، ان سب کے متعلق فقیہ کا فتویٰ موجود ہے، یعنی ان کی صحت وجواز کا فقیہ (مولوی) نے فتویٰ دے رکھا ہے، ان کے دستخط میرے پاس موجود ہین، تو خدا کی ان ہی پر لعنت ہو،

شیخ نے الملک الظاہر کے اس بیان کو نقل کر کے پھر اس نیک دل بادشاہ کا یہ بیان نقل کیا ہے :-

"خود ایک مولوی جو فلان صاحب ہین، انھون نے مجھے یہ فتویٰ دیا ہے، سلطان نے اس مولوی کی شخصیت بھی متعین کی، یہ اس شہر کے بڑے نامی گرامی فاضل ہین، دین اور مذہب مین سختی ان کا بھی خاص امتیاز ہے، ان مولوی صاحب نے (بادشاہ نے کہا کہ) مجھے یہ بتایا ہے کہ مجھ پر خاص رمضان کا روزہ فرض نہین ہے، بلکہ سال کے کسی

ایک مہینہ میں جس میں بھی چاہوں، روزہ رکھ سکتا ہوں (غالباً مولوی کی تاویل یہ ہو کہ بادشاہوں کو خصوصاً اس زمانہ میں جنگی مہموں میں مشغول رہنا پڑتا تھا، اس وجہ سے آج یہاں کل وہاں مارے مارے پھرتے تھے، یہ سفر کی حالت ہے، اور مسافر روزوں کو رمضان سے موخر کر سکتا ہے" (واللہ اعلم)

شیخ فرماتے ہیں کہ اس فقیہ کے اس فتویٰ کا ذکر کر کے الملک الظاہر نے کہا:-

"میں نے دل ہی دل میں اس مولوی پر لعنت کی، اور اس پر اس کو ظاہر نہ کیا، مولوی کا بادشاہ نے نام بھی بتایا، خدا ان لوگوں پر رحم کرے"

یہی بے دینیاں تھیں، جو عوام ہی نہیں بلکہ خواص امت میں انھیں محسوس ہو رہی تھیں، ملک کیکاؤس کے نام ایک طویل خط بھی شیخ نے لکھا تھا جس کو بجنسہ انھوں نے فتوحات میں نقل کر دیا ہے، شروع میں اس کے لکھتے ہیں،

"۶۰۷ھ میں یونان کے شمالی حصہ کا بادشاہ جس کا نام الغالب لامر اللہ کیکاؤس ہے، اس نے مجھے خط لکھا، (یونان کے شمالی حصہ سے ایشیائے کوچک کا حصہ مراد ہے، جہاں آج ترکوں کا پایۂ تخت ہے اسی کو روم بھی کہتے تھے، مولانا روم اسی علاقہ کی طرف منسوب ہیں")

خط بہت طویل ہے، فتوحات کے تقریباً ڈیڑھ صفحہ میں آیا ہے اس خط کے آخر میں بھی چند اشعار ہیں جن میں سے بعض شعر یہ ہیں، یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ملک کیکاؤس نے اپنا سلطانی نام عزالدین رکھا تھا،

اذا انت اعززت الهدی وتبعته   فانت لهذا الدین عزٌّ کما تدعی

اگر دینی ہدایت کو تم سے عزت نصیب ہو، اور اسکی خود بھی تم پیروی کرو تو بیشک تم دین کی عزت ہو جیسا کہ تم پکارے جاتے ہو

وان انت لم تحفل به واهنته   فانت تذل الدین تخفضه وضعا

اور اگر تم نے دین کو نہیں سمیٹا اور اسے ذلیل کیا   تو پھر دین کے تم خوار کرنے والے، اور اسے تم نے پست کر دیا

فلا تاخذ الالقاب زوراً فانه   لتسئل عنها یوم یجمعکم جمعا

پس جھوٹ موٹ کے القاب نہ اختیار کیا کرو کیونکہ جس دن تم لوگ (قیامت میں) جمع کئے جاؤگے، اس کے متعلق پوچھے جاؤگے

ان اشعار میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہ یہ خطاب تم پر اسی وقت پھبےگا، جب دین کے اعزاز کا کام کروگے اور

وان قال دین الله ضعت بملکه   ذلیلا واهلی فی میادینه صرعی

اللہ کے دین نے اگر کہا کہ میں اس شخص کی حکومت میں ذلیل تھا، اور دیندار لوگ اس ملک میں پچھڑے پڑے تھے، تو قیامت کے دن تمہارا کیا جواب ہوگا،

اور آخر میں اسی بادشاہ کے کسی نائب السلطنت کی طرف ایما فرماتے ہوئے تنبیہ کرتے ہیں :-

لکم نائب فی الامر اصبح ملحداً   واضحی لاهل الدین یقطعهم قطعا

تمہاری حکومت میں تمہارا جو نائب ہے وہ بے دین ہو گیا ہے، ارباب دین کو اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر کے رکھ دیا ہے

پھر اسی بادشاہ کا جو دوسرا خطاب الغالب لامر اللہ ہے، اس سے نفع اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں :-

فمالک لن تغلبه واسمک غالباً   ومالک لم تعزله اذا اثر النقعا

آخر تم اس پر غالب کیوں نہیں ہوتے حالانکہ نام تو تمہارا غالب ہے اس کو معزول کیوں نہیں کرتے وہ گرد تو اڑا چکا ہے

الغرض یہ اور اسی قسم کی مختلف شہادتون سے جن کا ذکر اس مختصر مقالہ مین موجب طوالت ہوگا، مین اس نتیجہ پر پہنچا ہون کہ شیخ کا عہد جس مین اسلام کے مغربی ممالک پر یورپ سے اور مشرقی ممالک پر تاتار سے کفر کے بادل امنڈ امنڈ کر آگ برسا رہے تھے اور اسلام کی جو وقعت قلوب مین تھی، دن بدن اس کی دیوار کمزور ہوتی چلی جا رہی تھی، نہ صرف عوام بلکہ مسلمانون کے خواص جن مین علماء وسلاطین، و امراء سب ہی شریک تھے، اپنی اپنی ایمانی قوتون کو کھوتے چلے جا رہے تھے، قرآن اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) سے ان کا تعلق کمزور ہوتا چلا جاتا تھا، اور اسی کے یہ نتائج تھے، جن کا ذکر شیخ نے اپنے مذکورہ بالا بیانات مین فرمایا ہے،

حضرت شیخ نے، جہان تک میرے مطالعہ کا تعلق ہے، یہ معلوم ہوتا ہے، کہ فکر و غور کے بعد ان امراض کا سراغ لگا لیا تھا جو مسلمانون کو دین سے دور کرنے کے اسباب تھے، اور بجائے جدل یا مولویون کے عام مناظرانہ عقیم طریقون کے انھون نے ان امراض کے علاج کے متعلق کلی تدبیرین سوچ کر اختیار فرمائی تھین، جیسا کہ مین عرض کیا، ان کی عام کتابون کی تعداد تو چار سو سے بھی متجاوز اور تفسیر کی چھ سو ساٹھ جلدون کو اگر ان کے ساتھ ملا لیا جائے، تو ظاہر ہے کہ یہ تعداد دونی سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے مگر تفسیر پر میری نظر نہین پڑی، ان کے سوا سچی بات تو یہ ہے کہ بجز ایک دو کے عموماً ان کی کتابون کے مضامین ایک ہی قسم کے ہین، اجمالاً و تفصیلاً مختلف پیرایون مین وہ انہی مجوزہ علاجی تدبیرون کو دہرا دہرا کر بیان فرماتے ہین،

منجملہ ان کلی امور کے جن پر شیخ نے اپنی کتابون مین سیر حاصل بحثین فرمائی ہین، علم کا مسئلہ بھی ہے وہی جس کی تعبیر موجودہ اصطلاح مین تھیوری آف نالج (Theory of Knowledge) کے الفاظ سے کرتے ہین، مطلب یہ ہے کہ دین سے بغاوت کا وہ حصہ جو علم کے جھوٹے ادعا پر مبنی ہے، شیخ نے چاہا ہے کہ لوگون کو یہ بتایا جائے کہ خود اس "علم" اور "دانش" کی حقیقت کیا ہے، ہم یہ جانتے ہین، وہ جانتے ہین، اور اپنے اسی جاننے کی بنیاد پر نہ سوچنے والون کے قلوب مین دین کا جو احتقار پیدا ہوتا ہے، شیخ نے سمجھانا چاہا ہے کہ تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا، کہ خود یہ جاننا کیا چیز ہے، اور تمھارے اس "جاننے" کی رسائی کا آخری نقطہ کیا ہے، یہ واقعہ ہے کہ آدمی پر جب اپنی "دانش" کی اصلی حقیقت کھل جاتی ہے، تو وہ سارا نشہ کرکرا اور پھٹ کر ہوا ہو جاتا ہے، جس کے شکار عموماً وہی لوگ ہو جاتے ہین، جو تھوڑا بہت لکھنے پڑھنے کے بعد ہر چیز کی تنقید اپنے علم کی روشنی مین کرنا چاہتے ہین، لیکن علم و جہل کے سلسلہ مین آدمی کا جو صحیح مقام ہے، جب وہ اس پر واضح ہو جاتا ہے، تب سمجھ مین آتا ہے کہ

ع معلوم شد کہ ہیچ معلوم نہ شد

اس مسئلہ کو شیخ نے فتوحات مکیہ، فصوص الحکم وغیرہ میں مختلف اسالیب مین ادا کیا ہے، سب کو اگر جمع کیا جائے اور انشاء اللہ جب وقت آئے گا تو وہ جمع کئے جائین گے، تو مین شاید مبالغہ نہین کر رہا ہون، کہ محض اس ایک مسئلہ کے متعلق ان کے خیالات و نظریات ہزار ڈیڑھ ہزار صفحات کی گنجایش سے کم کے متقاضی نہ ہون گے خصوصاً شیخ کا جو ایک خاص طریقہ ہے، یعنی وہ اپنے مسودہ پر نظر ثانی نہین کرتے، اور قلم اٹھا کر لکھتے چلے جاتے ہین، اس لئے کہین کہین اس کا شبہہ بھی ہوتا ہے، کہ ان کے کلام مین تضاد ہے، کامل بحث کرنے والے کو ضرورت ہوگی، کہ سلسلہ کے ساتھ ان کے کلام کے مختلف اجزاء کو ایک خاص ترتیب کی شکل مین سمیٹے، جہان تک میرا تجربہ ہے اس تدبیر سے ان کے کلام مین بظاہر تناقض جو محسوس ہوتا ہے، عموماً وہ اٹھ جاتا ہے، ماسوا اس کے ایک بات یہ بھی ہے کہ شیخ بھی بہرحال آدمی ہین، اور آدمی کے خیالات مین کچھ رد و بدل اتار چڑھاؤ تو ہوتا ہی رہتا ہے، ہو سکتا ہے، کہ اپنی کسی کتاب مین انھون نے ایک خیال ظاہر کیا ہو، لیکن بعد کو ان کا خیال بدل گیا ہو، فتوحات مین اپنے خیال کی اس تبدیلی کا ایک دلچسپ قصہ خود ہی انھون نے نقل فرمایا ہے، ان کے

اس خیالی انقلاب کی نوعیت پر چونکہ روشنی پڑتی ہے، اس لئے تذکرہ کرتا ہون فرماتے ہین :-

"مین ان لوگون مین تھا جو عورتون کو سخت ناپسند کرتے تھے، اور پھر اسی اصول پر اٹھارہ سال تک قائم رہا، اس طریقہ (یعنی طریقۂ صوفیہ) مین جب ابتداءً داخل ہوا تو میرا بھی یہی خیال تھا"

(فتوحات ج ۴ ص ۱۰۴ مطبوعہ بولاق مصر)

گویا اٹھارہ سال تک ایک خاص خیال کا ان پر تسلط رہا، اس کے بعد ایک طویل بحث کے بعد اپنے اس خیال مین تبدیلی کے اسباب و وجوہ کا تذکرہ کرنے کے بعد ارقام فرماتے ہین،

"مگر اب بحمد اللہ عورتون کی یہ نفرت مجھ سے نکل گئی ہے، اور خدا نے عورتون کو میرے لئے محبوب بنا دیا ہے، اور اب مین ان لوگون مین ہون، جو عورتون پر سب سے زیادہ مہربان ہین، اور ان کے حقوق کی سب سے زیادہ نگہداشت کرتے ہین، مین اب اس معاملہ مین بصیرت پر ہون، یہ بات خدا کی طرف سے ہے، یعنی اُسی نے عورتون کو میرے لئے محبوب بنا دیا ہے، یہ بات کوئی طبیعت کا اقتضا نہین ہے" (ج ۴ صفحہ ۱۰۴)

جہان تک میرا خیال ہے شیخ جب تک یورپ (اندلس) مین رہے اور اندلس کے صوفیہ پر قرب مکانی کی وجہ سے کچھ نہ کچھ عیسائی رہبان اور تارک الدنیا فقراء کا اثر پڑتا ہی ہوگا، اور ظاہر ہے کہ عیسائی مذہب مین عورت ہی پر ان سارے مصائب کی ذمہ داری عائد کی گئی ہے، جن مین آدم اور اولاد آدم اس خاکدان ارضی مین مبتلا ہے، ارباب کلیسا کا فتویٰ ہی یہ تھا، کہ عورت صرف گندگی اور نجاست ہے، وہ شیطان ہے، اس مین روح نہین ہے، بلکہ باوجود ان حالات کے جن کا مظاہرہ یورپ اس وقت نسائیت کے مسئلہ مین کر رہا ہے، پھر بھی مذہبی طور پر محض یورپ کے عام باشندون ہی پر نہین بلکہ جن بیچارون کے نفس نے شعوری یا غیر شعوری طور پر مغربی اثرات کو اپنے اندر جذب کیا، یا چرا لیا ہے، دنیا مین عورتون کے ساتھ وہ خواہ کسی قسم کا بھی تعلق رکھتے ہون، لیکن دیکھا یہی جا رہا ہے، کہ آنی والی آخرت کی زندگی مین عورتون کا تخیل ان کے لئے ناقابل برداشت بنا ہوا ہے، اور یہی وجہ ہے، کہ قرآنی جنت کے سلسلے مین دوسری چیزون کے ساتھ جون ہی عورتون کا ذکر آتا ہے، ان کی پیشانیون پر شکن پڑ جاتی ہے، بجز اس نفسیاتی سبب کے کہ عیسائی ذہنیت جنت مین عورت کے تخیل کو برداشت نہین کر سکتی، گویا عورت کے ذکر کے ساتھ ہی خدا کی پاک بہشت ان کی نگاہون مین حیوانی جنت کی قالب مین ڈھل جاتی ہے، سوچنے والون نے کبھی اس پر بھی غور کیا، کہ اس کی وجہ اور کیا ہو سکتی ہے، کیا جنت اور دوزخ کے مسائل بھی سائنس اور کیمسٹری کے حدود مین آتے ہین، یا آ سکتے ہین،

خیر یہ تو ایک ذیلی مسئلہ ہے مین یہ کہہ رہا تھا کہ شیخ کے خیالات مین تبدیلیان بھی ہوئی ہین، اس سے بڑھ کر اس کا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے، کہ اٹھارہ سال تک ایک خیال پر شیخ جمے رہے، لیکن مشرق کی زندگی نے ان پر ثابت کیا، کہ جنت تو عورتون ہی کے قدمون کے نیچے ہے، پھر ان کی رائے اس باب مین بدل گئی، شیخ نے اس مسئلہ پر اپنی کتاب کے مختلف مقامات پر بڑی دلچسپ بحثین فرمائی ہین، جن کے ذکر کا یہ موقع نہین ہے،

اسی کے ساتھ شیخ کے متعلق ایک اور بات کا ذکر بھی ضروری خیال کرتا ہون، ان کا ایک خاص طرز یہ ہے کہ اپنے مختلف مضامین کا مخاطب انھون نے مختلف طبقے کے لوگون کو قرار دیا ہے، ان کا نظریہ بھی یہ ہے جیسا کہ حدیثون مین بھی آیا ہے کہ کلموا الناس علی قدر عقولھم ایک یہ وجہ بھی ہے جو ان کے کلام سے بعض دفعہ لوگون مین الجھن پیدا ہوتے لگی ہے، سو

ہوتا ہے کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتے ہین، شیخ نے ایک مسئلہ کا ذکر کرتے ہوئے فتوحات ہی مین لکھا ہے کہ مکہ معظمہ کے مفتی جن کا نام انھون نے ابوعبداللہ محمد بن ابی الصیف الیمنی نزیل مکہ بتایا ہے، ان مفتی صاحب کے سامنے ان کی کتاب جس کا نام "مشاہد قدسیہ" ہے، اس کی ایک ایسی عبارت پیش کی گئی، جو اپنے عنوان اور تعبیر مین کچھ وحشت رکھتی تھی، شیخ کو مفتی نے بلاکر دریافت کیا آپ نے اس کی ایک لطیف توجیہ کی لکھتے ہین، کہ سننے کے ساتھ،

"وہ بڑا خوش اور مسرور ہوا، خدا اس پر رحم کرے"

مفتی کو انھون نے گو مطمئن فرما دیا، لیکن اس کے بعد لکھتے ہین، کہ اس عبارت کا ایک اور دقیق پہلو بھی تھا، مین نے اس پہلو کا ذکر اس لئے اس مجلس مین نہین کیا، کہ وہ نہ اس کو برداشت کر سکتا تھا، اور نہ اس کا انکار کر سکتا تھا"

اس لئے اندیشہ تھا کہ جھنجھلا کر خواہ مخواہ بگڑ نہ بیٹھے، شیخ نے اس کے بعد ارقام فرمایا ہے، کہ

"اس کے پاس نہ تو قوی ایمان ہی تھا، اور نہ علم اور سلامت نظر تھی، وہ حیران ہو کر رہ جاتا اسی لئے مین نے اس کے سامنے ایسی بات کی جو اسکے عقلی مزاج کے مطابق تھی"

بہرحال اگر ان اجمالی نکات کو بھی پیش نظر رکھ لیا جائے، تو شیخ اکبر کے کلام مین اس قسم کی پیچیدگیان جو محسوس ہوتی ہیں وہ انشاء اللہ بآسانی زائل ہو سکتی ہین، اور سچی بات تو یہی ہے کہ ان کے کلام کے سمجھنے اور اس سے استفادہ کے لئے جیسا کہ شیخ نے خود بھی لکھا ہے، ایمان قوی اور نظر سلیم کے ساتھ ضرورت ہو کہ علم مین ذرا وسعت ہو، محدود معلومات والے تنگ نظر لوگون کے لئے بسا اوقات ان کی باتین نقصان رسان ہو جاتی ہین، لیکن یہ ان کے کلام کا نہین پڑھنے والون کا نقص ہو،

اب ان تمہیدی باتون کے بعد جو باوجود ارادۂ اختصار کے کافی طویل ہو گئین، اصل مسئلہ کا ذکر حتی الوسع اجمال کو پیش نظر رکھکر کرنا چاہتا ہون کہ اجمال سے زیادہ کا یہ موقع بھی نہین ہے، خدا کرے میری کتاب وہ مکمل ہو جائے، جسے شیخ کے متعلق لکھنا چاہتا ہون، کہ تفصیل و بسط کا صحیح مقام وہی کتاب ہو سکتی ہے، واللہ یوفق لما یحب و یرضیٰ، (باقی)

خط و کتابت کے لئے

ضروری اطلاع

معارف کے مضامین اور علمی استفسارات اور ان کے متعلق جملہ خط و کتابت شخصی نام کے بجائے صرف اڈیٹر معارف کے پتہ سے، اور معارف اور دار المصنفین کے انتظامات اور فرمائشات کے متعلق منیجر صاحب دار المصنفین کے نام سے کی جائے، ان تمام امور کے متعلق میرے نام خط لکھنے سے تعمیل مین دقت ہوتی ہے، امید ہے کہ احباب مجھے زحمت سے بچانے کے لئے اس کا خاص طور سے خیال فرمائین گے

سید سلیمان ندوی

واگھ بھٹ یا شفائے محمودی

از

مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی، ریسرچ اسکالر، گجرات ورنیکلر سوسائٹی احمد آباد

ان دنون ایک نئی کتاب ہمارے کتب خانہ (گجرات ورنیکلر سوسائٹی احمد آباد) مین داخل ہوئی ہے، اوس کا نام شفائے محمودی ہو زبان فارسی، خط واضح، نستعلیق ½ ۸، انچ طویل، اور پانچ انچ عریض، کل اوراق پانچ سو، کاغذ دبیز غالباً پٹنی ہے، کتاب سنسکرت مین تھی، اس کے مصنف کا نام "واگھ بھٹ" ہے، ہندوستان مین واگھ بھٹ متعدد ہوئے ہین لیکن سب سے زیادہ شہرت اسی حکیم (وید) کی ہے، اس کا اصلی وطن سندھ ہے، اس کے باپ کا نام "سینھ گپتا"، اور دادا کا واگھ بھٹ تھا، یہ برہمن خاندان علم وفضل کے باعث مشہور تھا، اور طب مین ید طولیٰ رکھتا تھا، اس کی شہرت کے باعث اس کی طرف بہت واقعات منسوب ہین ہندوستان مین طب کی آٹھ شاخین تھین، ہر طبیب ایک شاخ کا ماہر ہوتا تھا، اور صرف اسی کا علاج کرتا تھا، اور اپنے تلامذہ کو اسی کی تعلیم دیتا تھا، واگھ بھٹ نے اس مسئلہ پر غور وخوض کے بعد یہ رائے قائم کی، کہ ان آٹھون کو ایک ہی جگہ جمع کرکے یکجا تعلیم دی جائے، تو ایک بید (طبیب) مجمع اوصاف ہوگا، چنانچہ اس نے اسی مقصد کو مدنظر رکھ کر تعلیم دینی شروع کردی، اور کئی کتابین لکھین، یہ ماہر طبیب کس سنہ مین تھا تاریخ سے اس کا کچھ پتہ نہین چلتا، اس کے خاندانی حالات بھی لوگون کو صرف اسی قدر معلوم ہین جس قدر اوس نے اپنی کتاب مین تحریر کردئے چینی سیاح ہونگ شیانگ نے ایک مقام پر ذکر کیا ہے، کہ طب کی آٹھ شاخین تھین جس کی الگ الگ تعلیم ہوتی تھی، ابھی ایک آدمی نے ان سب کو جمع کردیا ہے، اور اب ہندوستانی بید (طبیب) اسی کی تعلیم دیتے ہین، اور اپنے تجربات اسی سے بڑھاتے ہین، اور چونکہ اس سے پہلے اس قسم کی کوئی کتاب جو آٹھون قسمون کا مجموعہ ہو نہین تھی، اس لئے سمجھنا چاہئے کہ چینی سیاح کا مطلب اسی واگھ بھٹ کی کتاب سے ہے، اور اسی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس سیاح سے کچھ ہی پہلے یہ ماہر طبیب گذرا ہے، اسی لئے عام طور پر یہ مان لیا گیا ہے، کہ وہ چھٹی یا ساتوین صدی عیسوی کا ہے[۱]،

واگھ بھٹ کی مشہور ترین تصنیف صرف دو ہین (۱) اشٹ انگ سنگرہ (۲) اشٹ انگ ردی، شفاے محمودی اسی آخر الذکر کتاب کا ترجمہ ہے، کتاب کے مترجم کا نام علی محمد بن اسماعیل اساولی اصیلی ہے، چنانچہ دیباچہ مین ہے:-

"می گوید مترجم این طب مقبول ومبین غوامض این کتاب ماحول ومعمول، بندۂ دعا گوے بارگاہ علی محمد بن اسماعیل اساولی اصیلی اصلح اللہ شانہ ....."

شہر احمد آباد کی تعمیر سے پہلے "اساول" متوسط درجہ کا شہر تھا، بیرونی نے لکھا ہے، کہ تجارت کا مرکز ہے، کھنبائت سے پٹن (پایۂ تخت گجرات) کو جو تجارتی قافلہ جاتا ہے، وہ یہان سے ہو کر جاتا ہے، یہ درحقیقت بھیلون کا پایتخت تھا، سلطان احمد شاہ کے ابتدائی عہد ۸۱۳ھ مین یہان آسا بھیل راجہ تھا، جو پنی ترک تازیون سے لوگون کو پریشان رکھتا، اس لئے احمد شاہ نے اس سے یہ مقام چھین کر اسی سے متصل ایک نیا شہر احمد آباد کے نام سے آباد کیا، ابتداء مین دونون شہر علاحدہ رہے، لیکن

[۱] ہسٹری آف انڈین میڈیسن مؤلفہ ڈاکٹر ہرنل،

آخر میں اساول احمد آباد کا ایک محلہ ہو کر گم نام ہو گیا، اور آج کل صرف ایک حصہ "آسا بھیل کا ٹیکرہ" کے نام سے مشہور ہے، جو قدیم روایات کی یاد تازہ کرتا ہے، اس مقام کے باشندے اپنے کو آساولی کہتے تھے، مترجم کتاب علی محمد اسی جگہ کے رہنے والے تھے، مترجم موصوف کے نام کا آخری جز اصیلی ہے، مرأۃ احمدی میں ہے کہ :-

د ضابطۂ ارباب التحاویل آنکہ تحویل دار باید کہ بندہائے بادشاہی باشد و مشرف اصیل ۔۔۔۔۔ الخ

یعنی تحویل داری کا دستور اس طرح تھا کہ تحویل دار شاہی غلام ہو تو محرر اصیل و بالعکس، اس بنا پر جو لوگ سرکاری محکمۂ تحویل میں ہوتے، تو امتیاز کے لئے اپنے کو اصیلی کہتے تھے، غالباً ان کا خاندان اسی نام سے مشہور تھا، اسی لئے اپنے کو اصیلی لکھا ہے، علی محمد صاحب حکیم بھی تھے، چنانچہ دیباچہ میں لکھتے ہیں :-

"کہ این بندۂ دعاگو کہ در محل تلمیذ درین علم حکمت وطب قیام داد و الخ"

اس کتاب کے ترجمہ کا کس طرح اتفاق ہوا، اس کے متعلق لکھا ہے کہ بعد فتح جنگ "جگت دوار کا" مصطفےٰ آباد (جونا گڑھ) میں سلطان محمود مقیم تھا، اس نے حکم دیا کہ واگھ بھٹ کے تجربات کا جو اطبائے ہند کے نزدیک معتبر اور مجرب ہیں، ہندی (سنسکرت) سے پارسی میں ترجمہ کر ڈالو تاکہ لوگ عام طور سے اس سے مستفید ہوں اور غیروں کے محتاج نہ رہیں،

بندہ بعد ادائے شرط خدمانہ اس کام میں مصروف ہو گیا، اور اس کتاب کا نام شفائے محمودی رکھا الخ لیکن ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ مترجم نے خود مختلف مقامات پر اس کے مختلف نام لکھے ہیں، دیباچہ میں اس نے شفائے محمودی لکھا ہے، اصل کتاب (واگھ بھٹ) کی ابتدا کرتے ہوئے تحریر کیا ہے "آغاز طب محمود شاہی" پھر دفتر اول کے اختتام پر اس کا نام کتاب طب شفائے محمود شاہی بتایا ہے، لیکن عام طور سے یہ شفائے محمودی ہی کے نام سے مشہور ہے،

"جگت دوار کا" کاٹھیاوار کے آخری نقطہ پر راس کی شکل میں واقع ہے جس کو بر و بحر دونوں سے تعلق ہے، یہ ہندوؤں کے قدیم پاک اور قابل زیارت شہروں میں سے ہے، یہاں کا راجہ خود مختار ہوتا تھا، گجراتی حاکموں کی سیادت برائے نام تسلیم کرتا تھا، سلطان محمود اعظم کے وقت میں چونکہ بحری تجارت بہت ترقی کر گئی تھی، اس لئے جہازوں کی آمد و رفت بکثرت رہتی، یہ راجہ موقع پاکر ان کو لوٹ لیتا، چنانچہ مولانا محمود سمرقندی دکن سے اپنے وطن کو جا رہے تھے، کہ ان کا جہاز لٹ گیا، ان کی عورتیں گرفتار کر لی گئیں، یہ پیدل دو بچوں کو لے کر جونہ گڑھ پہونچے، اور دربار شاہی میں فریاد کی، سلطان محمود نے راجہ کی اس حرکت سے ناخوش ہو کر تری اور خشکی دونوں طرف سے حملہ آور ہو کر اس شہر کو فتح کر لیا، یہ واقعہ ۸۷۸ھ کا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اس کا ترجمہ ۸۷۸ھ میں ہوا، موجودہ مخطوطہ کے پہلے مقام کے آخر میں تحریر ہے :-

"کتبہ العاصی محمد عزت اللہ بتاریخ در شہر شعبان المعظم ۱۱۹۲ھ"

اس سے معلوم ہوا کہ آج سے ایک سو ستر سال قبل زیر تنقید مخطوطہ تحریر ہوا ہے، اس کی ابتدا یوں ہوتی ہے :-

"ان احکم ما تصح بہ حدیث التصنیف وتداوی بخاصیتہ المجربۃ حب التالیف"

اور آخر میں ہے :-

"و بعضے خشن باشد، و نیز سرخ باشد و تپ سخت و دادو بسیار پدید کند"

اس ترجمہ میں شاہی حکم سے چند پنڈت بھی شریک تھے، اغلب ہے کہ وہ گجرات کے ناگر ہوں گے، جو فارسی داں ہوتے

۱؎ مرأۃ احمدی جلد اول ص ۸۴ کلکتہ، ۲؎ مرأۃ سکندری ص ۵۹ بمبئی،

کے باعث سرکاری دربار مین دخیل تھے، لیکن یہ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ مترجم کے ان پنڈتون کے نام تحریر کرنے مین انتہائی بخل سے کام لیا ہے، مترجم نے اس کتاب کو سلطان محمود اعظم کے نام سے معنون کیا ہے، جو سلطان احمد بانی احمد آباد کا پوتا تھا، گجرات مین عام طور سے اس کو محمود بیگڑہ (بیگ ڑہ) کہتے ہین، اور بیگڑہ کا صحیح ترین ترجمہ ذوالقرنین ہے یعنی بیلون کی سینگون کی طرح لمبی لمبی لمبی دو مونچھون والا، اس بادشاہ نے گجرات مین ۵۴ برس بڑے امن وعدل کے ساتھ حکومت کی، اس نے ایک محکمہ تالیف و تراجم کا قائم کیا تھا، چنانچہ تاریخ ابن خلکان، شفاء، مشکوٰۃ شریف اور محمود شاہی وغیرہ کا ترجمہ فارسی مین اسی عہد مین ہوا[1] اسی محکمہ کے ماتحت یہ کتاب (شفائے محمودی) بھی سنسکرت سے فارسی مین ترجمہ کی گئی،

واگھ بھٹ کی کتاب ہندوستان مین بہت مقبول ہوئی اور اسی لئے اس کی متعدد شرحین لوگون نے کین، مترجم نے بھی ان شرحون سے فائدہ اٹھایا ہے، کیونکہ کسی جگہ "شارح کا قول" لکھکر نقل کرتا ہے، اور کسی جگہ بغیر اس کے سوال وجواب کی صورت مین ادا کرتا ہے، اور ایک جگہ شارح کا نام ارون دت بھی تحریر کیا ہے، اصل یہ ہے کہ اس کی کل ۳۴ شرحین لکھی گئی ہین، ان مین دو مطبوعہ ہین، (۱) اتنگ درپن، ہے، جس کا مصنف "واچس پتی" نامی ہے، (۲) آیوروید رسائن ہے جس کا مصنف "ہمادری" مشہور بید ہے، مگر افسوس ہے کہ آخر الذکر کتاب نامکمل ہے، اور اسی نوناقص طبع ہوئی ہے، ان ۳۴ شرحون مین سے ایک شرح کا نام "سرؤانگ سندرہ" ہے، اسی کا مصنف آرون دت ہے، جس کا ذکر مترجم نے کیا ہے[2] واگھ بھٹ نے بھی دوسری کتابون سے فائدہ اٹھایا ہے، اسی لئے اپنے عہد سے قبل کے مشہور اور ماہر اطبا کی رائے کا اپنی کتاب مین بار بار ذکر کرتا ہے، چنانچہ چیزک طبیب، اگنی ویش طبیب، آتے رے یہ طبیب اور ہاریت طبیب کا خصوصیت سے نام لیتا ہے، اس مین سے اگنی ویش طبیب اس قدر قدیم ہے، کہ اس کے عہد کا پتہ چلانا بھی مشکل ہے، اور آج اس کی کوئی کتاب کسی کتب خانہ مین نہین ملتی، لوگون کا خیال ہے، کہ اس کی کتابین دستبرد زمانہ سے محفوظ نہ رہ سکین، متاخرین نے اگر اس کے مسائل کا ذکر نہ کیا ہوتا، یا کتابون کا حوالہ نہ دیا ہوتا، تو شاید دنیا کو معلوم بھی نہ ہوتا، کہ اگنی ویش جیسا ماہر طبیب عالم وجود مین آیا بھی تھا،

واگھ بھٹ نے اصل کتاب کی ابتدا یون کی ہے، کہ پہلے شافی حقیقی کی حمد لکھی ہے، پھر کہتا ہے کہ حاذق طبیب اپنے شاگردون کو جو علم طب کی تعلیم دیتے ہین، اس مین بڑا وقت صرف ہو جاتا ہے، اور بہت کتابین مطالعہ کرنی پڑتی ہین، اور اس وقت مروجہ طب کی کل آٹھ قسمین ہین، (۱) تبتع بدن (تشریح) مین (۲) تداوی اطفال (بچون کے علاج) مین (۳) مضرت دیو کے بیان مین، (۴) بیماریون کے علاج مین (۵) تیر، کانٹے، وغیرہ کے زخم کے علاج مین، (۶) زہریلے جانورون کے ڈسنے کے علاج مین، (۷) پری کے علاج مین (۸) قوت باہ کے علاج مین، مین نے ان سب کو یکجا کر دیا ہے اور اس کا نام اشٹ انگ ردی کائی چکیا[3] رکھا، اس کے بعد مصنف نے کتاب کی ترتیب اس طرح بتائی ہے، کہ اس مین چھ استھان (مقام) ہین جس کے ایک سو بیس (ادھیار باب) ہین، (۱) مقدمہ، اس کے تیس باب ہین (۲) تشریح ابدان اس کے چھ باب ہین، (۳) اسباب وعلل امراض، اس کے ۱۶ باب ہین، (۴) معالجات اس کے ۲۲ باب ہین، (۵) دواسازی اس مین چھ باب ہین (۶) بقیہ امراض کے علاج مین جس کا ذکر نہین ہوا، اس مین ۴۰ باب ہین، اس مختصر فہرست سے جس مین ہر باب کے مضمون کو مختصر عنوان سے بیان کیا ہے، پوری کتاب پر سرسری نظر پڑ جاتی ہے، موجودہ مخطوطہ مین دو مقام

[1] تاریخ گجرات جلد دوم قلمی [2] آیوروید نو اتہاس ص ۱۶۸، احمد آباد، [3] اشٹ ہشٹ، ہشت (آٹھ)

تو مکمل ہین، اور تیسرے مقام کے ۱۶ باب مین سے ۱۳ باب ہین، اور اس آخری باب کے بھی صرف نو صفحے ہین، باقی نامکمل ہے، اور ایسا معلوم ہوتا ہے، کہ کاتب نے لکھا ہی نہین، کیونکہ آخری صفحہ بالکل سادہ چھوڑ دیا گیا ہے، غالباً یہ کتاب کسی دوسرے نسخہ سے متعدد کاتبون کے ذریعہ نقل کرائی گئی ہے، کیونکہ پہلے مقام کے آخر مین تاریخ تحریر ۶ر شعبان ۱۱۹۲ھ ہے، اور دوسرے مقام کے اختتام پر ۱۱ر رمضان ۱۱۹۸ھ ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ پہلے مقام کے چھ برس کے بعد دوسرا مقام منقول ہوا، اگرچہ کتاب کا اکثر حصہ خطِ نستعلیق مین ہے، لیکن اوراق کی خاصی تعداد شکستہ کی بھی شان لئے ہوئے ہے، طب فرشتہ جس کا ذکر معارف ماہ دسمبر ۱۹۴۳ء مین ہوا ہے، واگھ بھٹ کی کتاب اس کے ماخذون مین داخل ہے،

واگھ بھٹ نے اپنی کتاب کی ابتدا، اخلاط سے کی ہے، عام طور پر اطبائے ہند تین خلطون کے قائل ہین، باد، بلغم تلخہ (صفرا)، "سودا" کو وہ خلط شمار نہین کرتے، لیکن واگھ بھٹ زیادہ وسیع النظر معلوم ہوتا ہے، غالباً بابلی اور یونانی اطبا کی راے سے بھی واقفیت رکھتا ہے، اس لئے ان تین اخلاط کی تحریر کے بعد اوس نے لکھا ہے کہ بعض لوگ خلط کی چوتھی قسم خون کو بتاتے ہین خون کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے، کہ ان کے نزدیک سودا، سوختہ خون کی ایک قسم ہے، جو باد کی آمیزش سے سرد خشک ہوگیا ہے، انسانی عمر کے اس نے تین حصے کئے ہین، سن طفولیت، جو ولادت سے سولہ سال تک شمار کیا جاتا ہے، اس مین بلغم کا غلبہ ہوتا ہے، سن توسط جو سترہ سال سے ۷۰ سال تک رہتا ہے، اس مین صفرا کا غلبہ ہوتا ہے، سن پیری جس کا سلسلہ آخری عمر تک رہتا ہے، اس مین باد کا غلبہ پایا جاتا ہے، اس بیان سے یہ خیال گذرتا ہے، کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل ہندوستانی باشندون کی اوسط عمر ستر برس کی ہوتی تھی، جیسا کہ آج انگلستان کے متعلق مشہور ہے، اور اب ہمارا ملک صحت کے اعتبار سے اس قدر گر گیا ہے کہ متقدمین کے وہم مین بھی نہ ہوگا،

مزہ کی چھ قسمین بتائی ہین، شیرین، ترش، شور، تلخ، تیز، زمخت اور کہتا ہے کہ انھین کے کم و زیادہ استعمال سے اخلاط مین کمی بیشی ہوتی ہے، اسی کے ساتھ اس کا خیال ہے کہ مرض کا اصلی سبب تغیر موسم یا تداخل موسم ہے، اور اس کی مثالون سے اُس نے خوب تشریح کی ہے، طبیب کے لئے چند اوصاف ضروری قرار دیتا ہے، اس کو ذکی اور فہیم ہونا چاہئے، کسی ماہر طبیب کا شاگرد ہونا ضروری ہے، تجربہ کار اور بے طمع ہو، لاعلاج امراض کی فہرست مین مندرجہ ذیل باتون کو بھی شمار کرتا ہے (۱) جس پر غضب شاہی نازل ہو (۲) جو بادشاہ کا دشمن ہو، (۳) یا خود اپنا آپ دشمن ہو (یعنی اپنے فوائد اور نقصان کی پروا نہ کرتا ہو)

آگے چل کر وہ لکھتا ہے کہ وہ باتین جن کی احتیاط سے بیماری پیدا نہین ہوتی تیرہ ہین، ریاح، پیشاب، پاخانہ، چھینک، کھانسی، پیاس، بھوک، نیند، ڈکار، جمائی، آنسو، قے، منی، اس کی تشریح کرتے ہوے وہ کہتا ہے کہ فطری طور پر جب وہ وقوع پذیر ہون، تو روکنا نہ چاہئے، اور جب یہ فطری طور پر رُکے ہون، تو اخراج کی کوشش نہ کرنی چاہئے، ورنہ صحت مین خلل آجائے گا، اس کے بعد اس نے ہر ایک کے فوائد و نقصانات کی تشریح کی ہے، آخر مین غیر فطری امساک کے متعلق تحریر کرتا ہے، کہ اس سے (۱) عضو مین درد پیدا ہوتا ہے، (۲) سوج جاتا ہے، (۳) تپ عارض ہوتا ہے، (۴) سینہ درد کرنے لگتا ہے (۵) پیشاب آسانی سے نہیں ہوتا، (۶) سنگ مثانہ پیدا کرتا ہے، (۷) فتق کی بیماری مین مبتلا ہوجاتا ہے، پانی کے متعلق عام ہندو روایات کی پیروی کرتا ہوا لکھتا ہے، کہ پانی جو برستا ہے، وہ دو قسم کا ہوتا ہے، کبھی تو ابر زمین کے دریا سے پانی لے کر برساتا ہے اور کبھی ہوا کے شیرین دریا سے لاکر گراتا ہے، اور ان دونون کے فرق معلوم کرنے کا طریقہ یہ تبلایا ہے، کہ برستے ہوئے پانی کو کسی برتن

میں بھر لو، پھر اس مین پکا ہوا چاول ڈال دو، تھوڑی دیر کے بعد دیکھو، اگر اصلی حالت پر ہے، تو آسمانی دریا کا پانی سمجھو، ورنہ سُرخی ورلزوجیت پیدا ہونے پر سمندری پانی یقینی ہے، عام ہندو روایت کے مطابق گنگا آسمانی دریا کا پانی ہے، لیکن اس محقق کو اس مین شک ہے، اس لئے وہ کہتا ہے کہ لوگ کہتے ہین، کہ گنگا آسمانی دریا کا پانی ہے، آگے چل کر لکھتا ہے کہ ہندوستان مین وہ ندیان جو مغرب (بحر مغرب) میں گرتی ہین، وہ اچھی اور پاکیزہ ہین، ان مین کوئی عیب نہین، اس کا پانی مثل دوا کے ہے، اسی طرح ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی سے جو ندی بہتی ہے، وہ بھی اچھی ہے، لیکن مشرق، مالوہ، کوکن کے چشمون سے جو پانی جاری ہوتا ہے، اس کے استعمال سے مرض بواسیر پیدا ہوتا ہے، کوہ ھندرو (گجرات) کا پانی استسقا، پیل پا، اور غم پیدا کرتا ہے، کوہ ھی (گجرات) و در ندھیاچل کے پانی سے سر کی بیماریان ہوتی ہین، جمنا کے متعلق کہتا ہے، کہ چرب اور شیرین ہے، اور اس کے پینے سے قوت باہ مین اضافہ ہوتا ہے، مشروبات مین سے گائے کے دودھ کی بابت اس نے لکھا ہے، کہ جو شخص اس کا استعمال کرتا ہے، وہ جلد بوڑھا نہ ہوگا، غلہ کے بابت سب سے پہلے چاول کو لیا ہے، کہ چاول کی بہت سی قسمین ہین، جن مین سے رت سال، مہا سال، کلم سال بڑے اور بہترین قسم کے ہین، اور یہ کمود (گجرات) کے ملک مین پیدا ہوتے ہین، تو انگ، کشمیر مین، شکنا رہٹ، مگدھ (بہار) میں اور سکندھک جس مین سے خوشبو آتی ہے، جالندھر (پنجاب) مین ہوتا ہے، جانورون کے ذکر مین وہ ایک ایسے حیوان کا حال لکھتا ہے کہ جس کے چار پاؤن نیچے اور چار اوپر اور دو دانت مثل ہاتھی کے ہوتے ہین، اور اس کا نام شرو ہے اور کشمیر مین ہوتا ہے، اس کے طرز تحریر سے معلوم ہوتا ہے، کہ آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل مصنف کے عہد یا قریب ترین عہد مین یہ جانور عالم وجود مین تھا، لیکن پانچوین صدی ہجری مین جب علامہ بیرونی یہان آیا ہے، تو اس کی نسل مفقود ہو چکی تھی، جیسے گینڈے بیرونی کے عہد مین گنگا کے کنارے جنگلون مین بہ کثرت تھے، اور برہمن اس کا گوشت بڑے شوق سے کھاتے تھے، لیکن آج صرف عجائب خانون ہی مین محفوظ ہین، اور وہ بھی افریقہ سے منگوائے جاتے ہین، کیونکہ ہندوستان مین ان کی نسل منقطع ہوگئی، مختلف جانورون کے گوشت کے خواص بیان کرتے ہوئے، کہتا ہے، کہ بکری کا گوشت سردی، دہنیت، اور کچھ گرانی لئے ہوئے ہوتا ہے، لیکن اخلاط ثلاثہ مین کوئی اضافہ نہین کرتا، کیونکہ اس کا گوشت آدمی کے گوشت کے مثل ہے، اس سے رطوبت مین بھی زیادتی نہین ہوتی، اور بدن کو قوت دیتا ہے، گائے کا گوشت خشک کھانسی دور کرتا ہے، مگر بادی بیماریوں میں اضافہ کرتا ہے، بھینس کا گرم خواب آور بہت ثقیل ہے، چرمے کو سخت اور بدن کو فربہ کرتا ہے،

اس کے بعد سبزی پھول، پھل کے خواص لکھتا ہے، خیال تھا کہ ہندوستانی مخصوص میوون کے متعلق کوئی نیا تجربہ فرو پیش کرے گا، مثل آم، کھرنی، کٹھل، بڑہل، گولر وغیرہ کے، لیکن یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ان سب کے متعلق بہت نامکمل بیان ہے، دواؤن کے جو خواص لکھے ہین، اس مین ہڑ (ھلیلہ) کی بڑی تعریف کی ہے، ھلیلہ، بلیلہ، اور آملہ ان تینوں کو ملا کر "ترپھلی" کہتے ہین، اور ان کے استعمال کی بڑی ترغیب دیتا ہے، اس کے بعد کی فصل مین کھانے پینے اور جماع کے متعلق ہدایات ہین کہ کب، کس قدر، کس طرح کھانا پینا چاہئے، ہر ایک کو علیحدہ علیحدہ فصلوں مین تفصیل سے لکھا ہے، اسی طرح مزہ کے ہر قسم کو تفصیل سے لکھ کر اخلاط ثلاثہ سے پیدا ہونے والی بیماریون کا ذکر اور اسی کے ساتھ اس کا علاج بھی بتلاتا ہے، قے، اور علاج کا ذکر اس کے بعد ہے، اس مین ہر موسم مین غلبہ اخلاط اور مریض کے ماحول کا اندازہ کر کے خاص خاص تیلون کے استعمال

---

[۱] البیرونی ص ۹۹ مین ہے کہ اس کے چھوٹی سونڈ بھی ہوتی ہے، اور لوگ کہتے ہیں کہ کوکن کے ڈانگ کے جنگل مین ہوتا ہے،

کی اجازت دی گئی ہے،

سترھوان باب اس بیان مین ہے کہ بدن کو کس طرح گرم رکھ سکتے ہین، پھر ایک خاص باب حقنہ کا ہے، اس مین تحریر ہے کہ کن کن امراض مین اس کی ضرورت پڑتی ہے، اور کن کن اوقات مین اس کا استعمال کرنا چاہئے، اس کے بعد آلاتِ حقنہ پر بحث کی ہے، کہ اس کو چاندی سونے، تانبے، ہاتھی دانت، مچھلی کے دانت نے اور نیزہ کا ہونا چاہئے، دوسری دھات اور لکڑی بھی اجازت دی ہے، پھر یہ بتلایا ہے کہ آلہ کی شکل کیا اور کس طرح ہونی چاہئے، بیسوان باب ناک مین دوا ٹپکانے، اور اکیسواں دھونی لینے کے بیان مین ہے، پھر کلی، غرغرہ آنکھ مین دوا ٹپکانا وغیرہ ہے، پچیسوان باب خاص توجہ کے قابل ہے جس مین جراحی کے متعلق بحث کی ہو کانٹا چبھنے، تیر لگنے، کیل گڑ جانے سے جو زخم ہو جاتا ہے، اس کا علاج بڑی تفصیل سے لکھا ہے، پہلے ایسی دواؤن کا ذکر کیا ہے جس سے بدن کے اندر پیوست شدہ چیزین خود بخود نکل آئین، پھر نشتر اور دوسری چیزون سے چیرنے پھاڑنے کاٹنے امتحان کرنے، پٹی باندھنے وغیرہ کا بہت مفصل بیان دیا ہے، اس بیان کو پڑھکر یہ بات بڑی خوبی سے انسان کے ذہن نشین ہو جاتی ہے، کہ آج سے ۱½ ہزار سال قبل بھی جراحی کے تمام ضروری سامان موجود تھے، مثلاً آلات کشیدگی، آلات کشید اندرونی اعضاء کے زخم وغیرہ کے امتحانی آلات، آلاتِ کشید کی کے ضمن مین مردہ جنین کو نکالنا، جلندھر کا پانی کشید کرنا، دانت اکھاڑنا پھر آلودہ مقام کو روئی سے کسی آلہ کے ذریعہ صاف کرنا وغیرہ دیا ہے، غرض چودہ قسم کے آلات کا کلی طور پر، اور پھر اس کے ضمن مین جزئی آلات کا بھی ذکر کرتا جاتا ہے، پھر ان آلات کی شکل، بنانے کا طریقہ کہ کن کن چیزون سے یہ آلات تیار کئے جائین، اس کو اچھی طرح بتانے کی کوشش کی گئی ہے، بدن داغنے کے متعلق بھی اوس نے خوب لکھا ہے، اور اسی بیان پر مقام (باب) اول ختم ہو جاتا ہے،

مقام دوم تشریح بدن مین ہے، اس باب مین استقرار حمل سے موت تک کی بیماریون پر نظر ڈالی ہے، اور اس کی چھ فصلین ہین، (۱) حمل، (۲) سود و زیان (۳) تقسیم اعضاء، (۴) مقامات نازک (۵) قرب موت کی علامت، (۶) استدلال خیر و شر کے بیان مین ہے،

پہلی فصل مین، اس سوال کے جواب مین کہ ہم استقرارِ حمل تو محسوس کرتے ہین، لیکن اس مین روح کس طرح داخل ہو جاتی ہے،؟ واگھبھٹ کہتا ہے کہ آتشین شیشہ جب آفتاب کے مقابل ہو، اور اس کے نیچے کوئی کپڑہ رکھو تو تھوڑی دیر مین وہ کس طرح جلنے لگتا ہے، پس جس طرح غیر محسوس طور پر آگ اس مین پیدا ہوتی ہے، اسی طرح جنین کے جسم مین روح حلول کرتی ہے، آگے چل کر وہ یہ سمجھانا چاہتا ہے، کہ دنیا کی ہر جنس کی شکل الگ الگ کیون ہے، اس کی تشریح تمثیل کے ذریعہ یون کی ہے، کہ مختلف قسم کے قالبون مین پگھلا ہوا لوہا اگر ڈالو تو مخصوص اشکال کی مختلف چیزین ڈھل جائین گی، اسی طرح ہر جنس کے مادہ کا رحم مخصوص شکل کا خدا نے بنایا ہے، اس لئے قالب (رحم) سے اسی شکل کی صورت ظہور پذیر ہو گی، جیسا رحم (قالب) ہے مثلاً ہاتھی، اونٹ، گھوڑا، کتا، گائے، بکری،

راقم الحروف کہتا ہے کہ اس نظریہ کو تسلیم کر لینے کے بعد بھی انسانی تجربات کی بنا پر اس مین اضافہ کی ضرورت ہے یعنی یہ صحیح ہے کہ ہر قالب کی طبعی شکل کے مطابق تولید ہو گی، غیر جنس کا اثر نہ ہو گا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قمری مین فاختہ (جو اصلی قالب ہے) کے بجائے کبوتر کی رنگت، خوبصورتی، اور جثہ ہوتا ہے، اس لئے میرا خیال ہے کہ دو جنس جب کہ قریب قریب ہم جنس ہون تو نر کا اثر بھی تولید مین ظاہر ہوتا ہے، جیسے گھوڑا، اور گدھا، فاختہ اور کبوتر، بھیڑ اور بکری،

ہندو رسم و رواج کے مطابق اس نے تحریر کیا ہے، کہ عورت کے لئے ہر ماہ تین دن ایام کے ہوتے ہین، حالانکہ اس ماہر فن

تجربہ سے اچھی طرح معلوم ہے، کہ ہر عورت کے لئے یہ تحدید صحیح نہین، لیکن عام برہمن چونکہ اس حالت مین عورت کو بالکل ہی ناپاک
ناقابل تخاطب سمجھتے ہین اور گھر کی کسی چیز کو وہ چھو نہین سکتی، اور گھر کا تمام کاروبار حالت التوا مین آجاتا ہی، اس لئے عورت کے پاک
ہونے کا انتظار اگر اس کے آخری دن تک کیا جائے، تو تمام خانگی کاروبار مین ابتری کا اندیشہ ہے، اس کے علاوہ ایسی حالت مین
اس لحاظ سے اس کو آرام کی بھی ضرورت ہے، ان حالات کو مدنظر رکھ کر، اس کی مدت ان لوگون نے تین دن رکھی ہے، جس مین سکون
کے ساتھ آرام کرتی رہے، لیکن اس کے یہ معنی نہین کہ تین دن کے بعد پاک سمجھی جاتی ہے، کیونکہ ایسی صورت مین نہ مندر جاسکتی ہے
نہ کسی محفل مین شریک ہوسکتی، جب تک کہ وہ صحیح معنی مین پاک نہ ہو جائے، البتہ صرف گھر کے متعلق کام انجام دسکتی ہے،

واگ بھٹ عمر کے لحاظ سے اس کی ابتدا بارھوین سال سے بتلاتا ہی، اور آخری مدت پچاس سال رکھی ہے، اس کے بعد اس نے
ایک دلچسپ بات یہ کہی ہو کہ صحیح و تندرست بارہ سال کی لڑکی، اور صحیح و تندرست بیس سال کا مرد ہو تو ان دونون کے اختلاط سے
قوی، تندرست اور طویل العمر فرزند پیدا ہوگا، اس بیان سے یہ واضح ہوجاتا ہے کہ آج سے ۱½ ہزار سال قبل اپنے ہندوستان کی
تندرستی کس قدر اچھی تھی، کہ بارہ سال کی لڑکی جس کو آج بچہ سمجھا جاتا ہے، وہ پوری عورت بن جاتی تھی،

اولاد کے متعلق مصنف کا خیال ہے کہ اگر مرد کے مادہ کی مقدار زیادہ ہوگی تو نرینہ اولاد ہوگی، اس
کے بالعکس ہونے سے لڑکی ہوگی، اور اگر مساوی مقدار مین ہو تو عنین ہوگا، توام (جڑوان) کے متعلق لکھتا ہو کہ
دونون کے درمیان اگر باد کا تداخل ہوجائے تو جڑوان بچے ہون گے، لیکن اس باد کے ساتھ صفرا یا بلغم کا غلبہ ہو تو بچے غیر جنس کے
پیدا ہون گے، جیسے چوہا، سانپ، بندر وغیرہ، باپ کی ہمشکل اولاد ہونے کی ترکیب یہ بتاتا ہے کہ عورت کو چاہئے کہ حالت حمل
میں اپنے شوہر کے چہرہ کو ہر وقت دیکھتی یا خیال کرتی رہے، اس کے بعد کچھ دوائین اور ٹوٹکے نرینہ اولاد کے لئے لکھ کر ہر ماہ جنین میں
جو اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کا ذکر کرتا ہے، مدت حمل کے بابت لکھتا ہے، کہ نوین مہینہ کا ایک دن بھی گذرجائے تو جنین
زندگی کی توقع ہے، یعنی کم از کم مدت آٹھ ماہ ایک دن، اور زیادہ سے زیادہ مدت بارہ ماہ بتاتا ہے،

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہد مین بھی ایک مقدمہ اسی نوعیت کا آیا تھا، اور ماہرین فن کی شہادت پر بارہ کی مدت تسلیم
کی گئی، اور وہ حد (تعزیر) سے بچ گئی، لیکن اگر مدت بارہ سے زیادہ ہو تو وہ بیماری ہے،

آپ نے سنا ہوگا کہ بعض عورتوں کو حمل قرار پاکر مدت حمل میں یا اختتام پر وضع حمل ہوتا ہے، مگر اخراج کچھ نہین ہوتا، عوام
خیال تھا کہ ایسے بچے کو دیو (جن) اٹھا لیجاتا ہے، یہ محقق حکیم کہتا ہے کہ بعض اوقات باد کے غلبہ سے حیض کا خون رحم مین جمع ہوکر بستہ
ہوجاتا ہے اور اس کی شکل بالکل حاملہ جیسی ہوجاتی ہے، اور لوگ غلطی سے اس کو حاملہ سمجھنے لگتے ہین، مگر ہوا نکل جانے اور بستہ خون
کے بہ جانے سے وہ حالت (دواؤن یا قدرتی ذرائع سے) جب جاتی رہتی ہے تو عوام کا خیال یہ ہوتا ہے کہ اس کا حمل دیو اڑا لے گیا، حالانکہ
حمل نہین ہو، اس کے بعد زچہ بچہ کی حفاظت اور غذا کی نسبت گفتگو کی ہے، پھر ایک طویل مقالہ اس پر لکھا ہو کہ اعضاء کی کن علامتون
سے انسانی اخلاق معلوم کئے جاسکتے ہین، اور یہ کہ انسانی اعضا کس طرح ہونے چاہیئن پھر یہ بتایا ہے کہ کن کن مقام پر کیسی علامتین
ظاہر ہون تو بہ اسباب ظاہر طبیب اس کی موت کا حکم لگائے، اس مقام کا آخری باب خواب اور شگون کے متعلق ہے جس کا
زیادہ تر تعلق اعتقاد اور وہم سے ہے،

تیسرے مقام مین ۱۶ فصلین ہین، (۱) اسباب و علل (۲) تپ (۳) خون و صفرا (۴) دمہ (۵) قی (۶) علل شراب نوشی (۷)
اتیسار (۹) عسر البول (۱۰) خروج منی (۱۱) ورم (۱۲) استسقا (۱۳) سوجن (۱۴) برص (۱۵) علت باد (۱۶) سرخ بادہ،

پہلی فصل میں بیماریوں کے اسباب شناخت کرنے کے پانچ طریقے بیان کرکے لکھتا ہے کہ بیماری کا اصل سبب اخلاط ثلاثہ میں سے کسی کا غلبہ ہے دوسری فصل میں بخار (تپ) کے اسباب قسمیں شناخت اور ان کا علاج بتلایا ہے، تیسری میں کھانسی (۴) میں دمہ (۵) وقے تشنگی، کے بیان میں ہے چھٹی فصل میں یہ بیان کیا ہے کہ شراب سے کون کون بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، اسی کے ضمن میں اس کے فوائد کا بھی شمار کیا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے دس گن ہیں، اس کے اثر کی بابت لکھا ہے کہ مثل "زہر" کے زود اثر ہے، فوراً تمام رگ وپے میں دوڑ جاتا ہے، دسویں فصل میں خروج منی کی بیس قسمیں لکھی ہیں، (۱۱) قئ، گولہ شکم، (۱۲) استسقاء (۱۳) میں اماس بدن کا ذکر ہے اور اسی پر یہ مخطوطہ زیر تبصرہ ختم ہو جاتا ہے،

واگبھٹ اس فن کا پہلا مدون اور اس کی کتاب فن کی پہلی کتاب ہے، اس لئے انضباط کے بجائے مسائل طبیہ میں انتشار زیادہ ہے جو باب اور فصلیں اس نے قائم کی ہیں، وہ اکثر ایسی ہیں جس میں ایک دوسرے کا تداخل ہو سکتا ہے کبھی کبھی ایک ہی فصل میں خواص ادویہ علت اسباب علت اور علاج سب ہی درج کر دیتا ہے اور کہیں مضامین کو بہت تشنہ چھوڑ دیتا ہے، مفردات کے خواص بہت اختصار کے ساتھ لکھتا ہے اور اکثر متحدالخواص اشیاء کو ایک ہی سانس میں بول جاتا ہے حالانکہ اس کے دوسرے خواص بھی ہوتے ہیں جس کو وہ نظرانداز کر دیتا ہے رسم و رواج اور مذہبی روایات کو طبی اصول کے تحت ذکر کر دیتا ہے، لیکن اس کے محقق اور ماہر فن ہونے میں کوئی کلام نہیں جو بات اس کی تحقیق کے خلاف ہو اس کا ضرور اظہار کرتا ہے طبی مسائل جہان مذہب سے ٹکراتے ہوں تو ہاں دبے الفاظ میں اصل حقیقت بیان کر جاتا ہے وہ اپنے سے پہلے اطبا کے اقوال کو بھی وزن دیتا ہے اور اپنے نظریہ کی تائید میں ان کو پیش کرتا ہے، راقم الحروف کو "بید" کی دوسری کتابوں کے مطالعہ کا اتفاق نہیں ہوا ہے، اور اردو یا فارسی میں ان کے ترجمہ سے بھی آگاہی نہیں ہے، اس لئے یہ نہیں کہہ سکتا کہ قدماء کے کن کن مسائل سے اختلاف یا اتفاق کیا ہے، اور ان کے مقابل جدید مسائل کیا ایجاد کئے، اور ان کی صحت پر جو دلائل پیش کئے وہ طب اور حکمت کے اصول سے کہاں تک قرین صحت ہیں،

تشریح ابدان کے جو آلات عہد موجودہ میں ایجاد ہوئے ہیں، ان کو دیکھتے ہوئے پرانے آلات بچوں کے کھلونے نظر آتے ہیں، لیکن آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل اس عہد کی ضروریات قوی، اور جسمانی طاقت کے لحاظ سے حسب ضرورت تمام اشیاء کا موجود ہونا بہت ہی تعجب انگیز ہے، یہاں تک کہ بغیر پیٹ چاک کئے مردہ جنین کے نکالنے کے آلات کا بھی ذکر کرتا ہے،

مترجم نے اصل کتاب کے علاوہ ان کی شرحوں سے بھی فائدہ اٹھایا ہے، جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا، یہ آزاد اور مطلب خیز ترجمہ ہے بعض مسائل کو بیان کرکے جو اسلام کے خلاف ہوں، صفائی سے کہہ دیتا ہے کہ یہ حرام ہے یا ناجائز ہے، شگون اور ٹوٹکے کا ذکر کرکے کہتا ہے، کہ اگر اسلام میں جائز ہے تو کر سکتا ہے، افسوس ہے کہ اس کا ترجمہ شگفتہ نہیں ہے، ایک بڑی تکلیف دہ چیز اس ترجمہ میں یہ ہے کہ ابتدا میں ہر اصطلاح کا ترجمہ کرکے اسی ترجمہ کو آگے چل کر استعمال کیا ہے، لیکن جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا جاتا ہے اصطلاحی ترجموں کو چھوڑ کر اصل سنسکرت کا لفظ ہی استعمال کرنے لگتا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جن اشخاص کو اس فن سے لگاؤ نہیں ہے وہ ماقبل کے اصطلاحات بھی یاد نہ رکھیں، تو آخری ابواب کا سمجھنا ان کے لئے سخت دشوار ہو جائے،

راقم الحروف کو اس کا علم نہیں ہے چونکہ یہ کتاب زیور طبع سے آراستہ ہوئی ہے، اور نہ یہ جانتا ہے کہ ہندوستان اور یورپ کے کسی کتب خانہ میں اس کا دوسرا نسخہ بھی موجود ہے، کیونکہ میں ایک ایسے شہر میں ہوں جہاں اس قسم کے ریسرچ کے ذرائع مفقود ہیں، لیکن سنا ہے کہ چند سال قبل بھروچ (گجرات) سے اس کا مکمل نسخہ حیدرآباد پہونچ گیا ہے، کیا حیدرآباد کے علم دوست احباب اس طرف توجہ فرمائیں گے،

تاریخ ابن خلکان کے فارسی ترجمے

از جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڈھی

عربی کی سیر و تواریخ کی کتابون مین جو قبولیت عام اور شہرت دوام ابنِ خلکانؒ[۱] کی کتاب کو حاصل ہوئی ہے وہ اس فن کی کسی دوسری کتاب کو نصیب نہیں ہوئی، عربی کے تاریخی ادب مین یہ کتاب اس قدر مشہور و متداول رہی ہے کہ اس کو "تاریخ ابن خلکان" یا صرف ابن خلکان کہدیتے ہین، حالانکہ اس کا پورا نام وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان مما ثبت بالنقل او السماع واثبتہ العیان ہے، یہ کتاب ہر زمانہ مین اہل علم کی توجہ کا مرکز رہی ہے اور اس کے بعد کے اسلامی تذکرون اور سوانحِ عمریون کی شاید ہی کوئی کتاب ہوگی جس مین اس کا حوالہ نہ پایا جاتا ہو، با این ہمہ یہ کتاب اس قدر نایاب رہی، کہ ممالک اسلامیہ مین یہ ۱۲۷۵ھ مین طبع ہوئی، سب سے پہلے اسکی طباعت کا فخر ایک جرمن مستشرق وستنفیلڈ کو حاصل ہوا، جس نے مختلف مخطوطات کا مقابلہ کرکے ۱۸۳۵ء سو ۱۸۵۰ء تک ۱۵ سال کے عرصہ مین کتاب کا ایک مکمل نسخہ ۱۳ حصون مین بالاقساط گوتھا سے شائع کیا، پھر ۱۸۴۵ء مین موسیو پنیاپل نے اس کے بعض اجزا لاطینی ترجمہ کے ساتھ امسٹرڈام سے شائع کئے، مشاہیر اسلام کے حالات و سوانح کی ایک مستند و معتبر کتاب ہونے کے لحاظ سے مشرق و مغرب دونون مین اس کتاب کے ساتھ اعتنا کیا گیا، اور یورپ کی مختلف زبانون مین اس کے بعض حصون کے ترجمے کئے گئے، انگریزی مین اس کا مکمل ترجمہ فرنچ مستشرق ڈی سلین نے ۴ ضخیم جلدون مین کیا، فارسی اور اردو مین بھی اس کے ترجمے ہو چکے ہین، گو اہل ایران نے اس کتاب کے ترجمہ کی طرف توجہ نہیں کی لیکن ہندوستان اور ترکی مین اس کے چار چار ترجمے ہو چکے ہین، ذیل مین ہم ان فارسی تراجم کی مختصر کیفیت بیان کرتے ہین،

۱۔ فارسی کا پہلا ترجمہ سلطان ناصر الدین ابو الفتح محمود شاہ معروف بہ "محمود بیگڑہ" فرمانروائے گجرات (۸۶۳ھ تا ۹۱۷ھ) کے حکم سے مولانا یوسف بن احمد بن محمد بن عثمانؒ[۲] نے منظر الانسان کے نام سے کیا، جیسا کہ مترجم نے مقدمۂ کتاب مین ذکر کیا ہے ۸۸۹ھ مین سلطان نے پاپانیر کو فتح کیا جس کی تاریخ مترجم نے مقدمہ مین کلمۂ "افتتح" سے نکالی ہے، اس کی یادگار میں اس نے اس کتاب کا ترجمہ کرنے کی فرمائش کی ۸۸۹ھ مین ترجمہ کرنے کا حکم صادر ہوا، ۸۹۳ھ میں اس کا آغاز ہوا، اور ۸۹۴ھ مین مکمل ہو کر بادشاہ کے ملاحظہ کے لئے پیش ہوا، اور ۲۵ دوسری کتابون سے اس ترجمہ مین اور مطالب کا اضافہ کیا گیا، ۸۹۵ھ میں نظر ثانی کی گئی، اور

[۱] قاضی القضاۃ شمس الدین ابو العباس احمد بن محمد بن ابراہیم بن ابی بکر بن خلکان البرمکی الاربلی الشافعی الاشعری، ولادت ۶۰۸ھ، وفات ۶۸۱ھ، ان کے مفصل حالات کے لئے دیکھو طبقات الشافعیہ للسبکی، ج ۵ ص ۱۴، فوات الوفیات ج ۱ ص ۵۵، حسن المحاضرہ للسیوطی ج ۱ ص ۲۰۶، [۲] سید عثمان ملقب بہ "شمع برہانی" حضرت قطب العالم رحمۃ اللہ علیہ کے خلفائے کبار مین سے تھے، سلطان محمود کو اُن سے بڑی عقیدت تھی، ۸۶۳ھ مین ان کا وصال ہو گیا، اور یہی سال سلطان محمود کی تخت نشینی کا ہے، چونکہ محمود شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے پچاس سال (۹۱۷ھ) تک گجرات پر حکومت کی ہے، اس لحاظ سے تعجب نہیں، اگر سید عثمان رحمۃ اللہ علیہ کے پر پوتے اپنے دادا کے باپ کی وفات سے ۲۶ سال کے بعد ۸۸۹ھ مین رجب کہ ہنوز وہ نوعمر ہون گے، اس کتاب کا ترجمہ شروع کرتے ہین،

منظر الانسان نام رکھا گیا، مورخ محمد بن عمر المکی معروف بہ حاجی دبیر (۱۰۲۰ھ) مصنف ظفر الوالہ نے اس ترجمہ کو دیکھا تھا، وہ لکھتے ہیں:

"لقد ترجم بعبارۃ حسنۃ تشعر	عمدہ عبارت میں اس کا ترجمہ کیا گیا ہے جس سے
باتقانہ فی معرفۃ اللسانین ویخبر	دونوں زبانوں میں مترجم کی واقفیت کامل معلوم
بما یشھد لہ بفضلہ کلا الفریقین	ہوتی ہے، اور فریقین کے مترجم کی فضیلت کا اعتراف
علیہ الرحمۃ"[51]	کرنے کی شہادت دیتی ہے، ان پر خدا کی رحمت ہو،

فی زماننا اس ترجمہ کے چار مخطوطے موجود ہیں:-

۱- ایک نسخہ برٹش میوزیم کے کتب خانے میں نمبر ۱۴۱۶ پر موجود ہے، اور ۱۱۱۲ھ کا لکھا ہوا ہے، جلد چمڑے کی منقش و مطلا ہے، کل ۴۰۹ اوراق ہیں، عبارت ذیل سے کتاب شروع ہوتی ہے:-

"آرایش دیباچہ مناقب و مآثر سلاطین رفیع مقدار"

کتاب کے آخری سطور میں مترجم نے لکھا ہے کہ یہ ترجمہ، ار ربیع الاول ۸۹۳ھ کو شروع ہوا اور ۲۴ ر رمضان ۸۹۵ھ کو ختم ہوا، اس پر ڈاکٹر ریو نے یہ اعتراض کیا ہے، کہ مترجم نے دیباچہ میں ترجمہ کا سنہ آغاز ۸۸۹ھ بتایا ہے، وہ اس آخری تحریر سے مطابقت نہیں رکھتا، لیکن بقول مترجم یہ سنہ ترجمہ کرنے کی فرمایش کا ہے، ورنہ ترجمہ کا آغاز تو ۸۹۳ھ میں ہوا، آخر میں مترجم کے نسب نامہ سے متعلق یہ نام اضافہ کئے گئے ہیں، (عثمان) بن علی بن احمد الشجاع السجزی" ترجمہ میں اکثر جگہ اصل متن کا اختصار کیا گیا ہے، عربی اشعار جو مصنف نے بکثرت نقل کئے ہیں، ان کو یا تو بغیر ترجمہ کے نقل کیا ہے، یا بالکل اڑا دیا ہے، اوراق ۱ تا ۱۲ پر تذکروں کی فہرست ہے، جو تعداد میں ۸۳۰ ہیں، ورق ۱۳ پر سلطان محمد قطب شاہ کی مہر ہے جس میں ۱۱۱۵ھ درج ہے[52]

۲- دوسرا نسخہ بھی اسی برٹش میوزیم میں ہے، جلد اول کا ترجمہ حرف ز تک نمبر ۳۸۲۳۵ پر موجود ہے، پہلے نسخہ کے مترجم کے فارسی دیباچہ کے بجائے اس میں ایک طویل عربی دیباچہ ہے، جس کے شروع کے دو ایک ورق غائب ہیں، اس میں سلطان محمود کی مدح ہے، (ورق ۳-۴) مگر اس میں سے ابن خلکان کے دیباچہ کا ترجمہ جو پہلے نسخہ میں موجود ہے نکال دیا گیا ہے، عربی اشعار کے ترجمے حواشی پر لکھے گئے ہیں، جلد دوم کا ترجمہ نمبر ۶۶۶، پر ہے، جو ۳۱۱ اوراق پر مشتمل ہے، یعنی حسب نسخہ اول ورق ۲۱۶ تا ورق ۴۰۹،[53]

۳- تیسرا نسخہ دفتر دیوانی حیدر آباد کے کتب خانے میں موجود ہے، جو ۱۰۳۱ھ کا لکھا ہوا ہے، اور کاتب کا نام علی بن حسن الالہی ہے،[54]

۴- چوتھا نسخہ پروفیسر محمود شیرانی کے کتب خانہ میں نمبر ۳۱۹۹ پر موجود ہے، جس کا ذکر انھوں نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے[55]

(۳) دوسرا فارسی ترجمہ کبیر بن ادریس بن محمد لطیفی نے کیا تھا، یہ ترجمہ سلطان سلیم اول فرمانروائے ترکی (۹۱۸ھ-۹۲۶ھ) کے لئے لکھا گیا تھا، سلطان سلیم کو جب تواریخ اور خصوصاً ابن خلکان کے مطالعہ کا شوق ہوا تو اس کا ترجمہ فارسی میں کرایا

---

[51] ظفر الوالہ بمظفر والہ ج ۲ ص ۲۳ [52] فہرست مخطوطات فارسی ج ۱ ص ۳۲۴ [53] ؍؍ ج ۲ ص ۸۰۹ [54] رسالہ معارف جون مضمون کتب خانہ دفتر دیوانی" اس کے بعد ایک مضمون "منظر الانسان کا مصنف" (؟) معارف میں شائع ہوا ہے، جس میں ظفر الوالہ کی ایک طویل غیر متعلق عبارت نقل کی گئی ہے، اس میں نہ تو مترجم کے حالات پر کوئی روشنی ڈالی گئی ہے، نہ اس کتاب کے کسی مخطوطہ کا ذکر کیا گیا ہے [55] رسالہ اردو جنوری ۱۹۴۲ء،

یہ ترجمہ نصف ہونے پایا تھا، کہ سلطان نے وفات پائی، مترجم کا حال معلوم نہ ہو سکا، لیکن ڈاکٹر ریو نے سلیم نامہ کے مخطوطہ کے حوالہ سے اس کا نام قاضی عبد الکبیر لطیفی لکھا ہے، جو فارسی نثر نویسی پر مامور تھا، حاجی خلیفہ نے اوس کو معروف بہ قاضی زادہ لکھا ہے،

ڈاکٹر ریو کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس ترجمہ کے دو مخطوطے موجود ہیں، ایک سر گور اوسلے کے ذخیرۂ مخطوطات میں نمبر ۶، ۳ پر اور دوسرا اکنگز کالج لائبریری میں نمبر ۱۰۱ پر ہے،

(۳) تیسرا ترجمہ ظہیر الدین اردبیلی کا (المتوفی بمصر ۹۳۰ھ) کا ہے، طاش کبری زادہ نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ انھوں نے تاریخ ابن خلکان کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا[۱]،

حاجی خلیفہ نے ظہیر الدین کی بجائے اظہر الدین لکھا ہے، اس کا قیاس ہے کہ قاضی زادہ نے اس کتاب کا کوئی ترجمہ نہیں کیا، اس کے نزدیک ظہیر الدین اور قاضی زادہ دونوں ایک ہی شخص ہیں، اور یہ قیاس آرائی خود قاضی زادہ کے ایک فارسی رسالہ سے کی گئی ہے، اس کے الفاظ یہ ہیں :۔

"وترجمہ (وفیات) مولانا اظہر الدین الاردبیلی بالفارسیۃ وتوفی بمصر سنۃ ۹۳۰ ثلاثین وتسعمائۃ ورأیت رسالۃ فارسیۃ لکبیر بن اویس بن محمد اللطیفی الشہیر بقاضی زادہ المتوفی سنۃ ۹۳۰ ثلاثین وتسعمائۃ ذکر فیہا ان السلطان سلیم خان القدیم لما اشتغل بتتبع التواریخ خصوصاً وفیات لابن خلکان ترجمہ بالفارسیۃ وحین وصل الی نصفہ مات السلطان ولعل ذالک المذکور ھو الشہیر باظہر الدین اردبیلی[۲]"

اور مولانا اظہر الدین اردبیلی المتوفی بمصر ۹۳۰ھ نے وفیات کا ترجمہ فارسی میں کیا ہے، میں نے ایک فارسی رسالہ مؤلفہ کبیر بن اویس بن محمد اللطیفی مشہور بہ قاضی زادہ المتوفی ۹۳۰ھ دیکھا تھا اس میں اس نے یہ بیان کیا ہے کہ سلطان سلیم خان قدیم کو جب تواریخ خصوصاً وفیات ابن خلکان کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا، تو اس نے (قاضی زادہ نے) فارسی میں اس کا ترجمہ کیا، اور جب آدھی کتاب کا ترجمہ ہو چکا تو سلطان نے وفات پائی، شاید مترجم مذکور وہی ہے جو اظہر الدین اردبیلی کے نام سے مشہور ہے،

معلوم ہوتا ہے کہ حاجی خلیفہ کو دونوں کے سنہ وفات ایک ہونے سے دھوکا ہوا ہے، حالانکہ یہ دونوں جدا جدا شخص ہیں، طاش کبری زادہ کے بیان کے مطابق ظہیر الدین کا وفیات ابن خلکان کا فارسی میں ترجمہ کرنا ثابت ہے، قاضی عبد الکبیر کے ترجمہ کے متعلق حاجی خلیفہ نے اس کے رسالہ کا حوالہ دیا ہے وہ خود بتا رہا ہے، کہ اوس نے سلطان سلیم کی فرمایش پر اس کا ترجمہ کیا تھا، اس پر سلیم نامہ کے مصنف حکیم الدین ادریس بن حسام الدین البدلیسی کی اس شہادت کا اضافہ کر لو جو اوس نے دیباچۂ کتاب میں پیش کی ہے کہ جب وہ سلطان سلیم اول کے زمانہ میں اپنی تاریخ لکھ رہا تھا، تو تین اور آدمی بھی ایسی ہی تاریخی کتابیں لکھنے میں مصروف تھے، ان میں ایک قاضی عبد الکبیر بھی تھا، جو فارسی نثر لکھتا تھا[۳]، اس بیان سے صاف ظاہر ہوتا ہے، کہ سلطان سلیم کے لئے جس نے وفیات کا فارسی میں ترجمہ کیا وہ عبد الکبیر ہی تھا، ظہیر الدین کا ترجمہ اس کے علاوہ ہے،

(۴) چوتھا ترجمہ ہندوستان میں کیا گیا تھا، ڈاکٹر ریو نے مخطوطہ تاریخ محمدی (از محمد بن رستم بن قباد جو ابتداے ہجرت سے لیکر ۱۱۹۰ء تک کی تاریخ ہے) کے ورق ۶۴ ا کے حوالہ سے لکھا ہے[۴] کہ شیخ کبیر بن شیخ منور لاہوری (المتوفی ۱۰۲۶ھ احمد آباد) نے ابن خلکان کی کتاب کا فارسی ترجمہ کیا تھا، شیخ کبیر عہد اکبری کے علما میں سے تھے، چنانچہ مورخ بدایونی نے ان کا ذکر کیا ہے[۵]، مگر اس ترجمہ کے متعلق کچھ نہیں لکھا،

[۱] الشقائق النعمانیہ بہامش ابن خلکان ج ۱ ص ۵۰۰ [۲] کشف الظنون جلد ۲ ص ۴۳۹ [۳] فہرست مخطوطات فارسی جلد ۱ ص ۲۱۹ [۴] جلد ۳ ص ۱۰۵۳ [۵] منتخب التواریخ جلد ۳ ص ۱۰

ادبیات

غزل

از جناب روش صدیقی

ہوائے ضبط سے شمع یقین پہ کیا گذری
الٰہی عشق کی جان حزین پہ کیا گذری

تباہ کرکے مرے دل کو اے مرادِ حیات
بتا! کہ تیرے دلِ نازنین پہ کیا گذری

نشانۂ ستم دوست، ساکنان زمین؟
کسے خبر ہے کہ چرخ برین پہ کیا گذری

سکون مین رنگِ ہزار اضطراب شامل ہے
متانتِ نگہ شرمگین پہ کیا گذری

فقیہ شہر کو سودا ہے نرگس مخمور
کوئی بتائے کہ اربابِ دین پہ کیا گذری

جنونِ دشت نوردی پہ عشق نازان ہے
خبر نہین کسی خلوت نشین پہ کیا گذری

وہ بزم ناز سلامت یہ تذکرہ بے کار
بلاکشانِ ملامت گزین پہ کیا گذری

شریکِ بزم خرابات ہوکے اے زاہد
ترے تصورِ خلد برین پہ کیا گذری

ہر آستان سے انھین ماورا تو مان لیا،
کہے یہ کون غرورِ جبین پہ کیا گذری

لبِ حبیب سے سُن کر روش مرے اشعار
یہ سوچتا ہون، دلِ نکتہ چین پہ کیا گذری

غزل

از جناب یحییٰ اعظمی

سراپا درد ساری زندگانی ہوتی جاتی ہے
محبت اک بلائے ناگہانی ہوتی جاتی ہے

ہر اک شے سے جہان کی سرگرانی ہوتی جاتی ہے
قیامت اب مری شوریدہ جانی ہوتی جاتی ہے

دلِ محزون سے ہر نقش تصور مٹتا جاتا ہے،
مگر اک یاد ان کی جاودانی ہوتی جاتی ہے

نظر آنے لگا ہے اور ہی کچھ منظر فطرت
نگاہون پر یہ کس کی حکمرانی ہوتی جاتی ہے

دبی تھی جو دلِ سوزان مین اب آنکھون سے بہ کر
محبت کی وہ ساری آگ پانی ہوتی جاتی ہے،

زبانون پر کبھی یہ حرفِ نازک آ نہین سکتا
حدیث شوق آنکھون کی زبانی ہوتی جاتی ہے

تغافل اور یہ طرزِ تغافل اے معاذ اللہ
مجھی پر کس لئے یہ مہربانی ہوتی جاتی ہے

ہین مخفی اس مین نکتے سینکڑون درس محبت کے
وہ دزدیدہ نظر جانِ معانی ہوتی جاتی ہے،

نہ اب وہ ولولے ہین اور نہ ذوقِ زندگی باقی
حیاتِ شوق نذرِ عمر فانی ہوتی جاتی ہے

مطبوعات جدیدہ

انتخاب غالب شائع کردہ کتب خانہ رامپور تقطیع بڑی ضخامت ۲۴۴ صفحے کاغذ نفیس رنگ آمیزی نظر فریب ٹائپ روشن، قیمت عہ

نواب کلب علی خان والیٔ رامپور کی فرمائش پر مرزا غالب نے اپنے اردو اور فارسی کلام کا ایک انتخاب کیا تھا جس پر خود ان کے قلم کی تصحیح و ترمیم ہے، اس اعتبار سے یہ بڑی نادر چیز تھی، ریاست کے کتب خانہ میں اصل نسخہ محفوظ تھا، جو اس کی جانب سے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع ہوا ہے، کتب خانہ کے لائق ناظم مولوی امتیاز علی خان صاحب عرشی کی تصحیح، مقدمہ، اور شرح غالب نے اس انتخاب کی قدر و قیمت اور بڑھا دی ہے، مقدمہ میں انھوں نے مرزا صاحب کی تحریروں سے ان کے اردو اور فارسی کلام کے متعلق خود ان کی راے، عام شعر و سخن اور محاسنِ شاعری کے متعلق ان کے نقطۂ نظر اور عمر، تجربہ اور مشق و ممارست کی پختگی کے ساتھ اس میں بتدریج جو تبدیلی ہوتی رہی، اور آخر میں انھوں نے محاسنِ شاعری کی جانچ کے لئے بقولِ خود جو میزان مقرر کی تھی، اس کی تفصیل بیان کرکے اس انتخاب کو اس میں تولا ہے، اس سلسلہ میں شعر و سخن کے متعلق مرزا صاحب کے اور متفرق خیالات بھی معرضِ تحریر میں آگئے ہیں، اس سے بھی زیادہ قابلِ قدر اور نئی چیز شرح غالب ہے، مرزا صاحب نے لوگوں کے استفسار پر اپنے بعض اردو اور فارسی اشعار کی تشریح کی ہے، یا ان کے کسی پہلو پر روشنی ڈالی ہے، یا اصحابِ ذوق کو خود ان کی جانب توجہ دلائی ہے، یا اپنی کسی تحریر میں کسی اور حیثیت سے اپنے کسی شعر کا ذکر کیا ہے، جس سے اس کے کسی پہلو پر روشنی پڑتی ہے، فاضل مرتب نے ان تمام معلومات کو مرزا صاحب کے فارسی اور اردو مکاتیب سے تلاش کرکے کتاب کے آخر میں شرح غالب کے نام سے جمع کر دیا ہے، اور اس انتخاب کے جن اشعار سے ان کا تعلق ہے اس کے صفحہ اور سطر کا حوالہ دیدیا ہے، اس طرح خود غالب کے قلم سے ان کے بہت سے اشعار کی شرح تیار ہوگئی ہے، گو یہ معلومات مرزا صاحب کے مکاتیب ہی سے جمع کئے گئے ہیں، لیکن یہ خود بڑی محنت اور دیدہ ریزی کا کام تھا، جس کا اندازہ دوسرے مشکل کر سکتے ہیں، فاضل مرتب کی یہ جدت قابلِ داد اور ان کا "طغراے امتیاز" ہے، یہ تو اس انتخاب کے معنوی محاسن ہیں ظاہری حیثیت سے بھی وہ حسن و نفاست کا مرقع ہے، اور بلا مبالغہ کہا سکتا ہے کہ اس حسنِ مذاق کے ساتھ آج تک اردو میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے، نسخۂ حمیدیہ اور ڈاکٹر بجنوری مرحوم کے مقدمہ کی اشاعت کے بعد سے ایک عام بد مذاقی یہ پیدا ہوگئی ہے، کہ مرزا کی اشکال پسندی اور ان کے اغلاق و ابہام کو بھی ان کے محاسنِ شاعری میں شمار کیا جانے لگا ہے، حالانکہ ان کا بہترین کلام وہی ہے، جو صاف اور سلیس ہے، اس انتخاب سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، اس میں مشکل سے کوئی پیچیدہ شعر مل سکتا ہے، آخر میں کلیات فارسی کے چار اور دواوین اردو کے آٹھ معتبر نسخوں کی مدد سے اختلاف نسخ بھی ظاہر کر دیا گیا ہے، غرض یہ انتخاب ظاہری اور معنوی محاسن ہر پہلو سے نہایت مکمل اور اصحابِ ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے۔

دنیا کی کہانی از جناب محمد مجیب صاحب بی اے آکسن تقطیع چھوٹی ضخامت ۲۲۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت قیمت ۶، مجلد پتہ مکتبہ جامعہ ملیہ، دہلی،

یہ کتاب مصنف کی ان تقریروں کا مجموعہ ہے جو دہلی ریڈیو سے نشر ہوئیں، اس کو شائع ہوئے عرصہ ہوگیا، ہمارے پاس

اب ریویو کے لئے آئی ہے، اس مین آغاز آفرینش سے لیکر اب تک دنیا کے ارتقاء اور اس کی تمدنی سرگذشت بیان کی گئی ہے، عالم کی تخلیق اس کے ارتقائی مدارج، انسانی ترقی کے مختلف دور، قدیم قومون اور تہذیبون کے حالات یونان، روم، چین اور ہندوستان کی تہذیبین، عیسائیت اسلام اور مسلمانون کی تہذیب، ترک تاتار، اسلامی ہند، اور یورپ کی تاریخ و تمدنی و سیاسی سرگذشت اور جدید یورپ کے حالات کو اختصار اور جامعیت کے ساتھ اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ دنیا جن جن مراحل سے گذر کر اس منزل تک پہنچی ہے اور اس کے تمدنی ارتقاء مین جن جن قومون کا حصہ رہا ہے، اس کی پوری سرگذشت نگاہون کے سامنے آجاتی ہے، اسلامی مسائل مین بھی بڑی حد تک مصنف کا نقطۂ نظر صحیح اور قلم محتاط رہا ہے، اور نازک مراحل کو خوش اسلوبی سے طے کیا ہے، انداز بیان کے اعتبار سے کتاب شگفتہ اور دلچسپ ہے، موضوع کی خشکی کو لطف بیان نے زائل کر دیا ہے، یہ کتاب معلومات کے اعتبار سے متوسط درجون کے نصاب مین داخل ہونے کے لائق ہے، فاضل مصنف کا ادبی ذوق اتنا پختہ ہو گیا ہے کہ انھین کبھی کبھی ادبی میدان مین بھی اترنا چاہئے، معلوم نہین اس کو انھون نے کیون چھوڑ رکھا ہے،

قرآن مجید کی پہلی کتاب مولوی عبد السلام صاحب قدوائی ندوی تقطیع بڑی ضخامت ۵۰ صفحے کاغذ معمولی، کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہین، پتہ:- ادارہ تعلیمات اسلام نمبر ۳۰۸، امین آباد پارک لکھنؤ،

معارف مین لکھنؤ کے ادارۂ تعلیمات اسلام کا تذکرہ آچکا ہے، یہ ادارہ کئی سال سے تعلیم قرآن کی مفید خدمت انجام دے رہا ہے اور لکھنؤ کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ مین تعلیم قرآن کا خاصہ ذوق پیدا کر دیا ہے، مذکورۂ بالا کتاب بھی اس سلسلہ کی ایک مفید خدمت ہے، عربی زبان کی باقاعدہ تحصیل مین بڑا وقت صرف ہوتا ہے، اس لئے ادارہ کے لائق استاذ اور کارکن مولوی عبد السلام صاحب قدوائی ندوی نے خاص ترجمۂ قرآن کے بقدر عربی تعلیم کے لئے ایک قرآنی نصاب کا سلسلہ شروع کیا ہے، یہ کتاب اس سلسلہ کی تیسری کڑی ہے، اس مین اس مقصد کے مطابق کلام مجید کے آغاز سے اس کی آیات اور اس کے الفاظ سے عربی لغت اور قواعد کے اسباق ترتیب دیئے ہین، املا و ترجمہ کی مشقین دی ہین، غیر قرآنی مشقون مین بھی اصل مقصد کو پیش نظر رکھا گیا ہے، جا بجا ضروری صرفی و نحوی قواعد، تشریح طلب آیات کی وضاحت، اور ان سے متعلق ضروری معلومات دیدئے ہین، اس طریقۂ تعلیم سے عربی زبان سے واقفیت اور ترجمۂ قرآن کی استعداد ساتھ ساتھ پیدا ہوتی جاتی ہے، یہ کتاب پہلے پارہ کے ترجمہ کا نصاب ہے، جن لوگون کو کلام مجید سے ذوق ہے ان کو ضرور اس کتاب سے فائدہ اٹھانا چاہئے، اس سلسلہ مین اس پہلو کی جانب توجہ دلانا ضروری ہے، کہ یہ نصاب صرف کلام مجید کا ترجمہ سمجھ لینے کی استعداد کے لئے ہے، اس کی تفسیر و تاویل کے حدود اس سے باہر ہین، اس کا ظاہر کر دینا اس لئے ضروری معلوم ہوا کہ آج کل کے مجتہدین اردو اور انگریزی تراجم کے بل پر اجتہاد کے مدعی بن جاتے ہین، براہ راست ترجمہ سمجھ لینے کے بعد ان کو سند جواز نہ ہاتھ آجائے جس کی مثالین آئے دن سامنے آتی رہتی ہین،

سرمایہ از جناب م م جوہر صاحب تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت مرقوم نہین، پتہ:- مکتبہ برہان قرول باغ دہلی،

کارل مارکس کا صحیفہ کیپٹل دنیا کی ان چند کتابون مین ہے، جس نے پرانے نظام عالم پر ایک عالمگیر انقلابی اثر ڈالا ہے، تمام ترقی یافتہ زبانون مین اس کا ترجمہ ہو چکا ہے، اردو مین بھی اس کی ضرورت تھی، اس کتاب کے بعض ابواب و مباحث اتنے فلسفیانہ پیچیدہ اور دقیق ہین، کہ اصل زبان مین ان کا سمجھنا مشکل ہے، ترجمہ مین شاید ژولیدگی بیان اور بڑھ جاتی، اس لئے لائق مترجم نے ترجمہ کرنے کے بجائے اس کے اہم ابواب و مباحث کی جن سے کارل مارکس کے اقتصادی فلسفہ اور اس کے بنیادی نظریون پر روشنی پڑتی ہے، اپنی زبان مین تلخیص کر دی ہے، یہ تلخیص صاف اور سلجھی ہوئی ہے، مطالب کے سمجھنے مین کوئی دقت نہین ہوتی، بقیہ ابواب کی تلخیص اس کتاب کے دوسرے حصہ مین ہوگی، اس سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا، کہ اردو دان طبقہ کو براہ راست مارکس کے اقتصادی فلسفہ سے واقفیت ہو جائے گی، اور ان کو ہندوستانی سوشلسٹون کی پریشان تعبیرون سے نجات مل جائے گی،

"م"

جلد ۵۶ ماہ ربیع الاول ۱۳۶۴ھ مطابق ماہ مارچ ۱۹۴۵ء عدد ۳

مضامین

شذرات	شاہ معین الدین احمد ندوی	۴۹-۵۰
شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا نظریہ علم،	مولانا سید مناظر احسن گیلانی صدر شعبہ دینیات جامعہ عثمانیہ	۵۱-۶۰
"باقیات فانی"	جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی علیگ ایڈوکیٹ اعظم گڈھ	۶۱-۶۶
سوزنی	جناب غلام مصطفیٰ خان صاحب ایم اے علیگ لکچرار کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی	۶۷-۷۱
مطبوعات جدیدہ	"م"	۷۲

شذرات

آج سے تقریباً پچاس ساٹھ سال پیشتر ایک انگریز مشنری ڈاکٹر ٹسڈل نے ینابیع الاسلام کے نام سے فارسی مین ایک کتاب لکھی تھی جس مین یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی تھی، کہ نعوذ باللہ کلام مجید آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تصنیف ہے، اور اسلام یہودی عیسوی اور بعض دوسرے مذاہب سے ماخوذ ہے، اور انگریزی، عربی، اور اردو متعدد زبانون مین اس کے ترجمے شائع کئے گئے تھے، لیکن اسی زمانہ مین اس کے جوابات بھی لکھے گئے، چنانچہ عربی مین التطبیق بین الدیانۃ الوثنیہ والمسیحیہ کے نام سے مصر سے جواب شائع ہوا تھا، اردو مین پنجاب کے کسی صاحب نے جواب لکھا تھا، خواجہ کمال الدین مرحوم کی ینابیع المسیحیت بھی اسی کا الزامی جواب ہے، غرض یہ کوئی نئی کتاب نہین ہے، اور اس کی پوری تنقید و تردید ہو چکی ہے، دنیا اسے بھول بھی چکی تھی، اب نصف صدی کے بعد ایک نام "محسن اسلام" نے اسی کتاب کا جس کو مصنف نے مزید اضافون کے ساتھ اوریجنل سورسز آف قرآن کے نام سے انگریزی مین شائع کیا تھا، ترجمہ کرکے اس گڑے ہوے مردے کو اکھاڑا ہے، اور اپنے نزدیک اسلام کی بڑی خدمت انجام دی ہے،

یہ پرانے متعصبانہ دور کی باتین تھین، اب علم و تحقیق کا قدم اتنا آگے بڑھ چکا ہے کہ خود یورپ کے علماء اس قسم کی کتابون کو خرافات سے زیادہ وقعت نہین دیتے، اور اگر کسی درجہ مین اس کی اہمیت مان بھی لیجائے تو عیسائیون اور مسلمانون کے مناظرانہ مسائل پر اتنا لکھا جا چکا ہے، اور عیسائیون کے اعتراضات کے اتنے جوابات دیئے جا چکے ہین کہ مشکل ہی سے کوئی نیا مسئلہ نکل سکتا ہے، اس زمانہ مین بھی خواجہ کمال الدین مرحوم اور پروفیسر سید نواب علی صاحب کی تصانیف ایسی محققانہ ہین، کہ آج تک عیسائیون سے ان کا جواب نہ ہو سکا، خواجہ صاحب مرحوم کی ینابیع المسیحیت اور پروفیسر نواب علی صاحب کی تاریخ صحف سماوی اور قصص الحق مین ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب کا بڑی حد تک جواب موجود ہے، جن لوگون کی نظر سے ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب گذری ہو ان کو ضرور ان کتابون کا مطالعہ کرنا چاہئے،

اس سے قطع نظر علمی اور تحقیقی حیثیت سے ڈاکٹر ٹسڈل کی کتاب کی کوئی قدر و قیمت نہین، وہ دجل و فریب تحریف و تدلیس اور مغالطہ و غلط بیانی کا مجموعہ ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کو ایک نیا مذہب فرض کرکے بائبل اور قرآن مجید کے بعض مشترک اسرائیلی قصص اور اسلام یہودیت و نصرانیت اور بعض دوسرے مذاہب کے چند ملتے ہوئے عقائد کی تفصیلات غیر معتبر کتابون سے نقل کرکے انھین غیر مذاہب سے ماخوذ بتایا گیا ہے، اور ان مین اور بائبل کے بیان مین جو اختلافات ہین، ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی

لاعلمی اور جاہل یہودیوں اور عیسائیوں سے استفادہ کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے، لیکن مصنف کے یہ سارے دعوے و دلائل اور مقدمات و نتائج سرے سے غلط ہیں، اسلام کوئی نیا مذہب نہیں ہے، بلکہ قرآن مجید میں بتکرار اس کی تصریح ہو کہ اسلام وہی دین ہے جس کی تعلیم تمام گذشتہ انبیاء علیہم السلام دیتے چلے آئے ہیں، وہ کسی نئے مذہب کا موجد نہیں، بلکہ گذشتہ مذاہب کا مصلح اور ان کا مصدق ہے،

اسلام کا مقصد صرف یہ تھا کہ گذشتہ انبیاء علیہم السلام کی اصلی تعلیمات کو جو مرور زمانہ سے انسانوں کے ہاتھوں مسخ ہو چکی تھیں بیرونی آمیزش سے پاک کرکے دوبارہ زندہ کر دے، اور انسانوں کی دینی و دنیوی فلاح و سعادت کا دائمی خداوندی دستور العمل ان کے ہاتھوں میں پہنچا دے، اس لئے گذشتہ سچے مذاہب کی بعض تعلیمات و عقائد میں اس کا اشتراک اخذ و نقل کا ثبوت نہیں، بلکہ اسلام کے مقصد کا فطری نتیجہ ہے، موجودہ عیسائیت پر اس کا قیاس صحیح نہیں ہے، جس کا بڑا حصہ آفتاب پرستوں اور دوسری مشرک قوموں سے ماخوذ ہے،

پھر مصنف نے اپنے دعوے کے ثبوت میں زیادہ تر اسرائیلی قصص اور چند ایسے عقائد کو پیش کیا ہے جن کا اسلام کے بنیادی عقائد سے کوئی تعلق نہیں، اس کے بنیادی عقائد اور اس کی اخلاقی و روحانی تعلیمات کو مصنف نے ہاتھ تک نہیں لگایا ہے، پھر دعویٰ تو یہ تھا، کہ ان مباحث میں قرآن مجید اور مستند احادیث کے علاوہ اور کسی کتاب کا حوالہ نہ دیا جائے گا، بلکہ احادیث کی حیثیت بھی ثانوی ہوگی، لیکن حال یہ ہے کہ مستند احادیث کا کیا ذکر، زیر بحث قصص و عقائد کی تمام تفصیلات جن پر بحث و اعتراض کی بنیاد ہے، قصص الانبیاء، وعرائس المجالس جیسی ادنیٰ درجہ کی کتابوں، واقدی جیسے افسانہ گو راوی، اور تفسیروں کی غیر معتبر اسرائیلی روایات سے نقل کی گئی ہیں، جو تمامتر نومسلم یہودیوں، اور عیسائیوں کے بیانات سے ماخوذ ہیں، اور جنھیں کوئی بھی معتبر نہیں سمجھتا، کلام مجید میں ان افسانوں کا کوئی ذکر نہیں، اس میں عبرت و بصیرت کے لئے محض صاف سادہ واقعات و عقائد ہیں افسانوی تفصیلات یہودیوں اور عیسائیوں کی اعجوبہ پرستی کا نتیجہ ہیں، ان کو کلام مجید کی جانب منسوب کرنا صریح کذب ہے،

باقی جن اسرائیلی قصص اور عقائد میں قرآن مجید اور بائبل کے بیانات میں کچھ اختلاف ہو، تو وہ کلام مجید کی نہیں، بلکہ بائبل کی تحریف کا نتیجہ ہے جس کا اعتراف بہت سے ارباب کلیسا تک کو ہے، بلکہ ان کی صحت تک مشکوک ہو، بیت المقدس کی تباہی کے ساتھ ساتھ بارہا جن کتابوں کا نام و نشان دنیا سے مٹایا جا چکا ہو، اور پھر مدتوں کے بعد زبانی یادداشتوں سے دوبارہ ان کی ترتیب عمل میں آئی ہو اور جو حضرت مسیح علیہ السلام کی وفات کے ایک صدی بعد زبانی روایات سے مرتب کی گئی ہوں، ان کا اور کلام مجید کے مسلمہ تواتر کا کیا مقابلہ، اگر بائبل کے بعض بیانات کو صحیح مان لیا جائے تو انبیاء علیہم السلام کی عصمت تک جس پر مذاہب کی صداقت کا دارومدار ہے، ختم ہو جاتی ہے، بائبل میں ایسی باتیں انبیاء علیہم السلام کی جانب منسوب کی گئی ہیں، جو ایک معمولی انسان کے رتبہ سے بھی فروتر ہیں، ایسی حالت میں اس کے بیانات کا کیا اعتبار رہ جاتا ہے، اردو میں اس موضوع پر کافی پرانی کتابیں موجود ہیں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، حکیم نور الدین قادیانی، مولوی سید محمد صاحب علی گڈھی، مولانا محمد علی صاحب مونگیری، ڈاکٹر وزیر خان صاحب اکبرآبادی کی کتابوں میں ڈاکٹر فنڈل کے اکثر اعتراضات کے جوابات آگئے ہیں لیکن یہ کتابیں پرانے مذاق کی ہیں، اس زمانہ میں خواجہ کمال الدین اور پروفیسر سید نواب علی صاحب کی کتابیں مفید ہیں

یہی وجہ ہے کہ فانی کے کلام مین عشق و محبت کی آتش فشانیان بہت کم نظر آتی ہین، اور درد و غم سے گھبرا کر وہ ہر وقت موت کے آرزومند رہتے ہین،

ان کا مایوس دل بجز ویرانہ سازی کے غالباً اور کوئی صلاحیت و استعداد نہین رکھتا،

اس دل مایوس کی ویرانہ سازی کچھ نہ پوچھ اس نے جب دیکھا چمن تا کا بیاباں ہوگیا

شراب کی مستی ان کے ساغر حیات کی تقدیر مین نہین،

خالی لئے بیٹھا ہون تری بزم مین ساغر مے میرے مقدر مین نہین زہر ہی بھر جا

زہر ہی بھر جا کے ٹکڑے پر غور کرو، کس حد تک شاعر کے روحانی اضمحلال کا پتہ دیتا ہے، ذوق تشنگی سے ہر شخص لطف نہین اٹھا سکتا، اور نہ اس نکتہ کو سمجھ سکتا، کہ محرومیان ہی روح کا سرمایہ نشاط ہین، ایک طالب صادق کے لئے زہر کی تمنا کبھی جائز نہیں ہوسکتی، لیکن فانی کی زبان سے بار بار یہی صدا نکلتی ہے، ملاحظہ ہو،

دبی زبان سے مرا حال چارہ ساز نہ کہہ بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا

کیا عشق کی سخت کوشی اور جانبازی کا یہی مطالبہ ہے ؟

فانی اپنی زندگی کی تصویر ان الفاظ مین کھینچتے ہین :-

مری حیات ہے محروم مدعائے حیات وہ نقشِ پا ہون جسے کوئی رہگذر نہ ملا

یہ اسی یاس و نا امیدی کا نتیجہ ہے، کہ غزل کی غزل پڑھتے جائیے، دو چار شعر بھی ایسے نہیں ملتے، جو وجدانی کیفیت کے حامل ہون، یا جن کو پڑھ کر دل و دماغ کو کوئی سرور حاصل ہوسکے، چنانچہ وہ خود اپنے افسانۂ غم کے اعادۂ پیہم سے گھبرا کر پکار اٹھتے ہین،

یاد ہے فانی تجھے کوئی کہانی اور بھی ختم کر افسانۂ غم دل پریشاں ہوگیا

فانی کے ذوق محبت کا ماحصل صرف رونا ہے، یا رونے سے فرصت ملنے پر خاموش رہنا ہے، چنانچہ فرماتے ہین،

ہمیں تیری محبت میں فقط دو کام آتے ہین جو رونے سے کبھی فرصت ہوئی خاموش ہو جانا

کیا اس اعتراف حقیقت کے بعد فانی کے کلام مین آثار زندگی کی جستجو کامیاب ہوسکتی ہے ؟

غرض مجموعۂ زیر تنقید مین اس قسم کے اشعار بکثرت موجود ہین، جن سے شاعر کی عام روحانی افسردگی و اضمحلال کا کافی طور پر اندازہ ہوتا ہے، اس افسردگی اور بے کیفی کی توجیہ اس طرح کی جاتی ہے، کہ فانی کو تمام عمر ناکامیون کا سامنا رہا، اسلئے ان کے کلام مین زیادہ تر یاس و حسرت کے جذبات پائے جاتے ہین، مجھ کو اس سے انکار نہین، لیکن سوال یہ ہے کہ تغزل کی بزم کیف مین خانگی آلام و مصائب کا تذکرہ کس حد تک جائز اور مناسب ہے، ؟ شاعر کو اگر محض اپنی ذاتی ناکامیون کا ماتم کرنا ہے، تو اس کے لئے مرثیہ کا میدان کھلا ہوا ہے، جہان وہ خوب جی کھول کر سینہ کوبی اور گریہ وزاری کرسکتا ہے، کسی کو اعتراض کا حق نہ ہوگا، لیکن حسن و عشق کی بزم تجلی مین قدم رکھ کر اس کو مرثیہ خوانی کی اجازت نہین مل سکتی، یہ وہ مقام ہے، جہان درد و غم ہی کی لذت سے قلب و روح کی پرورش ہوتی ہے، جہان نزول مصائب پر مرحبا کی صدائین بلند کی جاتی ہین، اور جہان پیچ کر حیات انسانی کی تمام دشواریان آسان ہو جاتی ہین، اس بنا پر یہ راہ نوحہ خوانون کے لئے نہین، بلکہ ان شوریدہ مزاجون کے لئے مخصوص ہے جو اس نکتہ سے واقف ہین،

عشق در اول و آخر ہمہ ذوق است و سماع
این شرابیست کہ ہم پختہ و ہم خام خوش است

آج کل عام قاعدہ یہ ہو کہ جب کسی شاعر کا مرتبہ خاص طور پر بڑھانا ہوتا ہے، تو وہ کسی چیز کا امام بنا دیا جاتا ہو فانی کے کلام مین جب کوئی خاص امتیازی وصف نظر نہین آیا، تو ایک لفظ یاسیات ایجاد کیا گیا، اور فانی کو اس کا امام قرار دیا گیا چنانچہ عام طور پر فانی کا یہ بہت بڑا کمال سمجھا جاتا ہے، یعنی بالفاظ دیگر وہ بہت روتے ہین، اور خوب روتے ہین، اور ایسا روتے ہین، کہ اس سے گھبرا اٹھتے ہین، شاعری جذبات کی مصوری کا نام ہے، ہمارے نزدیک یاس کوئی جذبہ نہیں، بلکہ تمام جذبات کے فقدان کا نام ہے، جس کو یاس سے تعبیر کیا جاتا ہے، اس لئے اس کی مصوری کسی طور پر شاعرانہ کمال کی دلیل نہین ہوسکتی، خصوصاً ایک غزل گو شاعر کے لئے یاس انگیز خیالات کا ادا کرنا ہمارے نزدیک کسی طور پر نشان فخر و امتیاز نہیں بن سکتا،

علاوہ ایک زندہ اور بیدار دل کے ایک غزل گو شاعر کے کلام مین دوسری جس چیز کو میری نگاہ ڈھونڈھتی ہے؟ یہ ہے، کہ اس کے دل مین حسن و عشق کی عظمت، پاکیزگی اور لطافت کا احساس کس حد تک موجود ہے، اور اس کے ترانۂ محبت کی اخلاقی سطح کہان تک بلند ہے؟ یعنی وہ جس عشق کا مدعی ہے، اس کی حیثیت صرف ایک مادی مرض کی ہے جس کی صعوبت و تکلیف سے گھبرا کر بیمار موت کے لئے دست بدعا ہو جاتا ہے، یا وہ کیف و انبساط کا ایک ابلتا ہوا سرچشمہ ہے جس کی تلاطم خیز موجون سے آلام و مصائب کی بڑی بڑی چٹانین ٹکرا کر پاش پاش ہو جاتی ہین؟

افسوس ہے کہ غزل گو شعرا نے عام طور پر عشق و محبت کی اخلاقی بلندی اور روحانی عظمت کو بالکل نظر انداز کر دیا، اور اسکی چشم و نگاہ کو صرف جلوہ فروشان لب بام کی عشوہ و ادا کے دام فریب مین پھنسا کر چھوڑ دیا، اس تنگ نظری کا نتیجہ یہ ہوا، کہ حسن و عشق کی بزم لطیف رفتہ رفتہ ہوا و ہوس کی جلوہ گاہ بن کر رہ گئی، اور محبت کے بلند اور شریفانہ جذبات کو بالائے طاق رکھ کر صرف لفظی شعبدہ پردازی اور بازیگری سے کام لیا جانے لگا،

غور کرو، وہ عشق جس کو نکتہ دان روم نے "طبیب روحانی" کہکر پکارا تھا،

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما   اے طبیب جملہ علت ہائے ما

جس کے فیضان سے عارف شیراز نے متاثر ہو کر حیات ابدی کا ادعا کیا تھا،

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق   ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

کیا اس کے آثار و نتائج یہی ہین، کہ بستر غم پر لیٹے ہوئے کراہا جائے، اور ہر وقت موت کے لئے دعائین مانگی جائین ڈوبی ہوئی نبضین، کٹی ہوئی رگین، پتھرائی ہوئی آنکھین، سسکتی ہوئی لاشین، نیلگون چہرے، زرد آنسو وغیرہ کیا یہی ایوان محبت کے نقش و نگار ہین، پست ہمتی، کم نظری، پست خیالی، مرگ طلبی، گریہ و زاری، سینہ کوبی، یاس و ناامیدی، انقباض و افسردگی، ضعف و بےحسی وغیرہ، کیا عشق جو بقائے روح کا سرچشمہ ہے، انہی دل شکن اخلاق کی تعلیم کا علمبردار ہے؟ میت، جنازہ، کفن وغیرہ کیا اس کی بزم کیف صرف انہی چیزون کی نمایش گاہ ہے؟ غرض اہل لکھنو کے ماتمی ذوق کی بدولت تغزل صرف ایک جسد بے روح بن کر رہ گیا جس مین کسی قسم کی زندگی کی حرارت یا تپش باقی نہین رہی،

اس بنا پر سب سے پہلے یہ دیکھنا ہو کہ شاعر نے عشق کو کس نگاہ سے دیکھا ہے، یعنی وہ اس حقیقت سے باخبر ہو کہ نہین

کہ عشق فطرتِ انسانی کا سب سے زیادہ لطیف، سب سے زیادہ نازک، سب سے زیادہ بلند اور شریفانہ جذبہ ہے، وہ فضائلِ اخلاق کا سب سے بڑا معلم، اسرار و حقائق کا سب سے بڑا مبصر، اور رزمگاہِ حیات کا سب سے بڑا مجاہد ہے، وہ اپنے اندر ذوق وشوق کیف وسرور اور روحانی انبساط کا ایک نامحدود عالم رکھتا ہے، وہ کسی حالت مین کبھی مایوس نہین ہوتا، وہ ناکامیون اور محرومیون سے بھی لطف اندوز ہوتا ہو، شدید سے شدید مصائب بھی اس کے پاے استقلال کو متزلزل نہیں کرسکتے، غم مین اس کو لذت محسوس ہوتی ہے، درد اس کے لئے ہمیشہ پیام راحت بن کر اٹھتا ہے، وہ خلوص و ایثار، غیرت و استغنا، عزت نفس اور خودداری کی مجسم تصویر ہے، جس مین ابتذال کا کوئی رنگ نظر نہین آتا، غرض وہ ایک ایسی اکسیر ہے جو کفر کو ایمان اور جسم کو جان بنا دیتی ہے،

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نہ رسد — کفر آوردم و در عشق تو ایمان کردم

فانی کو قدرت نے بے شبہہ شاعرانہ دل و دماغ عطا کیا تھا، ان کی نگاہ بھی سطحی اور عامیانہ نہ تھی، لیکن ان کی سب سے بڑی بدنصیبی لکھنؤ کا قیام تھا، جس کی وجہ سے اُن کے قالبِ سخن مین زندگی کی روح پیدا نہ ہوسکی، اور گریہ وزاری مین وہ اس طرح محو ہوئے کہ ان کو عشق کی سرور آفرینیون کا کبھی خیال تک نہ آیا، چنانچہ اُن کی غزلون میں لکھنویت کا یہ رنگ نمایان طور پر نظر آتا ہے،

اہلِ لکھنؤ کی طرح اُن کے نزدیک بھی عشق ایک مرض ہے، جس سے بچنے کے لئے دست بدعا ہین،

عشق اللہ بچائے وہ مرض ہے فانی — زہر بیمار کو دیتے ہین دوا کے بدلے

ظاہر ہے کہ جب ایک شخص عشق کو مرض سمجھ رہا ہے، تو وہ کیونکر اس کے درد و غم کی تلخی کو خندہ پیشانی کے ساتھ گوارا کرسکتا ہے؟ یہ اسی نقطۂ نظر کا نتیجہ ہے، کہ فانی کو کبھی رونے سے فرصت نہین ملتی، اور ہمیشہ ان کو موت کی آرزو رہتی ہے،

سوزِ عشق اربابِ حال کے نزدیک انوارِ روحانی کا سرچشمہ ہے، چنانچہ ایک محرم اسرار ان الفاظ مین اس کا خیر مقدم کرتا ہے،

تو نے یہ اعجاز کیا اے سوزِ پنہان کردیا — اس طرح پھونکا کہ آخر جسم کو جان کردیا (اصغر)

لیکن فانی کے دل سے اس شعلۂ جان پرور کے لئے بجائے آفرین کے بددعا نکلتی ہے،

آپ ہم اپنی آگ میں اے غمِ عشق جل بجھے — آگ لگے اس آگ کو پھونک دیا جلا دیا

دردِ عشق اہلِ نظر کی نگاہ میں سراپا ذوق و لذت ہے لیکن فانی اس سے بھی پناہ مانگتے ہین، اور اپنی مایوسی اور عجز و بیکسی کا اظہار ان الفاظ مین کرتے ہین :-

اے دردِ عشق اب تو خدا کے لئے نہ چھیڑ — دل مین کراہنے کی بھی طاقت نہین رہی

کیا عشق کی ہمت و غیرت کا یہی تقاضا ہے؟

محبت ہر رگ وپے مین زندگی کی روح بھر دیتی ہے، لیکن فانی کے ساتھ اس کا یہ حال ہے،

مری اک عمر فانی نزع کے عالم مین گذری ہے — محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسون

لیکن ہمارے نزدیک رگون سے لہو کھینچنا محبت کا کام نہین ہوسکتا، یہ تو مرض کا کام ہے، کہ اندر ہی اندر تمام رگون سے خون جذب کرکے بیمار کو نزع کے عالم مین پہنچا دے،

ظاہر ہے کہ ایک شخص جس کی زندگی عالم نزع مین گذر رہی ہو، اور جو ہر وقت پیام اجل کا منتظر ہو، یقیناً تجہیز و تکفین

کا سامان بھی مہیا رکھے گا، چنانچہ جنازہ، میت، کفن، لحد، مزار، شمع، وغیرہ ان چیزون کی فانی کے یہاں کوئی کمی نہیں، چند اشعار نمونۃً ملاحظہ ہون

کفن اسے گرد لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے | آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کے بدلے
اب آگئے ہو تو اور اک ذرا ٹھہر جاؤ | ابھی ابھی مری میت اٹھائی جاتی ہے
آئی ہے اے نسیم تو اس وقت تک ٹھہر | جب تک بجھے چراغ ہمارے مزار کا
لئے جاتے ہین، جنازہ ترے دیوانے کا | ہڈیان ہین کئی لپٹی ہوئی زنجیرون مین

غرض اس قسم کے اشعار اس مجموعہ مین بکثرت نظر آتے ہین، جن کی بنا پر کہا جاتا ہے، کہ فانی کے کلام مین درد بہت ہے اور وہ فلسفۂ غم کے بہت بڑے نکتہ شناس ہین، لیکن افسوس ہو کہ ان کے کلام سے ہم کو اس کا بہت کم ثبوت ملتا ہے، اگر درد و غم صرف گریہ وزاری اور سینہ کوبی کا نام ہے، اور یہ کوئی فن ہے، تو بے شبہہ ہم فانی کو اس کا امام تسلیم کرتے ہین لیکن سوال یہ ہے، کہ عشق کے درد و غم کو ان چیزون سے واقعی کوئی نسبت بھی ہے کہ نہین؟ اگر یہ اصول مان لیا جائے، تو پھر غزل گوئی اور سوز خوانی مین کیا فرق رہ جاتا ہے، اور پھر مرثیہ سے کیا کام لیا جا سکتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ عشق کا درد و غم نوحہ گرون کی آہ و بکا کا نام نہین، بلکہ وہ قلب انسانی کی ایک لطیف و پرسوز کیفیت ہے، جو کبھی کبھی آنکھون کو پرنم ضرور بنا دیتی ہے، لیکن اسی کے ساتھ روح مین اتنی استعداد و صلاحیت بھی پیدا کر دیتی ہے، کہ زبان آہ و شیون سے آلودہ نہین ہونے پاتی، بلکہ چہرہ پر انتہائی اضطراب کے عالم مین بھی ایک لطیف موج تبسم رقص کرتی رہتی ہے، یہ اسی استعداد و صلاحیت کے نقدان کا نتیجہ ہے، کہ عام غزل گو شعراء کو درد و غم مین کوئی لذت محسوس نہ ہو سکی، اور عشق و محبت کی حقیقی شان خاک مین مل کر رہ گئی،

اس مین شبہہ نہین کہ ایک دردمند دل کو کبھی ایسی بھی محبت کی ٹھیس لگتی ہے، کہ بے اختیار آنکھون سے آنسو ٹپک پڑتے ہین، لیکن ان آنسوؤن کا رنگ زرد نہین ہوتا، بلکہ اُن مین "ستارۂ سحری" کی چمک ہوتی ہے، فانی کے اشک غم مین ہم نے ستارۂ سحری کی جھلک کی بہت تلاش کی، لیکن افسوس ہو کہ یہان بھی وہی زردی کا عالم نظر آتا ہے،

رنگ اشکوں کا زرد رہتا ہو | جانے دل کے لہو پہ کیا گذری

کیا اشکوں کی زردی اس بات کی دلیل نہین کہ رونے والا کسی نہ کسی مادی مرض مین مبتلا ہے؟ ممکن ہے کہ عقیدت مند نگاہون کو یہ زرد آنسو خوشنما معلوم ہوتے ہون، لیکن ہماری نگاہین تو سرشک شوق کے اسی قطرۂ ناچیز کو ڈھونڈتی ہین، جو کبھی جوش کے عالم مین اچھل کر بحر بیکران بنجاتا ہے، اور کبھی ستارۂ سحری بن کر مژہ پر چمکنے لگتا ہے، اور کبھی جس سے پھولون کی ریزش ہونے لگتی ہے۔

اچھالنا تھا کہ اک بحر بے کنار ہوا | سرشک شوق کا وہ ایک قطرۂ ناچیز
چمک رہا ہے مژہ پر ستارۂ سحری | جو مجھ پہ گذری ہے شب بھر ڈو دیکھ لے ہمدم
اب ٹپکتا نہین آنکھون سے گلستان کوئی | دل مین اک بوند لہو کی نہین ہونا کیا (اصغر)

غرض چشم عاشق کا اشک غم زہراب کا قطرہ نہین جس سے بیمار کا بستر زرد ہو جاتا ہے،

بستر ترے مریض کا دیکھا تو زرد تھا | زہرآب چشم کا کوئی قطرہ گرا تھا کیا (عزیز لکھنوی)

بلکہ وہ مجسم ایک رشحۂ انوار ہے جس کی تر دستیون سے قلب و روح کا چمن زار دفعۃً لہلہا اٹھتا ہے لیکن اس لطیف

حقیقت کو سمجھنے کے لئے اربابِ نظر کی ضرورت ہے،

اشکِ پیہم کو سمجھ لیتے ہین اربابِ نظر حسن تیرا مرے چہرے سے جھلکتا دیکھیں (اصغر)

اشکِ غم کی موجون مین حُسنِ یار کی تابانیون کا منظر پیش کرنا معتوریا سیات کے بس کی چیز نہین، یہ صلاحیت بزمِ محبت کی انھی محرمانِ خاص کو نصیب ہوسکتی ہے، جنھون نے اہلِ ذوق کو زندگی کا یہ پُراسرار پیام دیا ہو،

اضطرابِ غم سے ہو نشوونماے زندگی ہر نفس مین ایک تازہ درد پیدا کیجئے (اصغر)

یا جو حیاتِ تازہ کی رنگینیون کی بقا کے لئے مرحلۂ غم کی درازی کی آرزو کر سکتے ہون،

حیاتِ تازہ کی رنگینیان نہ مٹ جائین ابھی یہ مرحلۂ غم دراز رہنے دے (")

لیکن فانی کے دلِ مایوس کو صرف اجل ہی سے آسایش و راحت کی امید ہے،

اجل سے ہے دلِ مایوس کو امیدِ آسایش مری ڈوبی ہوئی کشتی کو ساحل کی تمنا ہو

وہ موت سے بغیر تقاضا کئے رہ نہین سکتے، کیونکہ وہ غم سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہین، اور یہ آرزو صرف اس لئے ہو کہ ان کو غم مین روح کی تازگی اور سرمستی کا کوئی سامان نظر نہین آتا،

گذرے گی اب نہ غم کا مداوا کئے بغیر بنتی نہین اجل سے تقاضا کئے بغیر

جلوہ گاہ بہار کی رنگینیان افسردہ سے افسردہ دل کو بھی تھوڑی دیر کے لئے جوشِ نشاط سے معمور کر دیتی ہین لیکن فانی کے مایوس دل و دماغ کو اس مین بوے کفن ہی محسوس ہوتی ہے،

چمن سے رخصت فانی قریب ہو شاید کہ اب کے بوے کفن دامنِ بہار مین ہو

لیکن ایک سرور آفرین نگاہ کو بہار مین جو کیفیت نظر آتی ہے، اس کی تصویر یہ ہے،

کیا مستیان چمن مین ہین جوشِ بہار سے ہر شاخِ گل ہے ہاتھ مین ساغر لئے ہوئے (اصغر)

دردمندانِ محبت کے دیدۂ و دلِ ذوقِ تصور مین انوارِ حیات سے چمک اٹھتے ہین، لیکن فانی اس عالم مین بھی قلب و جگر کی تربت پر فاتحہ خوانی ہی کرتے ہوئے نظر آتے ہین،

اٹھا ہاتھ اے تصور فاتحہ کو یہ دل کی ہے وہ تربت ہے جگر کی

عشق کی بزمِ سوز و تجلی مین فاتحہ خوانی کے لئے ہاتھ اٹھانا کس حد تک جائز ہو سکتا ہے، اس کا فیصلہ ہم ناظرین کے ذوقِ سلیم پر چھوڑتے ہین، یہ شعر اگر ایک سوز خوان کی زبان سے نکلتا، تو بے شبہہ ہم کو اعتراض کا حق نہ تھا، لیکن قلب و جگر کے مدفن پر فاتحہ خوانی دردِ محبت کے لذت شناسون کا ہرگز شیوہ نہین ہو سکتا،

دلِ عشق کے سوز و تپش سے فیضیاب ہو کر زندگی کی ایک موجِ شرر فشان بن جاتا ہے، لیکن فانی کے غم کدہ مین پہنچکر اس کی حیثیت صرف ایک مردہ لاش کی رہ جاتی ہے،

مرحوم کس ادا کے تماشائیون مین تھا پھرتی ہے دل کی لاش تماشا بنی ہوئی

جس کے ذوقِ محبت کی استعداد و صلاحیت کا یہ عالم ہو، کہ دل بجاے گرم و منور اور مست و بیدار ہونے کے جسدِ بے روح بن کر رہ جائے، اور اس کو مرحوم کے لقب سے یاد کیا جائے، وہ جمالِ یار کی برق افگنی کا کیونکر تحمل کر سکتا ہے؟ اور اس کو یہ لطیف حقیقت کیونکر سمجھائی جا سکتی ہے،؟

مزہ الم ہی میں ہے کچھ لطف خستگی میں ہے غرض کہ نشو و نما روح کی اسی میں ہے (اصغر)

دردِ فراق کا تحمل اور اس سے کیف اندوز ہونا عشق کی روحانی استعداد اور بلند نظری کا بہت بڑا نشان ہے، چنانچہ اس عالم میں بھی اربابِ حال پر ذوق و وجد ہی کی کیفیت طاری رہتی ہے، اور وہ محبوب کی یاد میں اس طرح محو ہو جاتے ہیں اور ان کو کچھ ایسی لذت ملنے لگتی ہے، کہ ان کے دماغ سے شبِ فرقت کی سحر کا تخیل بالکل جاتا رہتا ہے، اور حقیقت بھی یہی ہے کہ عشق جو ایک ذوقِ لاانتہا، کا نام ہے، دراصل اس کی شبِ غم کی کوئی سحر نہیں، اس بنا پر اہلِ دل کی زبان دردِ ہجر کے شکوؤن سے کبھی آلودہ نہیں ہوتی، بلکہ اس سے ہمیشہ صدائے آفرین ہی نکلتی رہتی ہے، اور ہر ہر قدم پر روحانی ذوق و لذت کا سامان بڑھتا چلا جاتا ہے، یہان تک کہ دردِ مہجوری ہی میں قرب کی دولت ہاتھ آجاتی ہے، یہ اسی روحانی صلاحیت کے نقدان کا نتیجہ ہے کہ عام غزل گو شعرا شبِ ہجر میں اس زور شور کے ساتھ آہ و بکا اور نالہ و فریاد کرتے ہیں، کہ ہمسایون کی نیند حرام ہو جاتی ہے اور سننے والے دعا کرنے لگتے ہیں، کہ کسی طرح ان مصیبت زدون کی رات کٹ جائے،

ہجر کی شب نالۂ دل یون صدا دینے لگے سننے والے رات کٹنے کی دعا دینے لگے (ثاقب لکھنوی)

لیکن ایک طالبِ صادق جو ہر وقت محبوب کے ذوقِ تصوّر سے مست رہتا ہے، اس کو شبِ ہجران کی کیفیت کبھی محسوس نہیں ہوتی،

ہر حال میں بس پیشِ نظر ہے وہی صورت میں نے کبھی روے شبِ ہجران نہیں دیکھا (اصغر)

حقیقت یہ ہے کہ شبِ ہجر کا تخیل اربابِ ہوس کی ایجاد ہے، ان کا منظورِ نظر صرف شاہدِ بازاری ہوتا ہے، جو ہاتھ آسکتا ہے، اس لئے قدرتی طور پر دل میں اس کے وصل اور ہم آغوشی کی مادی خواہش پیدا ہوتی ہے، اور جب یہ خواہش پوری نہیں ہوتی، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے، کہ بے چینی اور کرب کے عالم میں رات کٹنے کی دعائین مانگی جاتی ہیں، لیکن محرمانِ خاص کی چشم و نگاہ کا محبوب حسن و جمال کا وہ پیکرِ لطیف ہے، جو نگاہون کو مجسم شکل میں کبھی نظر نہیں آسکتا، اس لئے اہلِ ہوس کی طرح ان کے دل میں وصل کی کوئی تمنا پیدا نہیں ہوسکتی، اس کے تصور کی لذت ہی ان کے دل و دماغ کے سرور و نشاط کے لئے کافی ہے، وہ اسی کو اپنے ذوقِ آرزو کی معراج سمجھتے ہیں، اس لئے ان کے عمکدۂ محبت میں شکوہ و شکایت اور فریاد و ماتم کی کوئی گنجایش نہیں

افسوس ہے کہ فانی کی یاس پرست طبیعت دردِ فراق کی لذتون کے احساس سے محروم ہے، ان کی شبِ فرقت جس طرح بسر ہوتی ۔۔۔ اس کی کیفیت خود ان کی زبان سے سنو،

شبِ فرقت میں ہم ہر سانس سے یہ پوچھ لیتے ہیں جگر تو خیریت سے ہے، مزاجِ دل تو اچھا ہے

شبِ فراق کی لذتِ الم سے لطف اندوزی کے بجائے قلب و جگر کی خیریت مزاج دریافت کرتے رہنا کیا اس امر کی دلیل نہیں ہے، کہ شاعر محبوب کے ذوقِ تصور کی وارفتگی سے ناآشنا ہے؟ محبوب کی یاد تو وہ ابدی لذت ہے جس کے سامنے عاشق خود اپنی ہستی، اور کائناتِ ارضی کی تمام رنگینیون کو بھول جاتا ہے، جگر نے کیا خوب کہا ہے،

آئی جو اس کی یاد تو آتی چلی گئی ہر نقشِ ماسوا کو مٹاتی چلی گئی

لیکن فانی کو باوجود ادعاے محبت کے صرف اپنے قلب و جگر کی فکر دامنگیر رہی ہے، جو عشق کی شانِ ایثار و بیخودی کے بالکل منافی ہے، اگر قلب و جگر میں محبوب کی یاد ہے تو پھر ان کو تو ایک کیفِ مستقل، ایک سرورِ دائمی ایک نشاطِ ابدی کا

ساماں ہاتھ آگیا ہے، وہ زندہ ہیں، اور ہمیشہ زندہ رہیں گے، ان کی خیریت دریافت کرنے کی ضرورت نہیں، خیریت تو ان لوگوں کی دریافت کی جاتی ہے، جو کسی مہلک مرض میں مبتلا ہوں،

شبِ فرقت میں فانی کے ذوق و شوق کا یہ عالم ہے کہ وہ دست بدعا ہیں، کہ یا تو کسی طرح جلوۂ سحر نمودار ہو، اور یہ نہ ہو تو پھر موت ہی آ جائے،

میں دعا موت کی مانگوں تو اثر پیدا کر — ورنہ یارب شبِ فرقت کی سحر پیدا کر

یعنی خلاصہ یہ کہ کسی طرح اس مصیبت عظمیٰ سے نجات مل جائے، لیکن جب اس قید سے رہائی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی، تو مجبوراً جان دے کر ان تمام جھگڑوں کا خاتمہ کر دیتے ہیں،

ہم اپنے جی سے گذرے یوں سحر کی — شبِ غم بڑھ چلی تھی مختصر کی

لیکن افسوس یہ نہ سمجھے کہ شبِ غم کی درازی ہی میں اربابِ حال کے لئے زندگی کی سرمستیوں کا راز پوشیدہ ہے، چنانچہ درد کے کم ہونے پر ایک وارفتۂ محبت کی زبان سے بے اختیار صدائے افسوس نکل جاتی ہے،

کہاں وہ زیست کی لذت کہ درد بھی کم ہے (اصغر)

شبِ ہجر میں فانی اپنی ہمت اور بلند حوصلگی کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں :-

شام سے فکرِ صبح کیا شبِ ہجر — مر رہیں گے اگر سحر نہ ہوئی

شامِ فراق تو فانی کے لئے ایک بلا تھی ہی، روزِ فرقت بھی تاریکی سے خالی نہیں،

ظلمت افزا ہے ظہورِ خورشید — روزِ فرقت کی سیاہی کو نہ پوچھ

لیکن ایسی چشمِ بصیرت کو کیا کہا جائے، جس کو خورشید عالمتاب کی شعاعیں بھی منور نہیں کر سکتیں، بلکہ اس کو اور تیرہ و تار بنا دیتی ہیں، ! کیا یہ روح کے اضمحلال و افسردگی کی انتہا نہیں ہے ؟ کیا اسی ذوق نظر سے محبوب کی برقِ ستم کا ناز اٹھ سکتا ہے ؟

دردِ فراق کی شدت فانی کے مرضِ عشق کے کرب و تکلیف کو اس حد تک پہنچا دیتی ہے، کہ احباب تسلی دینے اور چارہ گر دوائیں لے کر آتے ہیں،

دوست تسلی دینے آئے لے کے دوائیں چارہ گر آیا — لیجئے آئی زخمِ جگر پر اور اک تازہ آفتِ مرہم

چارہ گر، دوا، مرہم، احباب کی عیادت وغیرہ کی جس کو ضرورت ہو، اس کی سمجھ میں یہ حقیقت کیونکر آ سکتی ہے، دردِ عشق کوئی مرض نہیں، جس کے علاج کے لئے خارجی وسائل کی تلاش کی جائے، بلکہ وہ خود تمام روحانی علتوں کا علاج ہے، اس کو اپنے زخمِ جگر کے لئے مرہم کی ضرورت نہیں، وہ اسی کو قلب و روح کی سیرابی اور تازگی کا سامان سمجھتا ہے، چنانچہ پیکانِ یار کی چوٹیں کھا کر وہ بجائے آہ و فریاد کے اپنے جوشِ سپاس کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے،

کیا کہئے جاں نوازیِ پیکانِ یار کو — سیراب کر دیا دلِ منت گذار کو (اصغر)

وہ زندگی کی مشکلات میں دوسروں کی نگاہِ کرم کا محتاج نہیں، بلکہ وہ خود آپ اپنا مشکل کشا ہے، اس کو کسی رہبر کی اعانت مطلوب نہیں، وہ خود اپنے سوزِ دل کی روشنی میں منزلِ مقصود کا پتہ لگا لیتا ہے، اس کی فطرت میں خود دستی کا وہ سیلاب پنہاں ہے، جس کی رو ہر سنگِ راہ کو خس و خاشاک کی طرح بہا لیجاتی ہے،

دو دش بہ راہ بہرہ نداد ہ یگانہ طے کند می نہد بدست کس عشق زمام خویش را (اقبال)

لیکن فانی کی نگاہ یاس ہر وقت چارہ گرون ہی کی طرف لگی رہتی ہے، مگر مریض کی حالت کو دیکھ کر وہ بالآخر زار زار رونے لگتا ہے،

نازک ہے آج حالت شاید مریضِ غم کی کیا چارہ گر نے سمجھا کیون زار زار رو دیا

اور باوجود غریب چارہ سازون کی انتہائی کوشش کے شفا نصیب نہین ہوتی،

مضمحل سعی چارہ گر نہ ہوئی اور شفا قصہ مختصر نہ ہوئی،

لیکن کوئی علاج کیا کرے، جب ان کے بستر علالت سے دھنوان ہی دھنوان اٹھ رہا ہو،

نالہ کیا ہان اک دھنوان سا شام ہجر بستر بجا دسے اٹھا کیا

ایسے مریض کا علاج بجز موت کے اور کیا ہو سکتا ہے، چنانچہ خود فرماتے ہین:

اس درد کا علاج اجل کے سوا بھی ہے کیون چارہ ساز تجھ کو امید شفا بھی ہے

لیکن اس حقیقت کو نہ سمجھے کہ درد و غم کا علاج خود اس کی لذت ہے، اور وہ آہ جو اثر کے لئے کی جائے، عشق کے لئے ننگ ہے،

ہمارے درد والم درد و غم کی لذت ہے (اصغر) وہ ننگِ عشق ہے، جو آہ ہو اثر کے لئے (باقی)

سلسلۂ سیر الصحابہؓ

جلد اول خلفائے راشدین | اس مین خلفائے راشدین کے ذاتی حالات فضائل مذہبی اور سیاسی کارنامون اور فتوحات کا مفصل بیان ہے قیمت

جلد دوم مہاجرین اول | اس مین خلفائے راشدین کے علاوہ بقیہ حضرات عشرہ مبشرہ اکابر بنی ہاشم و قریش اور ان صحابہ کے سوانح اخلاق اور فضائل کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے، شروع مین ایک مفصل مقدمہ مین قریش کی تاریخ بیان کی گئی ہے، قیمت

جلد سوم مہاجرین دوم | اس مین بھی ان صحابہ کرام کے حالات جمع کئے گئے ہین جو فتح مکہ سے پہلے اسلام لائے اور ہجرت کی،

جلد چہارم سیر انصار اول | انصار کرام کی مستند سوانح عمریان اور ان کے اخلاقی اور مذہبی کارنامے بہ ترتیب حروف تہجی لکھے گئے ہین

جلد پنجم سیر انصار دوم | جس مین بقیہ انصار کرام کے حالات زندگی اور ان کے اخلاقی و مذہبی کارنامے درج ہین،

جلد ششم سیر الصحابہ ششم | اس مین عہد صحابہ کی چار اہم ہستیون حضرت حسنینؓ امیر معاویہؓ اور عبد اللہ بن زبیرؓ کے مفصل حالات و سوانح اخلاق و فضائل اور ان کے مذہبی اخلاقی اور سیاسی مجاہدات اور کارنامون اور ان کے باہمی سیاسی اختلافات کی تفصیل ہے، واقعۂ کربلا اور امیر معاویہؓ کے متعلق اردو مین اس سے زیادہ مستند اور تفصیلی حالات نہین مل سکتے، قیمت:

جلد ہفتم سیر الصحابہ ہفتم | یہ جلد سیر الصحابہ کی آخری کڑی ہے اس میں ایسے ۱۵۰ صحابہ کے حالات ہیں جو فتح مکہ کے بعد مشرف بہ اسلام ہوئے یا اس سے پہلے اسلام قبول کر چکے تھے، مگر شرف ہجرت سے محروم رہے، یا سنہ ہجرت کے کچھ قبل یا بعد پیدا ہوئے وغیرہ قیمت

جلد ہشتم سیر الصحابیات | ازواج مطہرات بنات طاہرات اور عام صحابیات کی سوانح عمریان، اور ان کے علمی اور اخلاقی کارنامے،

جلد نہم اسوۂ صحابہؓ اول | حضرات صحابہ کے عقائد عبادات اخلاق اور معاشرت کی صحیح تصویر اور قرونِ اولی کے اسلام کا عملی خاکہ

جلد دہم اسوۂ صحابہؓ دوم | صحابہ کرام کے سیاسی انتظامی اور علمی کارنامون کی تفصیل،

قیمت مکمل سٹ دس جلد

"مینجر"

سوزنی

جناب غلام مصطفےٰ خان صاحب ایم اے ایل ایل بی (علیگ) لکچرر کنگ ایڈورڈ کالج، امراؤتی (برار)

فارسی کے ہجو نگار شاعر سوزنی کے متعلق ہماری معلومات محدود ہین، کیونکہ وہ ایک ایسے عہد سے تعلق رکھتا ہے، جس کو بارتھولڈ (ترکستان - ص ۳۰) بھی اسلامی تاریخ کے تاریک ترین صفحات" سے تعبیر کرتا ہے، لیکن ہم نے کوشش کی ہے کہ اُس کے کلام سے جو حبیب گنج لائبریری مین محفوظ ہے، کچھ معلومات حاصل کرکے تاریخ کی اس تاریکی پر روشنی ڈالی جائے،

شاعر کے قیام کے دو مقام تھے، سمرقند اور بخارا، جو ماوراء النہر کے علاقے مین خاص اہمیت رکھتے تھے، یہ علاقہ ۴۴۱ھ/۱۰۴۹ء[1] مین چغری بیگ بن میکائیل بن سلجوق[2] (المتوفی ۴۵۲ھ/۱۰۶۰ء) کے ہاتھون سلجوقی حکومت کے زیر نگین ہوا، لیکن مقامی طاقت پھر بڑھ گئی، اور جیسا کہ تاریخ بخارا[3] (ص ۲۵) سے معلوم ہوتا ہے، ابراہیم طمغاج خان اور اس کے بعد اوس کا لڑکا نصر خان (ممدوح عمعق بخاری لباب ج ۲ ص ۱۸۸-۱۹۰) حاکم ہوا، موخر الذکر کے بعد خضر خان، جو اُسی کا چھوٹا بھائی تھا، حکومت کرنے لگا، پھر جب اوس کے لڑکے احمد خان (المتوفی ۴۸۸ھ/۱۰۹۵ء) کی حکومت شروع ہوئی تو اوس نے سلجوقی سلطنت سے بغاوت کی، چنانچہ ملک شاہ سلجوقی (م ۴۸۶ھ/۱۰۹۳ء) نے ۴۷۱ھ/۱۰۷۸-۹ء مین اوس پر حملہ کیا، اور اسے گرفتار کرکے خراسان مین کچھ عرصے تک رکھا، لیکن بعد مین معاف کر دیا، اور دوبارہ ماوراء النہر کی حکومت اُس کے سپرد کر دی، اس احمد خان[4] یا سلیمان خان کے متعلق کچھ اور علم نہین، اسی طرح اس کے لڑکے ارسلان خان محمد کے حالات بھی پردۂ خفا مین ہین، لیکن تاریخ بخارا (ص ۶۱ س ۸ ص ۶۲، س ۱۰) سے اتنا معلوم ہوتا ہے، کہ اوس نے ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء مین بخارا مین جامع مسجد بنوائی، اور ۵۱۷ھ/۱۱۲۳ء مین منبر و محراب وغیرہ بنوائے، اسی تاریخ (ص ۳۰-س ۶-۷) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ۵۲۲ھ/۱۱۲۸ء (جب کہ ابو نصر احمد بن محمد نے اس تاریخ کا عربی سے فارسی مین ترجمہ کیا) کے چند سال قبل اسی ارسلان خان محمد نے بخارا کے ویران قلعے کو آباد کرنے کا حکم دیا تھا، ان سنین کے بعد اس حاکم کے متعلق تاریخین پھر خاموش ہین،

۵۲۴ھ/۱۱۳۰ء سے ۵۲۶ھ/۱۱۳۲ء تک[5] سمرقند کا حاکم قلیج طمغاج حسن[6] بن عبد المومن المعروف بہ "حسن تگین" تھا، اور بخارا کا حاکم ۵۳۴ھ/۱۱۴۰ء مین امیر زنگی علی خلیفہ پایا جاتا ہے، جو سنجر سلجوقی (م ۵۵۲ھ/۱۱۵۷ء) کا باج گذار تھا، اور اسی وجہ سے اُس سال خوارزم شاہ نے

---

[1] تاریخ ماوراء النہر از محمد تقی خان حکیم ص ۲، ممبئی ۱۳۱۱ھ [2] اخبار الدولة السلجوقیة (ص ۲۹ لاہور ۱۹۳۳ء) سے معلوم ہوتا ہے کہ چغری بیگ کی وفات ۴۵۲ھ مین ہوئی لیکن روضۃ الصفا (ج ۴-ص ۱۲۴-لکھنؤ ۱۹۱۵ء) مین اس کے لڑکے قاورد کی تخت نشینی جو اس کے انتقال پر ہوئی ۴۵۱ھ مین بتائی گئی ہے [3] تاریخ بخارا دراصل ابوبکر محمد بن جعفر (م ۳۴۸ھ/۹۵۹ء) کی عربی تالیف ہے، اس کا فارسی ترجمہ ابو نصر احمد بن محمد نے ۵۲۲ھ/۱۱۲۸ء مین کیا، پھر ۵۷۴ھ/۱۱۷۸ء مین محمد بن زُفر نے اس کو ملخص کیا، اب مفید حواشی کے ساتھ یہ کتاب ایران سے شائع ہوئی

[4] تاریخ مذکور (ص ۲۰۶، س ۱-۳) سے ظاہر ہے کہ وہ احمد خان تھا جس پر ملک شاہ نے حملہ کیا تھا لیکن روضۃ الصفا (جلد ۴ ص ۱۰۰) مین منقول ہو کہ سلیمان خان پر حملہ ہوا تھا، میرا خیال ہو کہ یہ دونون نام ایک ہی شخص کے ہین، اور پورا نام سلیمان خان احمد ہوگا جس طرح کہ اس کے لڑکے کا نام ارسلان خان محمد تھا [5] لباب الالباب ج ۱ ص ۲۰۵ [6] غالباً اسی طمغاج خان کے وزیر علی (جس سے خطیبی خاندان قائم ہوا)

حملہ کرکے اُسے قتل کردیا تھا[۱]، اس کے دو سال بعد یعنی ۵۳۶ھ؁ / ۱۱۴۱ء میں گورخان ختائی نے سنجر کو شکست دی، اور بخارا کے بعض جلیل القدر علماء و امراء مثلاً حسام الدین عمر بن عبدالعزیز بن مازہ کو قتل کردیا، اور الپ تگین کو وہاں کا حاکم مقرر کیا[۲]، گورخان کے انتقال کے ایک سال بعد یعنی ۵۳۸ھ؁ / ۱۱۴۴ء میں غز ترکوں نے بخارا پر حملہ کیا، اور وہاں کے امراء قراچہ بیگ اور عین الدولہ کو قید کرلیا، اور شہاب وزیر کو قتل کردیا[۳]، ان ترکوں کی طاقت اسی واقعہ کے بعد بڑھنے لگی حتیٰ کہ انھوں نے ۵۴۸ھ؁ / ۱۱۵۳ء کے آخر میں جیسا کہ مشہور ہے، سنجر ہی کو قید کرلیا، اس غیر متوقع شکست سے سلجوقی طاقت کا شیرازہ بالکل بکھر گیا، اور ہم دیکھتے ہیں کہ ان لوگوں نے خراسان میں بھی اپنا تسلط قائم کرکے مختلف امراء کے تحت حکومت کی، ان کے متعلق معارف (بابت ستمبر، اکتوبر ۱۹۴۲ء) میں انوری کے سلسلے میں ہم کچھ تفصیل دے چکے ہیں،

۵۵۹ھ؁ / ۱۱۶۴ء میں ترکوں کے ایک دوسرے گروہ قرلق نے بخارا پر حملہ کیا، لیکن ختائی حاکم چغری خان بن حسن تگین کی مدد سے شمس الدین محمد بن حسام الدین عمر نے ان کو پسپا کردیا[۴]، غالباً یہی چغری بیگ (یا اس کا بھائی ؟) تھا جو رکن الدین مسعود کے نام سے مشہور ہے، اور جس نے ۵۶۰ھ؁ / ۱۱۶۵ء میں بخارا میں ایک نیا ربض بنوایا تھا[۵]، اس کے بعد ایک عرصہ تک پھر تاریخ ہماری رہبری نہیں کرتی، آخر کار عوفی[۶] سے معلوم ہوتا ہے، کہ قلیج طمغاج خان ابراہیم بن حسین ۵۹۷ھ؁ / ۱۲۰۱ء میں ماوراء النہر کا حاکم تھا، اور مرزا قزوینی کا خیال ہے، کہ اُس کا انتقال ۶۰۰ھ؁ / ۱۲۰۴ء میں ہوا، اور اس کا لڑکا ارسلان خان عثمان ۶۰۹ھ؁ / ۱۲۱۲ء میں قتل ہوا، یہ ایلک خانی سلسلے کا آخری حاکم تھا، ان مختصر حالات سے جو سوزنی کے عہد کے متعلق ہمیں معلوم ہوتے ہیں کسی قدر ہماری رہبری ہوگی، چنانچہ اب ہم اُس کے کلام کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، جو حبیب گنج میں محفوظ ہے،

سوزنی کا قدیم ترین قصیدہ ارسلان خان محمد بن سلیمان کی مدح میں ملتا ہے، جو چھٹی صدی ہجری کے پہلے ربع میں بخارا کا حاکم تھا، اُس کا اور اس کے وزیر سعد الملک کا تذکرہ ان اشعار میں ہے :-

وزیر شاہ بہ دیدار پہلوان بہ عروش	گرفت داد بہ پیمان دوستی دل و ہوش
بہ موسم گل و بلبل ز جام و بلبلہ کرد	شراب گلگون از جام گلعذاران نوش
ہمہ سعادت دستور شاہ سعد الملک	ہمہ سلامت ایام پہلوان بہ عروش

(بقیہ حاشیہ ص ۶۷) کے متعلق عثمان مختاری (المتوفی ۵۴۴ھ؁ / ۱۱۴۹ء یا ۵۵۴ھ؁ / ۱۱۵۹ء) کے دیوان مخطوطہ بانکی پور (ورق ۱۲۶ ب - ۱۳۰) میں یہ اشعار ملتے ہیں :- خدائے داد دو ملک تمام را دو نظام

(خدائے داد دو ملک تمام را دو نظام)	یکے جلال وزیران یکے رضی امام
یکے بہ خدمت سلجوقیان رسیدہ بہ فر	یکے بہ دولت طمغاج خان سیدہ بکام
ہمیشہ ملک خراسان بر آن مقوم بود	چنان کہ ملک سمرقند ازین گرفتہ قوام
ہمہ جلال خراسان و ماوراء النہر	ز بو علی بنظام آمد و علی نظام
بدان ستودہ ہمہ دودہ سحاقی فخر	وزین گرفتہ ہمہ گوہر خطیبی نام

ان اشعار میں ملک شاہ سلجوقی کے مشہور وزیر نظام الملک ابو علی حسن بن علی بن اسحٰق اور سمرقند کے وزیر علی کا ذکر ہے،

[۱] تاریخ بخارا ص ۳۰، [۲] ص ۵، [۳] ص ۳۰، [۴] لباب جلد ۱ ص ۲۳۲، [۵] تاریخ بخارا ص ۲۲، [۶] لباب جلد ۱ ص ۴۴، [۷] رض مرزا قزوینی نے ارسلان خان عثمان کے قتل کی تاریخ میں ۶۰۹ھ؁ / ۱۲۱۲ء بتایا ہے لیکن تاریخ بخارا (ص ۱۳) میں لکھا ہے کہ محمد خوارزم شاہ نے بخارا پر ۶۰۶ھ؁ / ۱۲۰۹ء میں قبضہ کیا جس سے ایلک خانی حکومت ختم ہوئی، اور ۶۱۶ھ؁ / ۱۲۱۹ء میں چنگیز خان نے بخارا کو ویران کیا،

بہ قہرِ دشمنِ خاقان شہِ سلیمان فر کشید صف صف اہرمنانِ آہن پوش
محمد ابن سلیمان کہ چون سلیمان وار مسخر اند ورا جن وانس (طیر) و وحوش
زادو زکند می آمد کہ فتح نامہ رسید بدست پیک سلیمان زادو زکند بہ اوش

پھر حسام الدین عمر (بن برہان الدین عبد العزیز بن مازہ) کی مدح میں ایک قصیدہ ملتا ہے جس میں اُسے (سنجر کا ؟) سپہ سالار کہا گیا ہے، دو شعر یہ ہیں،

حسام الدین والدنیا سپہ سالار ترکستان کہ در (لشکر ؟) تو ئی بے شک زایران رستم دستان
سمرقندی بہ عدلِ تو بہ ترکستان چنان دانم کہ ترکستان سمرقند و سمرقندست ترکستان

ہم دیکھ چکے ہین کہ اس حسام الدین کا قتل ۵۳۶ھ/۱۱۴۲ء مین ہوا تھا، اس کے بعد اس کا لڑکا شمس الدین محمد بخارا کی حکومت کے لئے خطائی سلطان کی طرف سے مقرر کیا گیا تھا، اور وہ ۵۵۹ھ/۱۱۶۴ء تک ضرور زندہ تھا، جب کہ اوس نے قرلق ترکون کو پسپا کیا تھا، اوس کی اور اس کے امیر جعفری خان بن حسن تگین" کی مدح مین بھی سوزنی کا ایک قصیدہ ملتا ہے، جو لباب الالباب (جلد ۲ ص ۲۲۲) مین منقول ہے :-

شاہ جہان بہ صدر جہان شاد و خرم است جاوید بادشاہ بہ شادی و خرمی
سلطان علم و دین و دنیا ہم آن تست چون نیک خواہِ دولت شاہِ معظمی
در مدحِ تو بصورتِ تضمین ادا کنم یک بیت رودکی را در حقِ بلعمی،
"صدرِ جہان جہان ہمہ تاریک شب شدہ است از بہر ما سپیدۂ صادق ہمی دمی"
از حشمتِ تو بے ربض و خندق و سلاح سدِ سکندر است بخارا ز محکمی
حق کے گذاشتے کہ بخاراے چون بہشت ویران شدے بجملۂ مشتے جہنمی
شمسِ حسام برہان دانی کہ تو کئی در دو بخاریان را در مان و مرہمی

اسی جعفری خان (یا اوس کے بھائی ؟) کا نام رکن الدین مسعود تھا، اور جیسا کہ ہم اوپر دیکھ چکے ہین، اُس نے ۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء مین بخارا مین نیا ربض بنوایا تھا، لیکن ہم کو اس کے عہد کے متعلق مزید علم نہین ہے تاہم ایک قصیدہ سے اس کی گورنری کے تقرر کا حال اور اس موقع کی تہنیت ظاہر ہے، اس کے چند اشعار یہ ہین :-

بہ تختِ ملک فریدون جلوس شاہ جہان بہ از جلوس فریدون کیان ملک....

.. ..

شہِ ملوک و سلاطین شرق رکن الدین کہ حاتم است بہ بذل و بہ عدل نوشروان
ابو المظفر مسعود بن حسن شہِ شرق کہ ہست نام وے اصل سعادت احسان

۵۱ مخطوطہ حبیب گنج، ۱۲-ب ۵۲ ،، ۱۳۰ ۵۳ اس قصیدہ کے پانچوین شعر مین بخارا کو بے ربض و خندق کہا گیا ہے محض شاعرانہ خیال ہوگا، تاریخ بخارا (ص ۴۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ بخارا کا ربض سب سے پہلے ۲۳۵ھ/۸۴۹ء مین بنوایا گیا تھا، پھر ارسلان خان نے بھی اپنے عہد مین ایک نیا ربض بنوایا، اور ۵۶۰ھ/۱۱۶۵ء مین دوسرا بنوایا گیا، جیسا کہ اوپر مذکور ہوا،

قوی دل اند سمرقندیان بہ دولتِ تو | روندہ بر رہ فرمان تو بجسم و بجان[۱]

ایک دوسرے قصیدے مین جو اسی رکن الدین مسعود کی مدح مین ہے، ارسلان خان محمد کی شان و شوکت کو شاعر یاد کرتا ہے:

ز نورِ طلعتِ او فرِّ ارسلان خانی | ہمی شود چو خیال اندر آئینہ پیدا
خدایگان جہان شاہِ شرق رکن الدین | کز وست شہر سمرقند جنت الدنیا

اسی رکن الدین مسعود کے وزیر سعد الملک مسعود کے عہدۂ وزارت حاصل ہونے پر شاعر ایک قصیدہ لکھتا ہے، اور اس کی تاریخ بھی دیتا ہے، جو کہ ہم کو پہلی بار معلوم ہوتی ہے یعنی محرم ۵۶۰ھ، مطابق نومبر ۱۱۶۴ء وہ قصیدہ یہ ہے:-

رسیدہ ماہِ محرم بہ سال پانصد و شصت | بہ بارگاہ وزیرِ خدایگان بنشست
کہ تا نظر کند اندر جمالِ طلعتِ او | کہ ہیچ شہ را مانند او وزیرے ہست

.. ..

ہر وزیران صدر بزرگ سعد الملک | کہ سعد اکبر ناظر بود بد و پیوست
دُر سعادتِ نام خدایگان مسعود | کشاد بخت مساعد بہ ہر کہ تواں بست

اسی موقع پر ایک اور قصیدہ لکھتا ہے:-

وزیر شاہ سعد الملک مسعود | چو سعد آباد کرد از کوے محمود
کہ سعدین فلک مسعود گشتند | ز سعد آباد و سعد الملک مسعود
فلک مسعود را کوے عطا داد | ملک تخت سلیمان ابنِ داؤد
ز سعد الملک سعد الدولہ اسعد | شدہ آوردن معدوم موجود
بصدر مسند پدر و جد شاہ | نشست این پاک اصل و پاک موجود

.. ..

بہ اقبال شہنشاہِ معظم | شد اندر ہر دلے محبوب و مودود

رکن الدین مسعود بن قلیج طمغاج "حسن تگین" کے اسی وزیر سعد الملک مسعود کی مدح مین ایک اور قصیدہ ہے جس میں شاعر نے اس کو ارسلان خان محمد بن سلیمان (جو چھٹی صدی ہجری کے پہلے ربع مین بخارا کا حاکم تھا) کے وزیر سعد الملک فخر الدین کی (نسبی) یادگار کہا ہے:-

اے ز سعد الملک فخر الدین جہان را یادگار | بر جہان داری ہمیا باش سعد الملک وار
بختِ مسعودِ قلیج طمغاج خان مسعود کرد | نامِ مسعود ترا القاب سعد الملک یار
تا بنامِ خسرو و سعد اخترِ مسعود بخت | بر تو سعد الملک شد ملک سعادت را قرار

پھر برہان الدین عبد العزیز بن عمر بن عبد العزیز بن مازہ کی مدح مین کئی قصیدے ملتے ہین، یہ شخص "صدر جہان" کے لقب سے مشہور تھا، عوفی نے جوامع الحکایات مین ہر جگہ اُسے "سلطان دستار داران جہان" کہا ہے، اور اسی کے فرزند سیف الدین محمد کے عہد (۶۱۷ھ) مین لباب الالباب لکھی ہے، ۵۶۲ھ/۱۱۶۷ء مین[۲] محمد بن زفر بن عمر نے اسی صدر جہان کے

---

[۱] ورق ۲۷ ب ۲۸ و [۲] تاریخ بخارا مطبوعہ ایران کے مصحح مدرس رضوی نے مقدمہ (ص ط) میں اس خلاصہ کا

تاریخ بخارا کا خلاصہ کیا تھا، اس کی مدح کے ایک قصیدے میں سے چند اشعار یہان نقل کئے جاتے ہیں :-

دارم ہوای آن کہ پُر از در کنم دہان | تا از ثنای صدر جہان پُر کنم جہان
صدر جہان کہ صدر جہان پایگاہ اوست | وز پایگاہ او بہ فلک بر شدن توان
برہانِ دین کہ ہست بہ بستانِ شرعِ دین | برہان سبق، حسام نظر، سیف حکمران
حکمے کہ او کند، خطِ فرمان کہ او کشد | نتوان گذشت ازان کہ ازان سوست لامکان
شہ را خجستہ فال بدیدار روی اوست | واندر جہان خجستہ تر از فال شہ بدان
بی خاندانِ برہان در دین شکوہ نیست | زو با شکوہ تر نے درین دین و خاندان
زین آستان کہ تا حرم کعبہ اہلِ علم | شاگرد دودمان وی اند اینت دودمان

اس قصیدہ کے تیسرے شعر کے دوسرے مصرعہ مین شاعر نے ممدوح کے والد حسام الدین عمر اور فرزند سیف الدین محمد کے القاب کی رعایت رکھی ہے[۵] لیکن افسوس ہے کہ ہم کو تاریخ سے برہان الدین عبد العزیز کے عہد کے متعلق سوائے محمد ابن زفر کی تاریخ بخارا کے سال کے اور کچھ معلوم نہین ہوتا، ممکن ہے کہ سوزنی نے اس کا صرف ابتدائی عہد پایا ہو، کیونکہ دولت شاہ اور پھر پروفیسر براؤن (ج ۲، ص ۳۴۳) نے شاعر کے انتقال کا سال ۵۶۹ھ مطابق ۱۱۷۳ء لکھا ہے، اور یہ تاریخ قرین قیاس اس لئے ہے کہ ہم اُسے قرن ششم کے پہلے ربع ہی سے مدح سرائی مین مشغول پاتے ہین، اور اس ممدوح کے بعد اس کا کوئی کلام تاریخی شہادت پیش نہین کرتا، ممکن ہے کہ آیندہ کوئی مکمل نسخہ کہین مل جائے، اور مزید معلومات حاصل ہو سکین[۶]،

(بقیہ حاشیہ ص ۷۰) سال یہی بتایا ہے، لیکن میرزا قزوینی نے (لباب۔ جلد ا ص ۳۴۴) ۵۶۴ھ مطابق ۱۱۶۸ء لکھا ہے، برہان الدین صدر جہان ایک اور رئیس اسی خاندان کے تھے، یعنی محمد بن احمد بن عبد العزیز بن مازہ جو ۶۱۶ھ مین قتل ہوئے، لیکن سوزنی کے ممدوح یہ ہو نگے ورنہ پھر اس کی بہت عمر قرار دینا جائے گی، [۵] سوزنی نے حسام الدین، سیف الدین اور تاج الدین (عمر بن مسعود بن احمد بن عبد العزیز بن مازہ ؟) کے القاب کی رعایت برہان الدین "صدر جہان" کی مدح کے ایک اور قصیدے مین بھی کی ہے، وہ قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے :-

صدر جہان بحضرتِ شاہ جہان رسید | با کام و ناز سوی فلک کامران رسید

[۶] لباب جلد ۲ ص ۱۹۴ مین سوزنی کا ایک قصیدہ اس طرح شروع ہوتا ہے،

مفگن بغمزہ بر دلِ مجروحِ من نمک | وز من بقبلہ بد مکن ای قبلہ ریمک

اس کا نوان شعر اس طرح ہے :-

زین زمانہ آنکہ شد از اہلِ این خطاب | ای آدمی بصورت و با سیرتِ مَلَک

لیکن حبیب گنج کے نسخہ مین اس طرح ہے :-

فرزانہ فخرِ دین کہ شد از اہلِ دین خطاب | کای آدمی بصورت و با سیرتِ ملک

اور یہی قرأت صحیح معلوم ہوتی ہے، اس ممدوح کا حال تو معلوم نہین لیکن قصیدے کی ترصیع دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ یہ کلام شاعر کے آخری دنون کی یادگار ہو گا، لباب جلد ۲ ص ۱۹۶ مین ایک اور قصیدہ ملتا ہے، جس کا ممدوح بھی پردۂ خفا مین ہے :-

سپہر فضل علی افتخارِ دین کہ بدو | کند تفاخر دین پیمبرِ تازی

مطبوعات جدیدہ

اخبار مجموعہ مترجمہ جناب مولوی محمد زکریا صاحب مائل تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۸ صفحے کاغذ معمولی کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد سے غیر مجلد عہ پتہ انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی،

اندلس کی اسلامی فتوحات اور اس کی ابتدائی تاریخون مین ایک مستند تاریخ "اخبار مجموعۃ فی فتح الاندلس وذکر امرائہا رحمہم اللہ والحروب الواقعۃ بہا بینہم" ہے اس کو ایک اسپینی مستشرق امیلولا فوانتی نے ۱۸۶۷ء مین تصحیح مقدمہ اور اسپینی ترجمہ کے ساتھ میڈرڈ سے شائع کیا تھا، لیکن اصل مصنف کا نام ونشان کچھ معلوم نہیں، مقدمہ اسپینی زبان مین ہے، ورنہ شاید کچھ پتہ چلتا یہ کتاب ہمارے کتب خانہ مین بھی موجود ہے، ہم نے عرصہ ہوا تاریخ بنی امیہ کی تالیف کے سلسلہ مین مختلف فہرستون اور کتابون کے ذریعہ مصنف کا نام معلوم کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن کوئی سراغ نہ مل سکا، سب اس کے مصحح اور مترجم امیلولا فوانتی ہی کا نام لکھتے ہین حتی کہ تاریخ اندلس کے مشہور عالم محقق ڈوزی نے بھی اپنی تاریخ اندلس کے ماخذون مین کتاب کا نام تو لکھا ہے لیکن مصنف کا نام ظاہر نہین کیا، لیکن اس کے انگریزی مترجم گریفن اسٹوکس کے بیان سے معلوم ہوتا ہے، کہ ڈوزی نے اپنی کتاب تحقیقات اور ابن العذاری کی کتاب البیان المغرب کے مقدمہ مین اس پر روشنی ڈالی ہے لیکن راقم ان دونون کے مطالعہ سے محروم ہے، کتاب کی عبارت اور طرز تحریر شاہد ہے، کہ وہ یقیناً کسی قدیم مسلمان مصنف کی تصنیف کی ہے اور اندلس کی ابتدائی تاریخ کے معتبر ماخذون مین ہے، جناب مولوی زکریا صاحب مائل نے اردو مین اس کا ترجمہ کیا ہے ترجمہ صاف وسلیس ہے، کتاب کے شروع مین لائق مترجم کے قلم سے اسلامی اندلس کی تاریخ اور اس کے ماخذون پر مفید تبصرہ ہے، مترجم نے کتاب کا نام "اخبار مجموعۃ فی فتح الاندلس" لکھا ہے ص ۵۰ جو صحیح نہین ہے، صحیح نام "اخبار مجموعۃ" تنوین کے ساتھ ہے، دونون مین اضافت نہین، بلکہ صفت وموصوف کی ترکیب ہے، اضافت عربی قاعدہ سے بھی غلط ہے، اور اصل کتاب مین بھی نہایت واضح طور پر اعراب موجود ہے، اردو مین اس کا نام اخبار مجموعہ کے بجائے مجموعۂ اخبار زیادہ صحیح ہوتا، خیر یہ تو ایک جزوی فروگذاشت ہے، نفس کتاب کا ترجمہ اردو مین اندلس کی تاریخ پر ایک مفید اضافہ ہے،

ملک محمد جائسی مولفہ جناب سید کلب مصطفےٰ صاحب بی اے تقطیع بڑی ضخامت ۲۰۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ پتہ انجمن ترقی اردو، نئی دہلی،

ملک محمد جائسی بھاشا زبان کے ان باکمال شاعرون مین تھے جن کی مثال ہندو شعرا مین بھی مشکل سے مل سکے گی، ان کی مشہور مثنوی پدماوت کو اتنی شہرت ومقبولیت حاصل ہوئی کہ اس سے عوام وخواص سب آج تک لطف اندوز ہوتے ہین لیکن اس نامور شاعر کے حالات بہت کم معلوم ہیں، تذکرون اور کتابون مین بھی ان کی شاعری کے علاوہ ان کے حالات محض برائے نام ملتے ہین، ان کے ایک لائق ہم وطن نے بڑی تلاش وجستجو سے حالات فراہم کرکے یہ کتاب مرتب کی ہے، اس مین ملک محمد جائسی کے ضروری حالات، ان کی تصانیف کا ذکر، پدماوت کے قصہ کا خلاصہ اس کی تاریخی حیثیت پر تنقید اور اس کی شاعرانہ خوبیون کی پوری تفصیل اور مصنف کی ایک دوسری نظم اکھروٹ اور آخری دور کے کلام پر مختصر تبصرہ ہے ضمناً بھاشا زبان اور اس کی شاعری کے متعلق بہت سے مفید معلومات آگئے ہین، یہ کتاب مفید ودلچسپ اور بھاشا کی شاعری اور اردو زبان کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والون کے مطالعہ کے لائق ہے،

"م"

جلد ۵۶ ماہ ربیع الثانی ۱۳۶۴ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۴۵ء عدد ۴

مضامین

شذرات | سید سلیمان ندوی، | ۷۳-۷۴
خطبۂ صدارت | " | ۷۵-۸۰
عرفانیاتِ فانی | جناب مرزا احسان احمد صاحب ایڈوکیٹ اعظم گڈھ | ۸۱-۹۲
کیا مدینۃ العلوم طاشکبری زادہ کی تصنیف ہے؟ | جناب قاضی احمد میاں صاحب اختر جونا گڈھی | ۹۳-۹۵
مطبوعاتِ جدیدہ | | ۹۶-

شذرات

خاکسار تین ماہ کے سفر مدراس و بمبئی وحیدرآباد دکن و وردھا و بھوپال سے مارچ کے وسط میں واپس آیا، مدراس میں اواخر دسمبر ۱۹۴۴ء میں مورخین ہند کی کانفرنس تھی، جس کے ایک شعبہ کی صدارت کے لئے مدراس کا سفر کیا گیا،

یہ ظاہر ہے کہ کسی شعبہ کی صدارت کے لئے اتنا لمبا سفر اختیار کرنا، اور بھی صحت کی خرابی کی حالت مین کسی نئے حصول اغراض کی غرض سے نہ تھا، بلکہ ان تلخ حقیقتوں کے اظہار کے لئے تھا، جن سے اب تک چشم پوشی برتی گئی ہے، اور جن کے اظہار کا اس سے بہتر موقع نہیں ہوسکتا تھا،

یہ خوشی کی بات ہے کہ اس خطبہ میں جس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے اس کو کانفرنس کے سمجھدار لوگوں نے اچھی طرح سمجھا بلکہ کانفرنس کے صدر ڈاکٹر سر ندرناتھ سین نے اپنے صدارتی خطبہ مین خود بھی ادھر اشارہ کیا ہے، اور ابھی ۵ ۲ مارچ کو ہندوستانی کلچرل الہ آباد کی صدارتی تقریر میں سر تیج بہادر سپرو نے "حقیقی تاریخ" کے عنوان سے اسی مقصد کو ظاہر کیا ہے،

مدراس کے بعض دوسرے مقامات مین بھی تقریرین ہوئین، ویلور و نیارم مین تقریر کا عنوان "ملتِ محمدیہ کی حقیقت" اور دار السلام عمر آباد مین عبدیت تھا، دار السلام کی مسجد مین دو روز صبح کے وقت قرآن پاک کے درس بھی ہوئے، پیریم پیٹ میں بھی صبح کو ایک مسجد مین قرآن پاک کی بعض سورتون کا درس ہوا،

بمبئی کا سفر وہان کی جمعیۃ العلماء کی دعوت پر ہوا، ۱۰ ربیع الثانی ۱۳۶۴ھ کی رات کو جمعیۃ العلماء مذکور کی صدارت کا خطبہ

پڑھا گیا جس مین سورۂ الحمد کی تفسیر کے ضمن مین مسلمانون کے حال پر تبصرہ تھا، شہر مین انجمن اسلام ہال مین اردو پر اور صابو صدیق ہال مین ہندوستان مین علوم عربیہ کی خدمت کے موضوع پر اور احباب کے ایک مخصوص مجمع مین توبہ و انابت کے صحیح طریق پر تقریرین کی گئین،

حیدرآباد دکن کے سفر مین خرابی صحت کی بنا پر قصداً تقریرون سے احتراز کیا گیا، صرف سکندرآباد کے نوجوانون کے ایک مختصر سے مجمع مین اصلاح کے بنیادی طریق پر گفتگو کی گئی جس کو اکثر نوجوانون نے پسند کیا،

دردھا کا سفر ہندوستانی زبان کے مشورہ کی غرض سے ہوا، مین نے اپنی تقریر مین ایک ملکی زبان کی ضرورت پر زور دیا، اور یہ عرض کیا کہ ہندؤون اور مسلمانون کی زبان مین اسی حد تک فرق ہونا چاہئے جس حد تک ان کے مذہبون اور تمدنون مین فرق ہے اس لئے جہان تک مسلمانون کا تعلق ہے ان کی مذہبی و تمدنی اصطلاحون اور لفظون کا مانند عربی و فارسی و ترکی ہونے سے کوئی چارہ نہین ہے اور ایسی ہی اجازت ہندؤون کو بھی ان کے مذہبی اور تمدنی خصوصیات کے لئے ہونی چاہئے اس کے بعد یہ عرض کیا گیا کہ زبان کے لفظون کی صحت کا مدار لغت کی کتابون کے بجائے بازار کے چلن اور عوام کے رواج پر ہونا چاہئے اب اس وقت ہماری زبان مین عربی و فارسی ہندی سنسکرت اور انگلش کا جو لفظ جس صورت مین بولا جاتا ہے وہی ہماری زبان کا صحیح لفظ ہے، افسوس ہے کہ رپورٹرون نے لوگون کی صحیح تقریرین چھاپنے کا بندوبست نہین کیا،

عرب ریاستون کی وحدت کی جو کوششین ہو رہی ہین ان مین اب تک صرف علمی و ادبی و اقتصادی خیالات ظاہر کئے گئے تھے لیکن بعض مصلحین نے ایک قدم اور آگے بڑھایا ہے اور یہ ظاہر کیا ہے کہ شریعت اسلامیہ کے قانون کو اگر یہ سب اختیار کرلین تو یہ وحدت کا بہترین ذریعہ ہوگا حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ ریاستین اس تجویز کو منظور کرلین تو یہ عربی وحدت کا حقیقی مظہر ہوگا، اور پوری دنیائے اسلام اس کی پشت پر ہوگی خدا کرے کہ عرب مسلمانون کی نظر توجہ لندن و نیویارک سے ہٹ کر اگر پھر مکہ اور مدینہ پر پڑنے لگے تو ان کی دوسری زندگی پھر ان کی پہلی زندگی کی طرح دنیا کی قومون کے لئے زندگی کا نیا پیغام پیش کردے جس کی دنیا کو اس وقت بڑی ضرورت ہے،

پچھلے تین مہینون کے پرچون کی ترتیب اور شذرات کی تحریر کا کام ہمارے رفیق مولوی شاہ معین الدین صاحب ندوی نے کیا ہے اب معارف کا کام زیادہ تر وہ اور مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی کرتے ہین، امید ہے کہ آیندہ بھی اس بوجھ کو یہی دونون اٹھائیں گے۔ اور میرے لیے یہ بڑی طمانیت کا باعث ہے،

معارف کی ضخامت کی کمی کا غم اپنے ناظرین کے ساتھ خود رسالہ کے مدیرون کو بھی ہے، اب تک سرکار سے اجازت ملنے کی جو کوششین کی گئین، وہ ناکام رہین، اب مرکزی حکومت مین کوشش کی جا رہی ہے انجام اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہے،

نئے سال کی کتابون مین مولوی مسعود عالم صاحب ندوی کی کتاب "اشتراکیت اور اسلام" چھپ کر شائع ہوئی ہے کتاب گو مختصر ہے مگر تحقیق اور استناد سے لکھی گئی ہے، اس لئے امید ہے کہ اہل ذوق اس کی قدر کرین گے

مقالات

خطبۂ صدارت شعبۂ تاریخ ہند از منۂ وسطیٰ (سنہ ۱۲۰۶ء تا سنہ ۱۵۲۶ء)

اجلاس

آل انڈیا ہسٹری کانگریس منعقدہ مدراس دسمبر سنہ ۱۹۴۴ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؎

رفیقو! ممنون ہون کہ آپ نے اپنی مجلس مین اس کرسی پر مجھے جگہ دی، آپنے اس انتخاب سے اپنے دستور کی کئی دیوارون کو توڑا ہے آپنے یہ کرسی ایسے شخص کو دی ہے جس کو آپ کی یونیورسٹی برادری سے دور کا لگاؤ بھی نہین، بلکہ اس نے آپکے اسکول اور کالج مین ایک منٹ کے لئے بھی قدم نہین رکھا، اور وہ سرتاپا مشرقی درسگاہون کا پروردہ اور نمایندہ ہے، اس لئے اس اعزاز کے لئے اوس کا انتخاب آپ کی رواداری اور دل کی بڑائی کا بہت بڑا ثبوت ہے، آپنے اس طرح میرا حوصلہ بڑھایا ہے جس کا دل سے شکر گذار ہون، اور اس کو اس کے لئے نیک خیال سمجھتا ہون کہ شاید آیندہ علمی اور تعلیمی کامون کے انجام دینے مین مشرقی اور مغربی تعلیمون کے فرق و امتیاز کی خلیج بیچ مین نہ آئے گی، اور ہماری نظر کسی بڑے علمی اور تعلیمی مقصد کو پورا کرنے مین اصل مقصد پر رہے گی، مغربی و مشرقی طرز و انداز کے اختلاف پر نہین،

اب ہم زمانہ کے دوسرے موڑ پر پہونچ گئے ہین، جہان ہم کو اپنی زبان سے محبت ہونی چاہئے، اور اپنی دیسی ہندوستانی زبان مین کام کرنے والون کے ساتھ اشتراک عمل ہونا چاہئے، اور شاید آج کا دن اس بڑے مقصد کے اعلان کے لئے موزون ہے،

اصل موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے ہندوستان کی عمومی تاریخ کے ایک خاص نقطۂ نظر کے متعلق ہم کو کچھ کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے، ہم جس چیز کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہین، ہمارے خیال مین اب تک کسی جماعت کی طرف سے اس کی غلطی کو واضح نہین کیا گیا، اور نہ اس کی غلطی پر ابھی تک ان کو ٹوکا گیا ہے ہماری مراد اس سے وہ غلط قسم کا فرقہ دارانہ رنگ ہے جو ہماری تاریخ پر ایک زمانہ سے چھایا ہوا ہے،

پالیٹکس کے کھیل سے اس ملک کا علم تاریخ بھی بچا ہوا نہین، بلکہ صاف کہنا چاہئے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے ہندوستان کا مشہور پھل پھوٹ پیدا ہوتا ہے مسلمانون کی حکومت کی بڑائی اور اچھائی کی بھی بہت سی باتین کہی جاسکتی تھین، مگر ان کے بعد اس ملک مین جو حکومت آئی، اوس کے زمانہ مین تعلیم کا سررشتہ پورا کا پورا غیر ملکیون کے ہاتھ مین تھا، ان لوگون کے ہر حیثیت کی ہر طرف سے یہ کوشش تھی، کہ اپنے راج کی بڑائی کو ہر ہندوستانی کے دل مین بٹھادے، اور ساتھ ہی ایک ایسا کرتب کرے جس سے ان کے دل کے شیشے ٹوٹ کر پھر جڑنے نہ پائین، تعلیم کے سارے مضمونون مین اس کام کے لئے تاریخ کے سوا کوئی اور چیز مناسب نہ تھی، چنانچہ اونھون نے اس ملک کے لئے تاریخ کی جو کتابین شروع سے آخر تک لکھین، اور پڑھائین، ان مین یہی بات سو سو طرح سے الٹ پلٹ کر سمجھائین، اور پڑھائین کہ جو دل ان سے ٹوٹے تھے، وہ پھر اب تک جڑ نہ سکے،

آج سے کوئی پندرہ سولہ برس پہلے اسی مدراس کے شہر ترچناپلی مین ہندو مسلمانون کے ایک ملے جلے جلسہ مین جس کے

صدر ہائیکورٹ کے ایک ریٹائرڈ جج تھے، مین نے کہا تھا کہ وہ زمین جس مین ہندو مسلمانوں کے پھوٹ کا درخت جمتا اور بڑھتا ہے، وہ (C) سے شروع ہونے والے دو مکان مین یعنی کالج اور کورٹ، میری بات کو ہنسی اور دل لگی نہ سمجھئے بلکہ سوچئے کہ میرا کہنا کہان تک سچ ہے، پچھلی بڑی جنگ یعنی مانٹیگو چیمسفورڈ ریفارم اسکیم کے بعد سے تعلیم کا کام خود ہندوستانیون کے ہاتھون مین آگیا ہے جس مین سے ایک تاریخ بھی ہے، اب ہندوستان کی تاریخ اکثر یونیورسٹیون مین ہندوستانی ہی پڑھاتے ہین، اور ہندوستانی ہی کورس کی کتابین بناتے ہین، اور تاریخ کے مختلف دور کے بادشاہون کے حالات کی تحقیق پر کتابین لکھاتے ہین، لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اب چلنے والے گو نئے ہین لیکن ان کے چلنے کا راستہ ابھی تک وہی ہے جس کو ان کے پہلے پرانے بدیسی چلنے والے بنا کر چھوڑ گئے ہین، حالانکہ ضرورت یہ ہے کہ اب نیا ڈگر بنایا جائے اور علم کے قافلہ کے چلنے والون کے لئے نئی راہ نکالی جائے، جو پھوٹ کے بجائے میل کی منزلِ مقصود کو جاتی ہو،

اس فن کے جاننے والے جانتے ہین کہ تاریخ ایک کچی دھات ہے، اس کچی دھات کو مختلف مسالون سے جوڑ کر جیسی شکل آپ چاہین بنا سکتے ہین، اور اپنی ہمدردی اور بیدردی سے اس کو جس طرح چاہین رنگ کر دکھا سکتے ہین، دو تین جزئی باتون کو ملا کر کلیہ بنا لینا اس فن کا آج کل سب سے آسان چٹکلہ ہے، پرانے زمانہ مین تاریخ ایک معصوم فن تھا جس کا مقصد واقعات کا ریکارڈ تیار کرنا تھا اور بس، مگر آج کل یہ فن سب سے زیادہ بدنام فن ہوگیا ہے، اور قومون کی چرب زبانی اختلاف بیانی اور واقعات کی توجیہ اور تشکیل کر کے اس کو جدا جدا رنگ دینے کے سبب سے کسی چیز کی تاریخ آج ایک ہی طرح بیان نہین کی جا سکتی ہے، کچھ نہ سہی پچھلی جنگ ہی کی تاریخ مختلف لڑنے والی قومون کی زبانون سے ایک ہی طرح پڑھ کر دیکھ لیجئے، یا اسی لڑائی مین ایک ہی واقعہ کی روایت مختلف ملکون کے ریڈیو مین سن لیجئے، تو معلوم ہوگا کہ اس زمانہ مین تاریخ کی حقیقت کیا سمجھی گئی ہے، اور اس سے کیا مصرف لیا جا رہا ہے،

بہرحال مجھے کہنا یہ تھا، کہ تاریخ کے فن کو قومون کے پھوٹ اور میل مین بہت کچھ دخل ہے، اس لئے وہ لوگ جن کی نظر مین اس ملک کا مستقبل ہے، اور جن کے ہاتھون مین اس مستقبل کا بنانا یا بگاڑنا ہے، ان کو اپنی ذمہ داری کو سمجھنا چاہیئے اور اس حالت مین جب کہ ہم سب کو معلوم ہے کہ ہم کو اب اسی ملک مین جینا اور مرنا ہے، تو عداوت اور نفرت کی پچھلی باتون کو اس طرح دہراتے رہنا جس سے یہ جذبہ اسی طرح پلتا اور بڑھتا اور پھلتا اور پھولتا رہے، اپنے ملک کے ساتھ بڑی بے وفائی ہے،

مسلمانون مین دو مصنف ایسے گذرے ہین جنھون نے ہندوستان کی خاک کو اپنی آنکھون کا سرمہ بنایا، جن مین پہلا گو نسل مین ترک تھا، مگر اس کا دل ہندوستان کی مٹی سے بنا تھا، میری مراد امیر خسرو سے ہے، جنھون نے فارسی اور بھاشا کی آمیزش سے ہندوستان مین مسلمانون کے عہد مین ایک نئی زبان اور نیا تمدنی ذوق پیدا کرنے کی کوشش کی، اور سب سے پہلے اس ملی جلی زبان مین شاعری کی بنیاد رکھی، اور موسیقی کی ایک نئی لے ہندی اور ایرانی سے ملا کر پیدا کی، انھون نے اپنی فارسی مثنوی "نہ سپہر" مین ایک مستقل باب ہندوستان کی خوبیون پر لکھا ہے، اور یہان کے ملکی باشندون کے علم و آرٹ، اور ہنر کی تعریف مین اپنی شاعری کا پورا جوہر دکھایا ہے، دوسرے شخص میر غلام علی آزاد بلگرامی ہین جن کی وفات کو ابھی ۱۶۳ برس گذرے ہین، ان سے بڑا ہندوستان کا کوئی مسلمان مورخ اور عربی کا شاعر اس ملک مین پیدا نہین ہوا، یہ ہندی کے بھی شاعر تھے، بلکہ خاندانی شاعر، انھون نے سبحۃ المرجان فی آثار ہندستان عربی مین لکھ کر ہندوستان کی زبان

کو آسمان اور ہر حیثیت سے اس کی وہ بڑائی کی ہے، کہ اس کو رشکِ جہان بنا دیا ہے مسلمان مورخون کے لئے اُن کے بزرگون کا یہ طریقہ ان کی تقلید کے قابل ہے،

جس عہد کی تاریخ پر ہم آج کی مجلس مین کچھ کہہ سن رہے ہین اس پر ہندوستانی اہلِ قلم کے ہاتھون سے کئی اچھی اچھی کتابین شائع ہو کر اہلِ نظر کے سامنے آگئی ہین، خاص کر ہماری یونیورسٹیون مین تاریخ کے کام کرنے والون کے ذریعہ کافی لٹریچر پیدا ہو رہا ہے، مگر اس کا بڑا حصہ ایسا ہے جو کسی یونیورسٹی سے کسی ڈگری کے حاصل کرنے کے لئے لکھا گیا ہے، اب تک عموماً طلبہ یا ایسے اساتذہ جنھون نے اپنی طالب علمی کا زمانہ فوراً ہی ختم کیا ہے، ایک مقررہ مدت کے اندر ڈگری لینے والون کے خیالات سے متاثر ہو کر اس عہد پر کتابین لکھتے رہے ہین، جس مین انھون نے کم سے کم مدت مین زیادہ سے زیادہ باتین پیش کرنے کی کوشش کی ہے، اسی لئے ان مین سے بعض کی تحقیق مین گہرائی، رائے مین پختگی اور دلیلون مین وزن نہین، ان مین کچھ ایسے بھی ہین جنھون نے فارسی نہ جاننے کے باوجود دوسرون پر بھروسہ کر کے اپنی تحقیقات کی ساری عمارت فارسی کی اور ینجل کتابون پر کھڑی کر دی ہے، اور بعض ایسے بھی ہین جنھون نے مسلمان حکمرانون کے مذہب کے اصول و قوانین کا گہرا مطالعہ کئے بغیر کسی دوسرے کی رائے کا حوالہ دیکر یا کسی کے قول کو نقل کر کے اپنے خیال کے مطابق نتائج اخذ کرلئے ہین، یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ بعض تاریخی تحقیقات مین اسلامی شریعت کی وضاحت انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کی مدد سے کی جاتی ہے، اسلامی فقہ کے نکتے میکڈانلڈ کی کتاب کے ذریعہ سے بتائے جاتے ہین، اسلامی مسائل کا حل ریورنڈ ہیوز کی ڈکشنری آف اسلام سے پیش کیا جاتا ہے، مسلمانون کی حکومت بادشاہی اور مالیات کے نظریے آرنلڈ اور اگنائیڈز (Aghnides) کی عینک سے دیکھے جاتے ہین،

اس غلط طریق کار کا نتیجہ یہ ہے، کہ اب گو نہ وہ فاتح رہے ہین، اور نہ مفتوح، مگر زمانہ کے تطاول سے ان کے زمانہ کے پیدا شدہ جذبات کے سوکھ جانے والے درخت کو پانی دے دے کر ہرا کیا جاتا رہا ہے، اور ہم تحقیق کے نام سے اپنے پیشروون کی غلطی کی غلط پیروی مین مصروف ہین،

یورپین مستشرقین نے اسلامی علوم و فنون کی جو خدمت کی ہے، اس کا اعتراف ہے، مگر مذہبی شرعی اور فقہی معاملات مین ان کی تحقیق یا رائے یا قول پر کسی حال مین بھی اعتماد نہین کیا جا سکتا ہے، اس لئے مسلمان فرمانرواؤن کے کسی قول یا پالیسی کو ان کے مذہب کی روشنی مین اگر دیکھنے کی کوشش بھی کیجائے، تو مذہبی معلومات کا ماخذ اور سرچشمہ خود مسلمان علماء فقہا کی اور ینجل، مستند اور معتبر کتابین ہونی چاہئین، لیکن زبان کی ناواقفیت کی وجہ سے ان کتابون کا سمجھنا ممکن نہ ہو، تو پھر ایسے موضوع اور مسئلہ پر قلم اٹھانے کا حوصلہ ہی نہ کیا جائے، نیت خواہ کتنی ہی اچھی اور صاف ہو مگر مذہبی مسائل کی غلط تعبیر اور ملکی امور مین ان کی غلط تطبیق سے بعض اوقات ایسے مضرت رسان پہلو پیدا ہو جاتے ہین جن سے ایک طرف تو حقیقت کا خون ہوتا ہے، اور دوسری طرف قومون کے جذبات مین تلخی پیدا ہوتی ہے، یہان پر ہمارے دوستون کو یہ بھی یاد رکھنا چاہئے کہ ہندوستان کے مسلمان سلاطین مسلمان ضرور تھے، لیکن وہ اسلام کے نمایندے نہ تھے، وہ اسلام کے نام لیوا بنکر گو حکومت کے تخت کو جلوہ دیتے تھے، مگر ان کی حکمرانی کا طرز اور فرمانروائی کا اصول خالصتہً اسلامی نہ تھا، وہ مذہباً تو مسلم اور نسلاً ترک یا پٹھان یا ہندو تھے، اس لئے ایک یا دوسری نسل کے مسلمان ہونے کے باوجود اسلام کی صحیح تصویر نہ تھے، اور اور نہ ان کی سیاست اسلامی سیاست تھی، اور نہ ان کی حکومت ٹھیک اسلامی طرز کی تھی، اور نہ ان کے سپہ سالار اور فاتح

اپنے مفتوحہ ملکون کے ساتھ اسلامی طریقے کا پورا پورا برتاؤ کرتے تھے، اس بحث کے سمجھنے کے لئے سلطان علاؤ الدین خلجی اور قاضی مغیث الدین کی وہ طویل گفتگو پڑھیے جس کو برنی نے فیروز شاہی میں لکھا ہے، یا محمد شاہ تغلق کی ان خونریزیون پر ایک نظر ڈالی جائے جس کے مقتولین مین ہندوؤن اور مسلمانون کی تخصیص نہ تھی، غور کیجئے، کہ محمد بن قاسم ثقفی کی عربی فوج نے ۹۱ھ مین جب بودھون کے بلاد سے پر سندھ مین قدم رکھا تو پہلے ہی دن ان عربون نے ہندوؤن کی حیثیت شرعی کو منقح کر لیا، ان کو وہی حیثیت دی، جو ان سے پہلے صحابہ نے اہلِ فارس کی قرار دی تھی، یعنی شبہ اہل کتاب جس کے معنی یہ ہین، کہ دو باتون کے سوا یعنی نکاح اور ذبیحہ کے علاوہ اور تمام امور مین ان کے ساتھ اہلِ کتاب کا برتاؤ کیا جائے گا، نیز یہ کہ یہان کے مندرون کی حیثیت ایران کے آتشکدون کی ہے، جس طرح صحابہ نے آتشکدے نہیں توڑے، اوسی طرح مصالحت ہو جائے، تو یہ مندر بھی توڑے نہین جائین گے چنانچہ سندھ اور ملتان مین چوتھی صدی تک اسلامی حکومتون کے باوجود یہ مندر اسی طرح قائم رہے، مورخ بلاذری نے یہ حالات لکھے ہین، اور اکثر عرب سیاحون نے ان کی کیفیت بیان کی ہے،

لیکن افسوس ہے کہ ترک سیاحون نے جوشِ جہاد کے علاوہ صلح و جنگ اور فتح و غنیمت اور محاصل و مداخل کے تمام اسلامی اصولون کو فراموش کر دیا، اور ان کے ان کامون کی ذمہ داری شریعتِ اسلام پر رکھی جاتی ہے، حالانکہ اسلامی اصول سے ذمیون کے معاملات کا فیصلہ ایک حد تک باہمی معاہدات کی دفعات پر ہے، اور نیز یہی فقہی مسئلہ ہے کہ پرانے مندر توڑے نہ جائین گے، اس قسم کے خلط ملط مباحث سے ہندوستان کے مسلمان سلاطین کی تاریخ ایک زمانہ سے جھگڑے کی چیز بن کر رہ گئی ہے، یا تو ان کی اور ان کے مذہب کی تصویر بہت ہی بُری اور بھیانک دکھائی جاتی ہے یا پھر دوسری طرف اون کی حمایت اور مدافعت مین ہر قسم کا زور صرف کیا جاتا ہے، یا پھر دونون گروہ ایک دوسرے کی نکتہ چینی کرتے ہین، کچھ محققین ایسے بھی ہین، جو کسی سلطان کی حکومت کی تاریخ لکھتے وقت اس کی خوبیان بھی ظاہر کرتے ہین، اور اس کی بُرائیان بھی دکھاتے ہین، مگر ان مین سے ایسے مصنفون کی تحریر بڑی گمراہ کن ہوتی ہے، جو چند خوبیان محض اس لئے بیان کرنے کی کوشش کرتے ہین، کہ ان خوبیون کی آڑ مین وہ بڑی سے بڑی برائیون کا زہر پھیلانے مین کامیاب ہون، اور وہ مخالف نکتہ چینی کے الزام سے بھی بچے رہین، حالانکہ ضرورت اس کی ہے کہ بغیر تصنع کے حق کو حق اور باطل کو باطل کہدیا جائے،

غرض مسلمان سلاطین کی تاریخ لکھتے وقت یہ بات ہم سب کے سامنے رہنی چاہئے، کہ وہ مسلمانون کے بادشاہ ضرور تھے، لیکن اسلام کے مذہبی پیشوا اور صلحاء نہ تھے، جن کا ہر فعل اور عمل بُرائیون اور کمزوریون سے بالاتر ہوتا، اس لئے انھون نے اگر اپنی سیاست مین کوئی نادرا اور نامناسب رویہ اختیار کیا تو آج ہم کو اس کے لئے نہ معذرت نامہ پیش کرنے کی ضرورت ہے، نہ شرم سے سر جھکانے کی، وہ کونسی قوم ہے جس کے بادشاہ اور کشورکشا ہر معیار پر ہر زمانہ مین پورے اترے، اور ہر اعتراض سے پاک گذرے، اچھون اور بُرون سے تاریخ کا کوئی دور خالی نہین رہا، اس لئے شخص کی بحث مین مذہب کو درمیان مین لانا غلطی ہے حالانکہ غلطی اس قسم کے موقعون پر ہندو ہندوستان، اور عیسائی ہندوستان کے دور کے بیان میں کبھی زیر عمل نہین آتی، تاریخ کا مقصد پروپگنڈا نہین بلکہ وہ واقعات کی کہانی اور قومون کی سوانحعمری ہے، اور اسی حیثیت سے ان واقعات کا تذکرہ کرنا چاہئے، انگلستان کی تاریخ کیا لڑائیون کا دنگل نہین، رومن فتوحات سے موجودہ متحدہ اینگلوسکسن حکومت تک کیا ان قومون کی جنگین نہین ہوئین، کیا اسکاٹ لینڈ ویلیز، آئرلینڈ اور انگلینڈ کے درمیان بڑی بڑی خونریزیان نہین ہوئین، مگر اب ان کی تاریخ لکھتے وقت یہ خیال رکھا جاتا ہے کہ یہ واقعات اس انداز مین بیان نہ ہون، کہ پچھلے سوئے ہوئے فتنے

بر جاگ جائین، انگلستان اور فرانس جو آج ڈیڑھ سو برس سے اتحادی ہین، کیا ان کی تاریخ کی زمین دونون قومون کے
ون سے رنگین نہین، تاہم گذشتہ ناگواری کے اظہار مین قلم اس قدر محتاط رہتا ہے، کہ موجودہ خوشگواری کے شیشہ مین
ل بھی آنے نہین پاتا، اسی طرح پرانے ہندوستان کے راجاؤن مین کون وقت لڑائی بھڑائی اور ایک دوسرے کے راج
کے لینے دینے مین نہین گذرا، پھر بھی بودھ، جین، ویدک، برہمنی، آریائی اور ستھین اور یہان کی قدیم باشندہ قومون کی لڑائیون
کے بیان مین مورخون نے اپنی قلمی لڑائیون کا سلسلہ نہین چھیڑا ہے، حالانکہ ان مین سخت مذہبی اختلافات بھی تھے، اور یہ
صحیح قدم ہے، اسی طرح کا مصالحانہ قدم اسلامی تاریخ کے اس دور کے میدان مین بھی رکھنا چاہئے، میری یہ تمہید گو لمبی
ہوگئی، اور ممکن ہے کہ اس بیان مین کہین کہین تلخی بھی آگئی ہو، مگر جس درد سے یہ باتین کہی گئی ہین، امید ہے کہ وہ اسی درد
سے سُنی بھی گئی ہون گی، اور ہمارے مورخ دوستون کی توجہ کے قابل ٹھہرین گی، اس مجلس سے بہتر اور کونسا موقع اس
درد کے اظہار کا ہو سکتا تھا،

اب ہم ہندوستان کی اسلامی تاریخ کے اس عہد کی نسبت کچھ عرض کرنا چاہتے ہین، جو ہمارے پیش نظر ہے، اس عہد
کی تاریخ لکھنے مین سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ اس دور کی تاریخ کا سرمایہ ہمارے پاس بہت کم ہے، اور اس کی وجہ یہ ہے کہ
دوسری قومون کی طرح اوس زمانہ کے بادشاہون نے اپنے عہد کی تاریخ نویسی کو سرکاری کام نہین قرار دیا تھا، بلکہ عموماً اہل تاریخ
اس کام کو اپنے شوق سے انجام دیتے تھے، گو وہ کسی نہ کسی طرح بادشاہ کے دامن سے ضرور لپٹے تھے، تاہم وہ اس کام کے لئے
متعین نہ تھے، آج کل قومون کی تاریخ کی نقش آرائی مین خون ہی کا رنگ درکار نہین، بلکہ اس زمانہ کے تمدن، اقتصاد
تدبیر، معاشرت، علم و فن اور طریق جنگ وغیرہ کے ایسے معلومات کی ضرورت پڑتی ہے، جن سے اس قوم کی پوری تصویر
نظر ہو جائے، لیکن اوس زمانہ کے پُرانے مورخون نے اپنے مذاق کے مطابق اپنی تاریخین لکھین، اس لئے جو مسائل ان کے
نقطۂ نظر سے اہم تھے، وہ ہمارے لئے غیر اہم ہین، اور جن مسائل کو ہم ضروری سمجھتے ہین، ان کو انھون نے غیر ضروری سمجھ کر یا تو
نظر انداز کر دیا ہے، یا بہت ہی اختصار کے ساتھ لکھا ہے تاہم اگر آج کل کے لکھنے والون کے حوصلے بلند اور ارادے اچھے ہون
تو ان ہی معاصر تاریخون سے اپنی ضرورت کا اچھا خاصہ مواد فراہم کر سکتے ہین، میرے استاد مولانا شبلی مرحوم فرمایا کرتے تھے کہ
تاریخی تحقیق مین چیونٹیون کے منہ سے شکر کے دانے جمع کر کے مٹھائی تیار کیا کرتے ہین، اگر اسی طرح صبر، محنت اور استقلال کو راہ
دیکر کوئی ریسرچ کرنے کی کوشش کرے تو کوئی وجہ نہین کہ ہر موضوع پر اس کو ہر قسم کے معلومات نہ ملتے جائین، مگر موجودہ
دور کے محققین کے مشاغل اس قدر گوناگون ہین، اور محنت کے بھی ابھی زیادہ عادی نہین ہوئے ہین، اس لئے ان کی کوشش
صرف یہ ہوتی ہے کہ معاصر تاریخون مین جو واقعات اور تفصیلات فارسی زبان مین سیدھے سادے طریقے پر درج ہین، وہ اپنے
اپنے ذوق کے مطابق انگریزی اردو اور ہندی زبان مین تھوڑی تنقید اور نکتہ چینی کے ساتھ منتقل کر دین، اسی طرح انگریزی
اردو اور ہندی مین لٹریچر فراہم ہو کر ان زبانون کی تو خدمت ہو جاتی ہے، یا اوسط درجہ کے علم اور تاریخی مذاق رکھنے والون اور
یونیورسٹی کے طالب علمون کے لئے تو کتابین حاصل ہو جاتی ہین، مگر ان تحقیقات سے صحیح معنون مین گذشتہ عہد کی قومون کی
موجودہ نسلون کی نہ ذہنی پیاس بجھتی ہے، اور نہ وہ اپنے ماضی کی صحیح تصویر دیکھ کر اپنے مستقبل کو امید افزا پاتے ہین، کیونکہ ماضی
شاندار ہے تو مستقبل کو شاندار بنانے مین حوصلہ بڑھتا ہے، اور قومی خودی پیدا ہوتی ہے، اسی لئے کسی قوم کو نقصان پہنچانے
کا ایک کارگر حربہ یہی ہوتا ہے کہ اس کا ماضی خود اس کے سامنے بہت ہی بُرے اور نفرت انگیز طریقے پر پیش کیا جاتا ہے، جس

سے وہ شعوری اور غیر شعوری طور پر متاثر ہو کر اپنی تمام تاریخی اور تمدنی روایات سے رفتہ رفتہ متنفر ہو جاتی ہے، اتفاق سے اس قسم کے حربے سے فائدہ اٹھانے کے لئے معاصر تاریخوں میں ہر طرح کا مسالہ موجود ہے،

یہ معاصر فارسی تاریخیں عہد سپہ گری میں ایرانی مذاق کے مطابق لکھی گئیں، اس زمانہ میں سب سے بڑا ذاتی وصف سپہگری میں کمال حاصل کرنا تھا، ہر فرد اپنا جوہر میدانِ جنگ میں دکھانا فخر سمجھتا تھا، اہلِ قلم اہلِ سیف کی طرح لڑائی کے میدان میں شریک نہ ہو سکتے تھے، تو اپنی سپہگری کے سارے جذبات کاغذ کے صفحات پر منتقل کرنے کی کوشش کرتے تھے، اسی لئے ان کی ساری تاریخیں جنگ و جدل اور معرکہ آرائی کا مرقع ہیں، جن کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اس عہد کی تاریخ محض کشت و خون کی داستان ہے، مؤرخوں کے ان ذاتی رجحانات کی بنیاد پر تاریخ کے بہت سے اہم رُخ پر پردے پڑ گئے ہیں، اور اب معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے سلاطین نے لڑنے بھڑنے کے سوا کچھ اور کام ہی نہیں کیا، انگریزی دان طبقہ پر یہ خیال سر ہنری ایلیٹ کی تاریخ ہند کے ذریعہ سے اور بھی زیادہ گہرے طور پر منقوش ہوا، ہنری ایلیٹ کا یہ احسان ناقابلِ فراموش ضرور ہے کہ اس نے غیر معمولی تلاش و جستجو سے ہندوستان کی کمیاب اور نادر عربی جغرافیوں اور فارسی تاریخوں کا پتہ لگا کر ان کے انگریزی ترجمے اور اقتباسات اپنی مذکورہ بالا کتاب میں محفوظ کر دیئے ہیں، اور آج بہت سے محققین کے لئے وہ ہدایت کا چراغ ہے، مگر یہ کہنا پڑے گا کہ ایلیٹ نے ان ترجموں میں دیانتداری سے کام نہیں لیا، جن کتابوں کے ترجمے اور اقتباسات اس نے اپنی کتاب میں شامل کئے ہیں، ان میں جابجا علمی، تمدنی، عمرانی اور غیر سیاسی تفصیلات کچھ نہ کچھ ضرور ہیں، لیکن ان کو اس نے قصداً حذف کر دیا ہے، اب فارسی سے ناآشنا اور ایلیٹ کی کتاب کو اپنا گائڈ بنانے والا محقق مسلمان سلاطین کے عہد کو صرف خون آلود اور خون آشام پاتا ہے، جس کے ذہنی اثرات مدتوں کی تحقیق و کوشش کے بعد بھی مشکل سے مٹ سکیں گے، ایلیٹ شروع انگریزی عہد کا آدمی ہے، اور یہ ایک گونہ سرکاری حیثیت بھی رکھتا ہے، اور اس نے اپنے کام کا مقصد چھپا کر نہیں رکھا ہے، اس نے صاف طور سے یہ ظاہر کر دیا ہے کہ اس کے پیشِ نظر تمام تر یہ ہے کہ اپنے اگلے پیشرو حاکموں کے غیر منصفانہ عہد کی تاریکی کو دکھا کر اپنی قوم کے عہدِ حکومت کی روشنی دکھائے، تاکہ ہندوستان کے رہنے والے اس کو سایۂ رحمت سمجھ کر اس کو اطاعت مندانہ اخلاص کا خراج ہمیشہ پیش کیا کریں، (دیباچہ ص ۲۲)

ابھی عرض کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی تاریخیں ایرانی ذوق کے مطابق لکھی گئی ہیں، مختلف مؤرخوں نے تاریخیں لکھ کر زیر نظر عہد کے سیاسی واقعات تو مسلسل اور مربوط طریقہ پر مرتب کر دیئے ہیں، لیکن ان ایرانی مذاق کے مؤرخوں نے بادشاہی درباروں سے باہر نکل کر دنیا کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی، ان کے نزدیک بادشاہ کا دربار ہی ساری دنیا تھی، عرب اور ایرانی مؤرخوں کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے، عرب مؤرخ دربار کا مؤرخ نہیں ہوتا، بلکہ زمانہ کا مؤرخ ہوتا ہے، اسی لئے اس کی تاریخ کی تقسیم بادشاہوں کے نام پر نہیں بلکہ سال پر ہوتی ہے، طبری، ابن اثیر، ابو الفدا وغیرہ مؤرخوں نے اسی طرز پر اپنی تاریخوں کی بنیادیں ڈالی ہیں، عرب کا مؤرخ نہ صرف بادشاہوں کی جنگ و صلح کے واقعات کو زیر تحریر لاتا ہے بلکہ ضمناً اس زمانہ کے تمدنی علمی اور معاشی حالات بھی ضرور قلمبند کرتا جاتا ہے گو ان میں ترتیب نہیں ہوتی ایک ابن بطوطہ کو دیکھئے کہ مغرب اقصیٰ کے اس سیاح کے ہاتھوں محمد تغلق کے عہد کا جتنا واضح اور روشن مرقع ہمارے سامنے موجود ہے وہ اس دور کے کسی اور سلطان کی حکومت کا نہیں، ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامہ میں بہت سے سیاسی واقعات ایسے بھی لکھے ہیں جن کا فارسی تاریخوں میں بہت کم پتہ چلتا ہے، لیکن تحقیقات نے ان کی صحت و درستی کو ثابت کر دیا ہے، معبر یعنی کارومنڈل میں حسن کیتھلی کی اسلامی ریاست کا اس نے ذکر کیا ہے اس کا ثبوت آثارِ قدیمہ کے سکوں نے بہم پہنچایا، اور حیدرآباد کے حکیم شمس اللہ قادری نے ۱۹۲۸ء میں سلاطین معبر کے

نام سے اس پر ایک اچھا مقالہ لکھا ہے، ملتان کے مدرسہ کا نام صرف ابن بطوطہ نے بتایا ہے، سندھ کے سومری بادشاہون کی حقیقت بھی ابن بطوطہ سے معلوم ہوئی، ہندوستان اور چین کی بحری تجارت کا حال اور جہازون کی آمد و رفت کی کیفیت بھی اوسی سے معلوم ہوئی، بنگال کا نقشہ اس نے فارسی کے دو حرفوں میں کھینچا ہے جہنم پُر از نعمت، ترکستانی ترکون نے بھی اس کو یہی لقب دیا تھا، ملیبار مین اسلامی آبادیون کا ذکر اوسی نے کیا ہے، سندا پور یعنی گوا کی عرب اسلامی سلطنت کا حال اسی سے معلوم ہوا، جو تور احاطہ بمبئی کے عرب سلطان کی داستان اسی نے سُنائی، ملیبار اور جزائر کے ہندو راجاؤن کے قصے اسی سے معلوم ہوئے،

محمد تغلق نے چونکہ مصر کے عباسی خلیفہ سے تعلق پیدا کر لیا تھا، اس لئے ہندوستان اور مصر کے درمیان سفیرون، سیاحون اور علما کی آمد و رفت کا دروازہ کھل گیا تھا، اور اس راہ سے اس زمانہ کی ہندوستان کی تاریخ کا بہت سا سامان عرب مورخون کے بھی ہاتھ آیا، چنانچہ اس عہد کے مصری مورخ ابن فضل اللہ المتوفی ۷۴۹ھ نے اپنی مسالک الابصار فی ممالک الامصار مین اس زمانہ کے ہندوستان کے جو تمدنی و تجارتی اور اقتصادی اور فنی حالات لکھے ہین، اس عہد کی پوری فارسی تاریخ مین نہین مل سکتے؛ کیا ہندوستان کے کسی فارسی تاریخ مین آپ کو یہ لکھا مل سکتا ہے، کہ ان سلاطین کے زمانہ مین ہندوستان کی تعلیم کا کیا حال تھا، اور کتنے مدارس قائم تھے، لیکن ابن فضل اللہ کا بیان سنئے جو لکھتا ہے کہ محمد تغلق کے زمانہ مین صرف دلی مین ایک ہزار مدرسے، اشفاخانے اور دو ہزار خانقاہین تھین، یا وہ مشہور شاہی مدرسہ جو فیروز شاہ تغلق کے زمانہ مین دلی مین شاہانہ فیاضی سے قائم ہوا تھا، وہ کیسا تھا، اس کی تعلیم کیا تھی، کون کون بڑے بڑے مدرسین تھے، فارسی کی لفاظانہ انشا پردازی مین اس کا بیان ضیاء برنی نے صفحون مین کیا ہے، مگر اس کا حاصل کچھ نہین، بدر چاچ اور مطہر کڑہ اس عہد کے دو شاعرون نے اس مدرسہ کا جو ذکر اپنے قصائد مین کیا ہے اس کو پڑھکر اس کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لئے ہم آج بے قرار ہین مگر نہیں کر سکتے،

مسالک الابصار کے بیان کا یہ حصہ جو ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہے فرانسیسی اور انگریزی مین ترجمہ ہو گیا ہے، اوس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ عرب مورخ کی نگاہ مین کتنی وسعت ہوتی ہے، ابن فضل اللہ کے بعد مصر کے دوسرے مورخ قلقشندی المتوفی ۸۲۱ھ نے اپنی کتاب صبح الاعشی فی کتابۃ الانشا مین اس حصہ کو نقل کر دیا ہے، اور ہماری اکاڈمی نے چودہ برس ہوئے کہ اس کا ترجمہ معارف دسمبر ۱۹۳۰ء مین شائع کر دیا ہے، اس عہد کے عرب سوانح نگارون نے بھی آٹھوین اور نوین صدی ہجری کے اکابر کے حالات مین اپنے زمانہ کے ہندوستانی بادشاہون کو بھی جگہ دی ہے، جیسے ابن حجر مصری نے الدرر الکامنۃ فی اعیان المائۃ الثامنۃ مین، شمس الدین سخاوی نے الضوء اللامع فی القرن التاسع مین جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے متعدد سلاطین فضل و کمال کے لحاظ سے اہل علم مین شمار کئے جانے کے لائق تھے،

اگر ہر دور مین ایک ابن بطوطہ، ایک ابن فضل اللہ، اور ایک ابو العباس احمد قلقشندی ہوتا، تو آج ہندوستان کے زیر نظر عہد کی تاریخ اس سے بالکل مختلف ہوتی، جو آج نظر آتی ہے، تیموریون کے مقابلہ مین سلاطین دہلی کا زمانہ عام طور سے ہم نہین سمجھا جاتا ہی، اس کی وجہ یہ نہین کہ اس عہد کے سارے حکمران ادنیٰ درجہ کے تھے، یا ان کا نظام سلطنت اتنا مکمل و مرتب نہ تھا، جیسا کہ اُن کے بعد کے فرمانرواؤن کا تھا، بلکہ اس کا اصلی سبب یہ ہے کہ ان کی سیاسی سطوت اور تمدنی عظمت کی صحیح تصویر پیش کرنے والا کوئی مورخ پیدا نہین ہو سکا، ورنہ خود ان سلاطین نے اپنے شاندار ملکی جنگی اور کلچرل کارنامون کو باضابطہ تحریر مین لانے کی کوشش کی، اگر اس دور مین کم از کم کوئی ابو الفضل، کوئی عبد الحمید لاہوری، کوئی عبد الباقی نہاوندی اور کوئی محمد کاظم بھی پیدا ہو جاتا تو ان سلاطین کی تاریخ ویسی ہی پر شکوہ اور باوقار معلوم ہوتی جیسی وہ درحقیقت تھی، موجودہ دور کے محققین کا اب یہ فرض ہے کہ اس زمانہ کے تاریخی سرمایہ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالین، اور مورخین کی گذشتہ تغافل کی

تلاش کرین، اس عہد کا جو کچھ تاریخی لٹریچر ہے، وہ زیادہ تر یا تو یورپ یا کسی اور جگہ کے کتب خانون مین قلمی نسخون کی شکل مین زینت و آرایش کی خاطر رکھ چھوڑا گیا ہے، ان کتب خانون مین بیٹھکر جو کوئی بھی ان قلمی نسخون کے ذریعہ سے اچھے اور بُرے صحیح و غلط معلومات فراہم کر دیتا ہے، ہم انہی پر اکتفا کر لیتے ہین، ان کی حقیقی اور غیر حقیقی تعبیر و تصریح پر ہم کسی قسم کی روشنی ڈالنے سے بالکل قاصر رہتے ہین، اگر غیر مطبوعہ لٹریچر طبع اور شائع ہو کر سہولت سے ملنے لگے، تو محققین کا کام بہت ہی آسان اور ہلکا ہوجائے

ہم بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کے ممنون ہین کہ اس کی طرف سے بہت سی کتابین شائع ہو گئی ہین، علی گڈھ کے اساتذہ نے بھی مفید کتابون کا اضافہ کیا ہے، آگرہ یونیورسٹی، لاہور اورنٹیل کالج اور حیدر آباد کے کچھ اصحابِ قلم نے بھی بعض قلمی نسخون کو محنت کے ساتھ اڈٹ کر کے تاریخ ہند کے شائقین کو مرہون منت کیا ہے، مگر پھر بھی بہت سا ایسا لٹریچر ہے جس کے نہ ملنے کی وجہ سے محققین کی راہ مین ہر قسم کی رکاوٹین ہین، اس لئے اگر خود کانگریس یا تاریخ کا کوئی ادارہ ایسا قائم ہو جائے کہ ان کتابون کا پتہ لگائے، ان کی نقلین اور فوٹو بہم پہنچائے، یا اُن کو اڈٹ اور شائع کر کے اہلِ تحقیق کے ہاتھون تک پہنچائے تو ایک بہت بڑی کمی پوری ہو جائے، مثلاً غلامون کے عہد مین حسن نظامی نے تاج المآثر مین بعض غلام سلاطین کے حالات لکھے ہین، لیکن اس کی عبارت آرائی کی وجہ سے اس کی تاریخی اہمیت نہین دی جاتی ہے، اور یہ کہکر اس کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اس مین واقعات کم اور الفاظ کا طومار زیادہ ہے، شاید اسی لئے یہ اب تک نہین چھپ سکی ہے، اس مین واقعات کم ہون، مگر اس کی سطرون کے درمیان بعض ایسی ضروری چیزین مل جاتی ہین جن سے اس زمانہ کے بعض تمدنی کلچرل اور عمرانی پہلو واضح ہو جاتے ہین، جس طرز کی عبارت اس مین استعمال ہوئی ہے، اس سے اس زمانہ کے علمی اور انشا پردازانہ ذوق کا بھی اندازہ ہوتا ہے، اس کے شائع ہونے سے اس عہد کے تاریخی اور علمی حالات کا جائزہ لینے مین کچھ نہ کچھ ضرور مدد مل سکتی ہے، التمش کے زمانہ حکومت مین آداب الحرب والشجاعہ لکھی گئی، جو اس عہد کے حربی و فوجی معلومات کے لئے ایک بیش قیمت ماخذ ہے، اورنٹیل کالج لاہور نے اس کا کچھ حصہ شائع کیا ہے، مگر اس کے مکمل نسخہ کی کمی غیر معمولی طریقہ پر محسوس ہو رہی ہے، اسی زمانہ مین محمد عوفی نے التمش کے دربار مین رہ کر جامع الحکایات و لوامع الروایات لکھی، جو گو نقلون اور کہانیون پر مشتمل ہے، لیکن ان سے بعض اوقات بہت سی تاریخی اور معاشرتی تفصیلات واضح ہوتی ہین، ضیاء الدین برنی نے اپنی تاریخ فیروز شاہی مین طبقات ناصری، تاج المآثر اور جوامع الحکایات کے مولفون کے علاوہ کبیر الدین ابن تاج الدین عراقی کا بھی نام لیا ہے، جس نے علاء الدین خلجی کی فتوحات کی تاریخ لکھی تھی، لیکن اس کتاب کا اب تک کہین پتہ نہین چل سکا ہے، تیموریون کے آخری دور کے ہندو مورخ سبحان رائے نے اپنی خلاصۃ التواریخ مین عز الدین خالد خانی کی کتاب تاریخ فیروز شاہی مین کیا ہے، لیکن اس کے متعلق بھی اب تک کسی کتب خانہ میں کوئی پتہ نہین چلا، خالد خانی کی ایک دوسری تصنیف دلائل فیروز شاہی کا ذکر فرشتہ نے کیا ہے، مگر وہ اقسام حکمت علمی و عملی مین ہے، تاریخ فیروز شاہی کے مولف شمس سراج عفیف کی ایک کتاب مناقب سلطان محمد بھی لاپتہ ہے، ایک نامعلوم مصنف کی ایک اہم کتاب سیرت فیروز شاہی کا واحد نسخہ خدا بخش خان کے کتب خانہ پٹنہ مین موجود ہے، مگر اب تک کسی اہلِ علم یا ادارہ نے اس کو شائع کرنے کی تکلیف گوارا نہین کی ہے، امیر تیمور کی طرف دو کتابین تزک تیموری اور ملفوظات تیموری منسوب ہین، دونون ایک ہی چیزین ہین، مگر بمبئی کے مطبوعہ نسخہ تزک تیموری و ورالیٹ کے اقتباسات ملفوظات تیموری مین بڑا اختلاف ہے، ملفوظات تیموری، مترجمہ ابو طالب حسینی کو تو جعلی بتایا گیا ہے، لیکن اس کی تحقیق اب تک نہین ہوئی ہے کہ بمبئی کا مطبوعہ نسخہ تزک تیموری مستند ہے، یا غیر مستند، لودیون کی کسی معاصر تاریخ کا پتہ اب تک معلوم نہین ہو سکا ہے

طبقاتِ اکبری، تاریخ فرشتہ، واقعاتِ مشتاقی اور تاریخ داؤدی سے اس خاندان کی تفصیلات معلوم ہو جاتی ہیں، مگر یہ تمام کتابیں تیموریوں کے دور میں لکھی گئیں، اسی طرح یہ یقین کرنے کو جی نہیں چاہتا ہے کہ سوریوں کے زمانہ میں ان کی حکومت کی کوئی تاریخ مرتب نہ ہوئی ہو گی، یا تو اس عہد کی معاصر تاریخیں نظروں سے اوجھل کہیں پڑی ہیں، یا تلف ہو گئی ہیں، تیموریوں کے دور میں سوریوں کے حالات تاریخ شیر شاہی (مؤلفہ عباس خان سروانی) مخزن افغانان (مؤلفہ نعمت اللہ) اور تاریخ داؤدی (مؤلفہ عبد اللہ) میں لکھے گئے، عباس خان سروانی کی تاریخ شیر شاہی ایک اہم اور مفید لٹریچر ہے جو اگر چھپ کر محققین کے ہاتھوں تک پہنچ جائے تو ایک مفید کام ہو،

بابر کی تاریخ کے لئے خود اس کی تزک بابری اور اس کے خالہ زاد بھائی میرزا حیدر دوغلت کی تاریخ رشیدی اہم کتابیں ہیں تزک بابری کے انگریزی ترجمے کو جن مفید حواشی اور تشریحات کے ساتھ اے، اس، بیورج نے شائع کیا ہے اس کے احسان کی گران باری ہمیشہ رہے گی، اس کے اوریجنل ترکی نسخہ کی تو نہیں مگر اوس کے اس فارسی ترجمہ کے طبع ہونے کی پھر بھی ضرورت ہے جو عبد الرحیم خان خانان نے اکبر کے لئے کیا تھا، تاریخ رشیدی میں وسط ایشیا کے مغلوں اور خصوصاً چغتائیوں کے حالات زیادہ ہیں مگر یہ کتاب ہندوستان میں لکھی گئی، اور بابر اور ہمایوں کے متعلق بعض مفید معلومات فراہم کرتی ہے، مسٹر ڈے نی سن روس نے اس کا انگریزی ترجمہ کرکے اس کتاب کے اوریجنل فارسی نسخہ سے محققین کو ضرور بے نیاز کر دیا ہے، مگر ترجمے خواہ کتنے ہی معتبر اور مستند ہوں صرف ان ہی پر بھروسہ اور اعتماد کرنا تحقیق کے اعلیٰ معیار کو کم کرنا ہے، بعض اوقات ان ترجموں کی غلطیوں اور کمزوریوں سے واقعات کے استنباط اور نتائج کے اخذ کرنے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں، ان کا ہلکا سا اندازہ مسٹر ہوڈی والا کی کتاب Studies in Indo-Muslim History کے مطالعہ سے ہو گا، اس کتاب میں مسٹر ہوڈی والا نے ایلیٹ کی جو غلطیاں دکھائی ہیں انکو پڑھنے کے بعد محققین کو ایلیٹ پر شاید اعتماد کلی باقی نہ رہا ہو گا، اسی طرح تاریخ یمینی طبقاتِ ناصری اور تاریخ فرشتہ کے انگریزی ترجمہ پر جو نکتہ چینیاں ہوتی رہی ہیں، ان کو پیش نظر رکھتے ہوئے ترجموں کی زیادہ اہمیت تحقیق کے سلسلہ میں نہیں دی جا سکتی ہے،

حضرات! مجھ سے پہلے شاید اس کرسی سے آپ کی توجہ اس بات کی طرف دلائی گئی ہو گی، کہ مرکزی حکومتوں کے ساتھ ساتھ مختلف صوبوں میں جن خاندانوں نے حکمرانی کی، ان کی تاریخ نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہے، اول تو صوبوں کے والیوں کے مختلف کارناموں کی اتنی تفصیلات ہیں کہ ان کو قلمبند کیا جائے، تو ہر صوبہ کی علحدہ علحدہ تاریخ ہو گی، پھر مرکزی حکومتوں کی حریف یا باجگذار ریاستیں تو مستقل تاریخ کی مستحق ہیں، احسن آباد گلبرگہ کے بہمنی خاندان بیجاپور کے عادل شاہی سلاطین تلنگ کے قطب شاہی بادشاہوں، برار کے عماد شاہی حکمرانوں اور بیدر کے برید شاہی والیوں نے جنوبی ہندوستان کی سیاست معاشرت، تمدن اور آرٹ پر گہرے نقوش چھوڑے ہیں، مالوہ اور منڈو میں خلجی، برہان پور میں فاروقی خاندان اور گجرات میں مظفر شاہی حکمرانوں کے کارنامے فراموش نہیں کئے جا سکتے ہیں، گجرات کی خود مختار سلطنت اپنی علمی و تجارتی و بحری ترقیوں میں دلی کی مرکزی سلطنت سے کہیں بڑھ کر ہے، اسی طرح بیجانگر کی تاریخ بھی ہماری توجہ کی مستحق ہے اور یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں کہ اس ہندو سلطنت کی جنگی طاقت میں مسلمان سپاہیوں کو بھی خاص حیثیت حاصل تھی، ٹھٹھ اور سندھ میں ایلتتمش کے حریف حکمرانوں تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ کا دربار دلی کے دربار سے کم پرشکوہ اور پروقار نہیں رہا، ناصر الدین قباچہ کے بعد یہاں خاندان جام کی حکومت قائم ہوئی، تو اس کے تاریخی واقعات بھی گوناگوں رہے، ملتان کے لنگاہ سلاطین کی حربی عظمت اس دور میں اس لئے بھی کہ ان کی حکومت ایک اہم سرحد پر واقع تھی، جنت نظیر کشمیر کے بادشاہوں کے حالات تاریخی لٹریچر کے لئے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں مذکورۂ بالا حکومتوں اور فرمانرواؤں کی تاریخ کی تدوین کے لئے ابھی حال ہی سے ہمارے موجودہ محققوں نے اپنی علمی جدوجہد کا

ثبوت دینا شروع کیا ہے، عثمانیہ یونیورسٹی کے بعض اساتذہ دکن کی بعض حکومتوں خصوصاً بہمنی خاندان کے مختلف کارناموں کو روشن کرنے کی کوشش کر رہے ہیں، احمد آباد کی اینگلو ورنیکولر سوسائٹی گجرات کے اسلامی دور کی بھی تاریخ لکھا رہی ہے، سر جدوناتھ سرکار کی نگرانی میں بنگال کے ابتدائی مسلمان بادشاہوں کی تاریخ کی ترتیب کی بھی خبر ملی ہے، ان مختلف خاندانوں اور ریاستوں کی تاریخی تحقیقات میں ایک بڑی مشکل یہ بھی ہے کہ ان ماخذ کی بڑی کمی ہے، خصوصاً معاصر تاریخوں کا پتہ تو بالکل نہیں ملتا ہے، ان کی تاریخ زیادہ تر ایسی کتابوں میں ملتی ہے جو تیموری دور میں لکھی گئیں

فرشتہ نے بہمنی خاندان کی تاریخ کے ماخذ میں حاجی محمد قندھاری کا بہمن نامہ، ملا داؤد بیدری کی تحفۃ السلاطین اور ملا عبد الکریم سندھی کی سوانح محمود گاوان کا ذکر کیا ہے، فرشتہ نے شاہ خور نامی ایک مورخ کا نام بھی لکھا ہے جس نے ابراہیم قطب شاہ کے عہد میں عراق سے آکر ہندوستان میں وقائع قطب شاہی لکھی تھی، مگر ان تمام کتابوں کا کہیں پتہ نہیں، گجرات کی ایک معاصر تاریخ "تاریخ محمود شاہی" ہے جو ۸۶۳ھ سے ۹۱۰ھ تک کے واقعات پر مشتمل ہے، گجرات کے مظفر شاہ ثانی کے محاصرہ مانڈو پر بھی ایک نامعلوم مؤلف کی کتاب ہے جو شاید اسی زمانہ میں لکھی گئی، مگر یہ دونوں کتابیں ابھی تک غیر مطبوعہ ہیں، ان دونوں کتابوں کے علاوہ گجرات کے مظفر شاہی خاندان کی معاصر تاریخوں کا حال معلوم نہیں، مالوہ کی تاریخ پر صرف ایک کتاب تاریخ ناصر شاہی کا پتہ ملتا ہے جس میں مالوہ کے حکمران ناصر الدین عبد القادر شاہ کی حکمرانی کے واقعات ۹۰۶ھ سے ۹۱۶ھ تک کے درج ہیں، مگر یہ بھی ابھی تک قلمی نسخہ کی شکل ہی میں ہے، عادل شاہی، برید شاہی، عماد شاہی حکومتوں، برہان پور کے فاروقی خاندان، سندھ، کشمیر، ملتان، بنگال اور جونپور کے سلاطین کی بھی معاصر تاریخیں نہیں، لیکن معاصر ماخذ نہیں ملتا ہے تو بعد کی لکھی ہوئی مستند تاریخوں ہی سے فائدہ اٹھا کر مختلف صوبوں اور ریاستوں کے واقعات قلمبند کرنے چاہئیں مگر اس کے لئے ضروری ہے کہ غیر مطبوعہ مخطوطات کو چھاپ کر زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے،

حضرات! زیر نظر عہد کی تاریخ کی ترتیب میں شعراء کا کلام اور علماء و صوفیہ کی تصانیف بھی قیمتی ماخذ ہو سکتی ہیں، ہم اپنی تحقیقات میں زیادہ تر مختلف سلاطین اور فرمانرواؤں کے واقعات کو تحریر میں لانے کی کوشش کرتے ہیں، مگر تاریخ صرف بادشاہوں کے کارناموں کا نام نہیں، ہر زمانہ میں ملک کی عام علمی، تمدنی، معاشرتی اور اخلاقی کیفیات کا جائزہ لینا تاریخ کا اہم موضوع ہے، چنانچہ پیش نظر دور کے شعراء میں سے ناصری خراسانی، محمد عوفی، امیر روحانی سمرقندی، ابو الفرج رونی، تاج الدین دبیر، شہاب مہمرہ، امیر فخر الدین عمید تولکی، بدر چاچ، مطہر کڑہ، خسرو، حسن سجزی، عبید، اعز الدین خالدخانی اور شمس الدین وغیرہ کے کلام کا استقصا کیا جائے تو اس عہد کی نہ صرف علمی ترقیوں کا اندازہ ہوگا، بلکہ ان اشعار کے درمیان بہت سے تاریخی واقعات کی بھی جھلک نظر آئے گی، مگر افسوس ہے کہ ان میں سے بہت کم ایسے خوش نصیب شعراء ہیں جن کا کلام اور دیوان چھپ کر اہل علم کے ہاتھوں تک پہنچ سکا ہے، اسی وجہ سے ان کی تحریروں کے ذریعہ سے کسی قسم کی تحقیق کرنے کی اب تک کوئی کوشش نہیں کی گئی ہے، امیر خسرو کی نظمیں چھپ گئی ہیں، تو ان سے تحقیقات کے سلسلہ میں مدد بھی لی جا رہی ہے،

صوفیہ کرام کی تصانیف ہندوستان کے اسلامی عہد کی مذہبی، اخلاقی اور معاشرتی تاریخ کے لئے ایسی ضروری ہیں کہ ان کے بغیر تینوں پہلوؤں کی تصویر واضح نہیں ہو سکتی ہے، ہندوستان کے اسلامی دور میں دو قسم کی بادشاہت ساتھ ساتھ قائم تھی، ایک تو تخت و تاج کے حکمرانوں کی اور دوسری خانقاہ کے بوریا نشینوں کی، ایک توپ و تفنگ سے مملکت کو اپنے زیرنگین کرتے تھے، تو دوسرے اپنے بلند اخلاق اور اعلیٰ اوصاف کے ذریعہ سے ذہن و قلب کو تسخیر کرتے تھے، اور آج یہ کہنا مشکل ہے کہ دونوں میں کس کے اثرات زیادہ غالب رہے، مگر اتنا تسلیم کرنا پڑے گا کہ آج بھی ان صوفیہ کرام کی تصانیف ذہن کی پراگندگی کو سکون قلب کے انتشار کو اطمینان اور گمراہوں کی کجروی کو ہدایت بخشنے میں کامیاب اور موثر ہیں، چنانچہ ان کی تصانیف کو بجا طور

سے اسلامی دور کا ایک بیش قیمت خزانہ کہا جاسکتا ہے، اور اس دور کے مذہب، اخلاق اور معاشرت مین ان صوفیائے کرام نے جو انقلابات پیدا کئے ان کو صحیح طور پر سمجھے بغیر اس عہد کی تاریخ مکمل نہین ہو سکتی، خواجہ معین الدین چشتیؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، خواجہ فریدالدین گنج شکرؒ، خواجہ شہاب الدین علی ہمدانیؒ، خواجہ نظام الدینؒ احمد بدایونی، خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی، بوعلی قلندرؒ، ضیاء الدین نخشبیؒ، خواجہ رکن الدین عماد کاشانی، حضرت شرف الدین یحیی منیریؒ، خواجہ گیسو درازؒ، شیخ عبدالقدوس گنگوہیؒ، حضرت اشرف جہانگیر سمنانی، محمد غوث گوالیاریؒ، میر خورد دہلوی، عبداللہ شطاریؒ وغیرہ کی تصنیفات، مکتوبات اور ملفوظات مین اگر تلاش کیا جائے تو زیر نظر عہد کی تاریخ کے لئے بہت سے مواد فراہم ہو سکتے ہین، اور ان سے اخلاق و معاشرت کے رُخ بہت اچھی طرح روشن ہو سکتے ہین، مگر ان تصانیف کی طرف تاریخ ہند سے دلچسپی لینے والے محققین کی توجہ بالکل نہین رہی ہے، اس لئے ان کی نظرین بھی سلاطین کے میدانِ جنگ کے کشت و خون ہی تک محدود رہی ہین،

ان صوفیۂ کرام کے ساتھ علماء نے بھی ہندوستان کو ذہنی اور علمی حیثیت سے مالا مال کیا، زیر نظر دور مین عرب اور وسط ایشیا کے ارباب کمال سے ہندوستان علم و فن کا مرکز بنا ہوا تھا، ان علماء نے اس عہد کی مختلف زبانون مین جو تصانیف کی ہین ان کے مقدمہ یا خاتمہ مین اپنے زمانہ کے بادشاہون کا کچھ نہ کچھ نام و نشان اور حال بھی لکھا ہے خواہ وہ کتاب کسی فن پر لکھی گئی ہو، جیسے نصاب الاحتساب، فتاویٰ تاتارخانی، تفسیر تاتاری، تفسیر بحر مواج دولت آبادی، طب معدن الشفا سکندری، تصوف عین الحیوٰۃ، ترجمہ امرت کنڈ، باراہی سنگھتا بھٹ بن ماراہ مہر کی کتاب ہیئت کا فارسی ترجمہ، ملا عبدالنبی احمد نگری کی دستور العلماء وغیرہ،

حضرات! اب تک ہمارے موجودہ محققین کی جماعت زیر نظر عہد کے سلاطین کے سیاسی، حربی اور ملکی کارنامون کی تفصیلات لکھنے مین منہمک رہی ہے، اس دور کے حکمرانون کی مختلف تعمیرات کی جیتی جاگتی یادگارون کا مطالعہ کرکے یورپین اہل قلم ان کے اس آرٹ اور فن کے کمال کی داد دیتے رہے ہین مگر اس زمانہ مین علوم و فنون، تعلیم، تمدن، معاشرت، رفاہ عام کے کام، زراعت، حیوانات، صنعت و حرفت اور تجارت مین جو ترقیان ہوئین، ان کا استقصا صحیح طور پر نہین ہو سکا ہے، اس عہد کے علوم و فنون کی ترقی پر کلکتہ یونیورسٹی کے ایک اہل علم نے اپنی کتاب Promotion of Learning in India during the Mohammadan rule کے چند ابواب مین روشنی ڈالی ہے، پٹنہ یونیورسٹی کے ایک لکچرر نے اس دور کے دو چار شعراء کے حالات لکھے ہین، لکھنؤ یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے امیر خسرو پر ایک کتاب لکھی ہے، ناگپور یونیورسٹی کے ایک پروفیسر نے "ہندوستان کے عہد مغلیہ سے پہلے دور کی فارسی" کے نام سے ایک کتاب پیش کی ہے، مگر پھر بھی اس عہد کے ادب و شاعری کی صحیح تصویر سامنے نہین آسکی ہے، تعلیمی نصاب اور تعلیمی ادارے کا ہلکا سا خاکہ ہماری اکاڈمی کی ایک تالیف "اسلامی درسگاہین" سے مل جاتا ہے، ہماری جماعت ندوۃ العلماء کے سابق ناظم مولانا حکیم سید عبدالحی صاحب مرحوم نے بیس برس کی عرق ریزی سے عربی مین دس جلدون مین فتح سندھ سے لیکر اخیر اسلامی عہد تک ہندوستان کے علماء و مشائخ و شعراء و مورخین کے حالات جمع کئے ہین، جو بڑا نادر سرمایہ ہے، یہ اگر چھپ جائے تو محققین کی عمرون کا بہت بڑا حصہ ان معلومات کی تلاش و محنت مین ضائع ہو جانے سے بچ جائے، صرف اس کا ایک حصہ جو آٹھوین صدی ہجری سے متعلق ہے، دائرۃ المعارف حیدرآباد سے شائع ہوا ہے، مگر افسوس کہ پوری کتاب اب تک حلیۂ طبع سے محروم ہے، ابھی حال مین ہمارے فاضل دوست مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ نے "ہندوستان مین اسلامی نظام تعلیم و تربیت" پر ایک پر معلومات کتاب اردو مین لکھی ہے جس مین شروع سے لے کر اس وقت تک تعلیم و تربیت کے اصول اور طریقون اور تصنیف و تالیف اور کتابون

کی فراہمی وغیرہ کے حالات لکھے ہیں زیر نظر عہد کی عام معاشرتی اقتصادی اور تجارتی تفصیلات کا ایک اچھا خلاصہ ڈاکٹر کنور اشرف کے قلم سے بنگال ایشیاٹک سوسائٹی کی اشاعت Life and Condition of the People of Hindustan (1206-1526) میں پیش کیا گیا ہے، ڈاکٹر اشتیاق کی کتاب سلاطین دہلی کے نظام سلطنت پر قابل تحسین ہے،

اس عہد پر جتنی کتابیں بھی جاتی ہیں ان میں مختلف تمدنی پہلوؤں کو یا چند پیراگراف یا زیادہ سے زیادہ ایک باب میں لکھ کر ختم کر دیا جاتا ہے، حالانکہ ان میں سے ہر پہلو پر ایک مستقل کتاب لکھی جا سکتی ہے، لیکن اب تک اس کی طرف توجہ نہیں کی گئی ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ اس کے لئے کافی لٹریچر اور مواد موجود نہیں، بلکہ محض اس لئے کہ اس کی تحقیق و تدقیق میں غیر معمولی محنت، تلاش، جستجو اور دقت نظر کی جو ضرورت ہے، وہ ہمارے سامنے محققین کی جماعت میں ابھی پیدا نہیں ہو سکی ہے، اس لئے ہمارے ماضی کے تمدن کا صحیح اور روشن رُخ پیش نہیں ہو سکا ہے، اور ہمارے سامنے گذشتہ تاریخ کے زیادہ تر واقعات ایسے ہیں جن کو پڑھنے کے بعد دکھ اور رنج پہنچتا ہے،

اسی احساس کا نتیجہ ہے کہ میں نے اپنی شبلی اکیڈمی کی طرف سے آج سے چودہ برس پہلے اردو میں ایک مکمل تاریخ ہند لکھوانے کا فیصلہ کیا جس کی تقسیم دس بارہ جلدوں میں کی گئی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی تمدنی و تعمیری ترقی میں مسلمانوں نے کیا کام کیا، بحمد اللہ کہ یہ کام شروع کر دیا گیا ہے، اور اس وقت تک اس کی تین جلدیں مرتب ہو چکی ہیں تمدنی کارناموں کی ایک جلد الگ تیار ہوئی ہے، ممکن ہے کہ اسی موضوع پر کئی اور جلدیں لکھی جائیں،

خدا کا شکر ہے کہ اب اہل ہند کو اس ضرورت کا عام احساس ہو رہا ہے، علی گڈھ مسلم یونیورسٹی نے انڈین ہسٹاریکل سوسائٹی کی بنیاد اسی غرض سے رکھی ہے، بنارس میں بھارت اتہاس پرشد اسی لئے قائم ہوئی ہے، اور ہم نے خوشی سے یہ بھی سنا کہ اس ہسٹاریکل کانگریس نے بھی جس میں ہم آپ جمع ہیں ایک تاریخ ہند لکھوانے کا فیصلہ کیا ہے اور اس کے لئے ہندوستان کی سب سے بڑی دیسی ریاست نے شاہانہ امداد دی ہے، امید ہے کہ یہ تینوں سلسلے کامیابی کے ساتھ اپنے فرض کو انجام دیں گے، مگر ضرورت اصلی یہ ہے جس کا اظہار تقریر کے آغاز میں کیا گیا تھا، اسی کی یاددہانی تقریر کے اختتام پر کی جائے کہ اب اس کے بعد ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزاء کو باہم جوڑنا ہو، توڑنا نہ ہو، حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے اور کیوں مستقبل کے لئے یہ کوشش جاری رہے کہ وہ کبھی خوش آیند نہ ہو سکے

ہندوستان کے مورخو! تم ہندوستان کی صرف تاریخ نہ لکھو بلکہ اپنے کارناموں سے ہندوستان کی نئی تاریخ بھی بناؤ، نیک ارادہ سے اٹھو خدا تمھاری مدد کرے گا،

اشتراکیت اور اسلام

جس میں اسلام اور اشتراکیت کی تعلیمات کے تقابلی مطالعہ اور اشتراکیت کے خلاف فطرت معاشی اصولوں کی علمی و فنی تنقید کی گئی ہے، نیز اس کے مابعد الطبیعی نظریوں پر ایک ناقدانہ نظر بھی ڈالی گئی ہے، ضخامت ۲۰۰ صفحے قیمت عہ

(از مسعود عالم ندوی)

منیجر

عرفانیاتِ فانی

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی

(۲)

تصریحاتِ مذکورۂ بالا سے اہلِ ذوق کو کافی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ فانی نے درد و غم کا جو مرقع پیش کیا ہے، اس میں کس حد تک ایک زندہ روح کی آتش فشانیاں نظر آتی ہیں، اور وہ ہمارے قلب و نگاہ کو کہاں تک ذوق و لذت کی دعوت دے سکتا ہے، لیکن ہم کو فانی سے اس کی شکایت نہیں، عشق کے بارِ غم کا تحمل ہر شخص کا کام نہیں، اس کے لئے جوہر قابل درکار ہے، جو اس کی اندرونی لذت و کشش کا احساس کر سکے، اسی بنا پر سرمد نے کہا ہے،

سرمد غمِ عشق بوالہوس را نہ دہند سوزِ دلِ پروانہ مگس را نہ دہند

فانی کے کلام سے جو اشعار ہم نے اوپر پیش کئے ہیں، ان سے ہمارے اس خیال کی کافی تائید ہوتی ہے کہ انھوں نے عشق کے درد و غم کو ایک صاحبِ ذوق کی نگاہ سے نہیں دیکھا، ورنہ وہ دنیا کے سامنے اپنی زندگی کا یہ منظر پیش نہ کرتے،

دم بخود سکتہ کا عالم، مردنی چھائی ہوئی رنگ میری زندگی کا میری میت پر کھلا

اور نہ اس میں اتنی برودت ہوتی، کہ سوزِ محبت جو تمام خوابیدہ احساسات کو مشتعل اور تند و تیز کر دیتا ہے، ان کے دل پر بجائے آگ کے پانی کا کام کرتا،

جو سوزِ محبت سے ہوا سرد وہ دل ہوں وہ شمع ہوں جس کو پرِ پروانہ بجھا دے

اور نہ وہ اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کا اس طرح ماتم کرتے،

نامرادی حد سے گذری حالِ فانی کچھ نہ پوچھ ہر نفس ہے اک جنازہ آہِ بے تاثیر کا

اور نہ وہ حسرت و بیکسی کے عالم میں عمر بھر اجل کے لئے چشم براہ رہتے،

تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کئے

لیکن اگر وجدانِ سلیم کے انوار سے اس کی چشمِ بصیرت روشن ہوتی، تو یہی غمکدۂ حیات ان کو شبستانِ عیش نظر آتا، اور یہی سوزِ محبت ان کے ہر بُن مو کو برق سرطور کی شرر افشانیوں کا گہوارہ بنا دیتا، اور عشق کی انہی ناکامیوں میں ان کو وہ سرور حاصل ہوتا، کہ ان کی ہر موجِ نفس موجِ صہبا بن جاتی، اور پھر نہ کبھی ان کو چارہ سازوں کا شرمندۂ احسان ہونا پڑتا، نہ کبھی ان کی آنکھوں سے زرد آنسو ٹپکتے، اور نہ کبھی ہجومِ غم سے گھبرا کر موت کے لئے دعائیں مانگتے، بلکہ وہ ایک ایسے عالم میں پہونچ جاتے، جس کا ہر گوشہ زندگی کے سوز و تپش سے آتش بجان اور جس کا ہر منظر ذوقِ نامحدود کی تابانیوں سے مملو نظر آتا، اور بجائے یاس و حسرت کے دلدوز شکن نوحوں کے ہم ان کی زبان سے عشق کا یہ نعرۂ مستانہ سنتے،

چلا جاتا ہوں ہنستا کھیلتا موجِ حوادث سے اگر آسانیاں ہوں زندگی دشوار ہو جائے (اصغر)

اس شعر میں جس لطیف اور بلند حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، اگر فانی کے دل میں اس کا احساس ہوتا، تو ان کا محکمۂ قلب و جگر کا مدفن نہ بنتا، اور نہ وہ اتنے کمزور مضمحل ہوتے، کہ ان کی شمع حیات کو پر پروانہ کی ایک خفیف جنبش گل کر دیتی، لیکن طبیعتوں کی فطری استعداد کے فرق مراتب کو کیا کہا جائے، فانی پر ناکامیوں اور دشواریوں کا یہ اثر ہوتا ہے کہ ان کی رگ رگ فریاد کرنے لگتی ہے، زندگی سے بالکل بیزار ہو جاتے ہیں، اور ان کا پورا نظام حیات بے کیف اور مضمحل ہو جاتا ہے لیکن جب اہلِ ذوق کو ناکامیوں اور دشواریوں کا سامنا ہوتا ہے، تو وہ جوشِ مسرت میں سراپا تبسم نظر آنے لگتے ہیں، کہ اب زندگی کی حقیقی نشو و نما کا وقت آگیا ہے جس طرح سیلاب کے جوش و خروش کا اندازہ اس وقت تک نہیں ہو سکتا، جب تک اس کی راہ میں آلام و مصائب کی چٹانیں حائل نہ ہوں، اقبال سہیل نے کیا خوب کہا ہے،

پھر کوئی سنگ راہ مقابل نہیں رہا　　پھر موجِ زندگی میں نہیں شورشِ عمل

یہی وجہ ہے کہ اسیرانِ محبت کو عشق کے درد و غم سے نجات حاصل کرنے کی کبھی آرزو نہیں رہتی، بلکہ وہ اس جام تلخ کی لذت کے لئے ہر وقت بیتاب رہتے ہیں، اور اُن کی زندگی کا ہر لمحہ بغیر اس روح پرور خلش کے گذر جاتا ہے، اُس پر ان کو ہمیشہ افسوس رہتا ہے،

خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نہ بود　　نالہ از بہر رہائی نہ کند مرغ اسیر

یہ درد و غم کی لذت ہی تھی، جس نے حافظ کو اس دعا پر مجبور کیا تھا،

کہ بستگانِ کمند تو رستگار انند　　خلاص حافظ ازان زلف تابدار مباد

یہ شراب دو آتشہ کا سرور تھا، جس کی کیفیت عارفِ رومی نے ان الفاظ میں بیان کی تھی،

دل من از جنون نمی خسپد

غرض تم نے فانی کے دردِ محبت کا ولولہ سوز عالم دیکھ لیا، کہ وہ حقیقت میں عشق کا درد نہیں، بلکہ ایک مریض جاں بلب کے کرب و تکلیف کی تصویر ہے، جس میں زندگی کی کوئی تابانی نظر نہیں آتی، بلکہ جس پر سراپا عالم نزع کی افسردگی چھائی ہوئی، اب دیکھنا یہ ہے کہ ان کی چشمِ ونگاہ کا جو محبوب ہے، وہ کیا ادائیں رکھتا ہے، اور ان کا دل کس حد تک بارگاہِ حسن کا ادب شناس ہے؟ اس میں شبہ نہیں کہ فانی کی نگاہیں کبھی کبھی جمالِ حقیقی کی رنگینیوں کی طرف بھی اٹھ جاتی ہیں، مثلاً

یہ شان تصور ہے، تصویر کو کیا کہیے　　فردوس بداماں ہے ہر نقشِ خیال ان کا

تجلیات کے دریا بہا دیئے تو نے　　گرا کے قطرۂ شبنم گلوں کے دامن پر

آپ کے خیال سے، آپ کے خیال میں　　ابتداے زندگی ہے انتہاے زندگی

لیکن ان کی طبیعت کا رجحان عام طور پر فتنہ گران سربام کی عشوہ طرازیوں ہی کی طرف معلوم ہوتا ہے، عام غزل گو شعرائے محبوب کو ہمیشہ ایک بے رحم قاتل کی صورت میں پیش کیا ہے، جو نہایت بے دردی کے ساتھ غریب عاشق کی گردن پر چھری چلاتا رہتا ہے، لیکن قتل و خونریزی محبوب کی شان نہیں، وہ قلب و جگر کو ضرور مجروح کرتا ہے لیکن جلاد کی تیغ و سنان سے نہیں، بلکہ اپنی نگاہِ ناز کی لطیف اداؤں سے جن میں زندگی کی روح پنہاں ہوتی ہے، لیکن فانی کا محبوب جس بے دردی کے ساتھ حملہ آور ہوتا ہے، اس کی تصویر یہ ہے،

کئی پہلو مرے قاتل نے قضا کے بدلے　　تیر سے تیغ سے خنجر سے سنان سے مارا

غور کرو یہ کسی محبوب دلنواز کی شانِ کرم ہے، یا صحرائے تاتار کے کسی خوفناک وحشی کی تصویر درندگی ہے جس کو دیکھتے ہی تمام نظام حواس پراگندہ ہو جائے! اتنے خطرناک اسلحہ کی پیہم چوٹیں کھا کر فانی اگر فریاد و فغاں اور گریہ و زاری نہ کرتے، تو پھر کیا کرتے، چنانچہ ان کی تڑپ اور بے چینی کا عالم دیکھ کر ان کا دشمن بھی چیخ اٹھتا ہے،

کچھ اس طرح تڑپ کر میں بے قرار رویا دشمن بھی چیخ اٹھا بے اختیار رو دیا

ایسے ظالم اور سفاک سے دل لگا کر فانی کے خزانۂ محبت کو جو سرمایہ ہاتھ آیا ہے، وہ یہ ہے،

انبار آنسوؤں کے ہیں خونِ جگر کے ڈھیر معمور ہے خزانۂ سرکار آستین،

یہ ظالم صرف سنان بازی ہی کے فن سے واقف نہیں ہے، بلکہ ذبح کرنے میں بھی مشاق ہے، چنانچہ عاشق کی گردن پر اس کے خنجر چلانے کی ادا ملاحظہ ہو،

اُدھر منہ پھیر کر کیا ذبح کرتے ہو ادھر دیکھو مری گردن پہ خنجر کی روانی دیکھتے جاؤ

وہ جس ادا سے مقتل میں آتا ہے، اُسکی تصویر یہ ہے،

کسی کا ہائے وہ مقتل میں اس طرح آنا نظر بچائے ہوئے آستیں چڑھائے ہوئے

وہ اتنا بڑا ماہرِ فن ہے، کہ عاشق قضا کو دولھن بنا کرنے آتا ہے تاکہ اس کو فرار و گریز کا خیال نہ آسکے،

ادھر سے آڑ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے مری قضا کو وہ لائے دولھن بنائے ہوئے

اس کی ستم ظریفی کا یہ حال ہے، کہ زندگی میں تو کبھی غریب عاشق کی خبر نہیں لی، لیکن میت پر آکر پوچھتا ہے کہ تمھارا مدعا کیا ہے؟

مری میت پہ ان کا طرز ماتم کس بلا کا ہے دل بے مدعا سے پوچھتے ہیں مدعا کیا ہے

وہ عاشق کو اتنا سادہ لوح سمجھتا ہے کہ اس کی لاش پر موت کو کوستا ہے، حالانکہ دراصل وہ خود اس کی موت کا سبب ہے، چنانچہ دبی زبان سے یوں عرض کرتے ہیں،

اب مری لاش پر حضور موت کو کوستے تو ہیں آپ کو یہ بھی ہوش ہے کس نے کسے مٹا دیا

اس کی فتنہ پردازی اور شوخی و شرارت کا یہ عالم ہے کہ مرنے کے بعد بھی وہ عاشق کو چین سے سونے نہیں دیتا،

موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم کہ جنازے پہ وہ غارت گر خواب آتا ہے

عاشق کی میت پر وہ اپنا عذرِ تاخیر ان الفاظ میں پیش کرتا ہے،

ہائے ان کا مری میت پہ یہ عذرِ تاخیر سو گئے تم مرے دامن کی ہوا سے پہلے!

ایسے دامن کو کیا کہا جائے جس کی ہوا سے سکونِ مرگ طاری ہو جاتا ہے!

فانی کے مدفن کے لئے وہ روز ایک قیامت برپا کرتا رہتا ہے،

مدفن جو سرِ رہ گذرِ دوست ہے فانی روز ایک قیامت مرے مدفن کے لئے ہے

لیکن اس مصیبت کے ذمہ دار آپ خود ہیں، آپ کو جب یہ معلوم تھا، کہ آپ کا دوست اتنا شریف اور مہربان انسان ہے کہ مرنے کے بعد بھی آپ کو اذیتیں پہونچانے سے باز نہیں آسکتا، تو پھر آپ نے اس کی رہگذر میں اپنا مدفن بننے کیوں دیا؟ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کو گورِ غریباں کی سیر کا اس قدر شوق ہے کہ صبح اٹھتے ہی پہلا کام وہ یہی کرتا ہے،

سحر ہوئی کہ وہ یادش بخیر آتا ہے چراغ ہیں مری تربت کے جھلملائے ہوئے

اس لئے مدفن کہین بھی ہوتا، اس کی زد سے محفوظ نہین رہ سکتا تھا،

اس کا خنجر وہ روح کش آلہ ہے کہ جس کو موت بھی نہین مٹا سکتی، اس کو وہ دم بھر مین فنا کر سکتا ہے، چنانچہ شاعر شب غم مین اسی کی مدد کا طلب گار ہے،

شب غم مین بھی میری سخت جانی کو نہ موت آئی ترا کام اے اجل اب خنجر قاتل سے نکلے گا

اس کی نگاہ اس قدر ہولناک واقع ہوئی ہے، کہ اس کو دیکھتے ہی فانی کو مرگ ناگہان کی بے بہا دولت حاصل ہو جاتی ہے،

آخر نگاہِ دوست مین فانی نے پا لیا یون مرگ ناگہان تجھے ڈھونڈھا کہان کہان

اس کی جان نوازی کا یہ عالم ہے، کہ شاعر اس سے حالتِ نزع مین سازِ مرگ کے چھیڑنے کی فرمایش کرتا ہے،

بالین پہ آکے نزع کے پردے میں چھیڑ دو نغمے جو سازِ مرگ میں سوئے ہوئے سے ہین

لیکن اس کو اس کی خبر کہان تھی، کہ حُسن کے دست ناز مین وہ ربابِ آتشین ہے، جس کے نغمون کی شرر فشانی سے اقلیم جان کا ہر گوشہ دہک اٹھتا ہے،

بیخود و محو جسم و جان مست زمین و آسمان حُسن نے دستِ ناز سے چھیڑ دیا ہے سازِ عشق (اصغر)

امثالِ مذکورۂ بالا سے تم کو فانی کے محبوب نظر کی حقیقت کا کافی اندازہ ہو گیا ہو گا، اب اس کی کچھ اور ادائین دیکھنا چاہو تو اشعارِ ذیل حاضر ہین،

تری ترچھی نظر کا تیر ہے مشکل سے نکلے گا دل اس کے ساتھ نکلے گا، اگر یہ دل سے نکلے گا

وہ میری لاش پہ ہمت سی کچھ اٹھا کے چلے مجھے قرار سے دیکھا تو مسکرا کے چلے

تم جوانی کی کشاکش مین کہان بھول اٹھے وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے

ہر پر توجہ تھا اک خط پیمانہ محفل سے جو وہ اٹھے لیتے ہوئے انگڑائی

اب انہیں اپنی اداؤن سے حجاب آتا ہے چشم بد دور دلھن بن کے شباب آتا ہے

نہ بن پڑا کوئی عذر جفا کسی سے تو ہائے ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

وہ ایک اچٹتی سی قاتل کی نظر تو بہ دم توڑ دیا دل نے گو زخم نہ تھا کاری

جب ذرا پردے سے جھانکا بجلیاں گرنے لگین ہے کوئی یہ دیکھنے مین بندہ پرور دیکھنا

اور ہی بل ہے تری زلفوں میں آج کون گرفتار بلا ہو گیا

ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر کا دل زیادہ تر فتنہ گران لب بام ہی کی تیغ ادا کا زخم خوردہ ہے، ترچھی نظر سے تیر چلانا، عاشق کی لاش پر مسکرانا اس کے مدفن سے اٹھکھیلیاں کرنا، انگڑائیان لیتے ہوئے محفل سے اٹھنا، گھبرا کر روٹھ جانا، پردے کی آڑ سے جھانکنا، دولھن کی طرح اپنی اداؤن سے شرمانا، منہ پھیر کر عاشق کی گردن پر چھری چلانا آستین چڑھا کر مقتل مین آنا، مختلف اسلحہ سے حملہ آور ہونا، خوفناک نگاہون سے پیام اجل سنانا، میت پر ماتم کرنا، موت کو کوسنا، قبرستان کی سیر کرنا، دامن کی ہوا سے بجائے بیدار کرنے کے سکون مرگ طاری کر دینا وغیرہ کیا انہی مبتذل اور عامیانہ اداؤن کی نمایش کا نام حسن ہے؟ کیا ایسے بد مذاق ظالمون کی محبت سے قلب و روح کے اندرونی لطیف احساسات شگفتہ اور مشتعل ہو سکتے ہین؟ کیا انہی فتنہ گرون کی نگاہ سحر طراز کے متعلق خواجہ حافظ نے یہ دعوی کیا تھا،

مشکلِ خویش بر پیرِ مغان بردم دوش کاو بہ تائیدِ نظر حلِ معما می کرد

غرض فانی کے احساسِ محبت مین عام طور پر جو روحانی اضمحلال ضعف، بے حسی اور افسردگی نظر آتی ہے، اس کا اصلی سبب یہی ہے کہ انھون نے حسن کی حقیقی عظمت اور اس کی روحانی پاکیزگی اور لطافت کا اندازہ بہت کم کیا، یعنی ان کے پیشِ نظر یہ حقیقت نہین رہی کہ حسن سراپا حُسن ہے، اس کا قدرعنا جمالِ روحانی کا نظارہ گاہ ہے، اس کا چہرۂ رنگین صبحِ زندگی کا گہوارۂ انوار ہے، اس کی نگاہِ ناز کا ہر اشارہ سازِ لاہوتی کا ایک نغمۂ بے صدا ہے، اس کے دستِ کرم مین جامِ زہر نہین، بلکہ بادۂ حیات کا وہ ساغرِ رنگین ہے، جس کا ایک جرعہ ہر رگ و پے کو نشاطِ ابدی سے سیراب کر دیتا ہے، اس کی تیغِ ادا کسی بے درد ظالم کا آلۂ قتل نہین، بلکہ مہر و محبت کی وہ تلوار ہے، جس کا زخم خوردہ کراہتا اور مرتا نہین، بلکہ زندہ ہو کر جوشِ مسرت مین مسکراتا رہتا ہے، وہ دل مین درد پیدا کرتا ہے، لیکن وہ درد نہین، جو قلب و جگر کو مضمحل اور بے حس بنا دیتا ہے، بلکہ وہ درد جس کی لذت سے زندگی کی روح پرورش پاتی ہے، اس کی بارگاہِ فیض سے آنسوؤن کے انبار اور خون کے ڈھیر نہین، بلکہ جوش و مستی اور سوز و گداز کا وہ کیف و سرور عطا ہوتا ہے، جس کے بل پر ایک گدائے خاک نشین بامِ عرش کے کنگرون کو ہلا کر رکھ دیتا ہے، وہ کوئی پیکرِ جسمانی نہین جو نگاہون کو نظر آسکے، یا جس کی تلاش گلی کوچون مین کیجائے، بلکہ وہ ایک روح ہے، جو عالم کے ریشہ ریشہ مین حرکت کر رہی ہے، وہ ایک نور ہے، جس سے کائنات کا ہر گوشہ روشن ہے، غرض اس کی ہر ادا لطافت اور پاکیزگی کا آئینہ ہے جس مین کسی مادی آلایش کی گنجایش نہین،

یہی وہ محبوبیت کا پیکرِ لطیف ہے، جس کا ذوقِ پرستش چشمِ بصیرت کے سامنے تجلیاتِ روحانی کا ایک نا محدود عالم بے نقاب کر دیتا ہے، یہی وہ حسنِ سحر طراز ہے، جس کی برقِ تبسم کی موجِ شرر فشان سے آبِ حیات کے قطرون کی ریزش ہوتی ہے، یہی وہ قاتل ہے، جس کا ہر وار دردمندانِ محبت کے لئے حیاتِ نو کا پیام ہے، یہی وہ پیمانہ بردار ہے جو صرف اپنی خمار آلود نگاہون کی جنبش سے تشنگانِ ذوق کو اس طرح سیراب کر دیتا ہے، کہ پھر ان کو زمین سے آسمان تک بجز مسرت کے اور کچھ نظر نہین آتا،

ظاہر ہے کہ جو دل ایسے نگارِ جان نواز کا کشتۂ محبت ہوگا، اس کی روحانی استعداد و صلاحیت کی کیا حالت ہوگی، اور اُس کے ترانہ ہائے درد و غم کی رنگینیون اور آتش فشانیون کا کیا عالم ہوگا!

حقیقت یہ ہے کہ عشق کی کشش و حرارت کا اصلی سرچشمہ حُسن ہے، اس لئے حسن جس قدر لطیف اور کامل ہوگا، اسی قدر عشق بھی قوی اور مشتعل ہوگا، لیکن چونکہ حُسن کامل شاہدِ حقیقی کا حصہ ہے، اس لئے جو لوگ اس کے جلوہ شناس ہوتے ہین انہی کا کلام سراپا سوز و اثر سے لبریز ہوتا ہے، اور انہی کی ادائون مین عشق و محبت کی حقیقی حرارت اور جوش و مستی کی تصویر نظر آسکتی ہے، عرفی نظیری وغیرہ کی جدت طرازیون سے کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ لیکن کیا ان کے دفترِ تغزل مین مولانا روم کے جذبۂ عشق کی اس شانِ جلال و عظمت کی کوئی مثال مل سکتی ہے:

بزیر کنگرۂ کبریاش مردانند فرشتہ صید و پیمبر شکار و یزدان گیر

یہ وہ شعر ہے جس پر مرزا غالب سر دھنا کرتے تھے، آج خواجہ حافظ کے آئینۂ محبت مین اہلِ ذوق کو وادیِ ایمن کی جو شمع باریان نظر آتی ہین وہ اسی جمالِ حقیقی کی آستان بوسی اور عظمت شناسی کا فیض ہے، جس کی بدولت ان کی زبان سے یہ نعرۂ مستانہ بلند ہوتا تھا،

گدائے میکدہ ام لیک وقتِ مستی بین کہ ناز بر فلک و حکم بر ستارہ کنم

غرض ہمارے نزدیک تغزل کے لئے فلسفیانہ دماغ نہیں، بلکہ ایک مضطرب روح، ایک تاب اور درد آشنا دل کی ضرورت ہے، جس کو ایک طرف حریم حُسن کے آداب کا یہ پاس ہو کہ

نیاز رکھ کے بھی عرض نیاز رہنے دے (اصغر)

اور دوسری طرف اس کا بھی احساس ہو تاکہ باوجود عجز و درماندگی کے عشق مین وہ قوت ہے جو کائناتِ عالم کو ہلا سکتی ہے، اور جس کے جنونِ آرزو کے جوشِ بے پایان کو فضائے آسمانی کی وسعت بھی تنگ نظر آتی ہے،

یہ جہانِ مہ و انجم ہے تماشا مجھ کو دشت دنیا تھا باندازۂ سودا مجھکو (اصغر)

مین نے اس تنقید کے دوران مین اکثر اصغر مرحوم کے اشعار نقل کئے ہین جس سے شاید ناظرین کو یہ گمان ہو کہ مین فانی کا ان سے مقابلہ کر رہا ہون، حالانکہ یہ میری ہرگز نیت نہین ہے، ان مثالون سے صرف یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ فانی نے تغزل کا جو نمونہ پیش کیا ہے، اس مین قلب و روح کے لئے ذوق و لذت کا سامان بہت کم ہے اور اس مین بیشتر صرف قدیم رنگِ سخن کی تقلید ہے جس مین حسن و عشق کی بلند اور لطیف اداؤن کی جھلک بہت کم نظر آتی ہے اور اس لئے ہمارے نزدیک تغزل کی معنوی حیثیت مین کوئی قابلِ قدر اضافہ نہین ہوتا اور فانی کی چشم پاس کی اشک افشانی اور حسرت زدہ دل کی افسردگی سے عشق کی حرارت و گرمیِ جذبات محبت کی بلندی و پاکیزگی اور اس کی ساری لطیف و معانی کیفیتین جو تغزل کا اصل سرمایہ ہین بجھ کر رہ گئی ہین ممکن ہے فانی کی یہ ادائے غم گساری سوگوار طبقون کو کسی قدر خوشنما معلوم ہوتی ہو لیکن افسوس ہے کہ غزل کی بزم کیف مین اس کی گنجائش نہین وہ ایک شرارِ معنوی ہے جس کے رقص نورانی سے قلب و روح کی تمام گہرائیان دفعۃً جگمگا اٹھتی ہین، اور زندگی کا حقیقی جلوہ ہماری چشم بصیرت کے سامنے بے نقاب ہو جاتا ہے،

فانی نے ایک شعر مین اپنے سوزِ دل پر اس طرح فخر کیا ہے،

کیون اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل لایا ہون دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

لیکن افسوس ہے کہ ان کے کلام سے ہم کو اس کا کوئی ثبوت نہین ملتا بلکہ غور سے دیکھا جائے تو ان کے داغ دل مین بجائے برق سر طور کے جلوؤن کے صرف چراغ سر مزار کی ٹمٹماتی ہوئی روشنی نظر آتی ہے،

بہرحال مصورِ "یاسیات" کی زبان سے عشق و محبت کے سوز و تپش کا دعوا کسی طرح مناسب نہین معلوم ہوتا، فانی زندہ ہوتے تو ان کی خدمت مین دبی زبان سے یہ عرض کرنے کی جرأت ضرور کرتے

تو در ہوائے آنکہ نگہ آشنائے اوست من در تلاش آنکہ نتابد نگاہ را

یہ شکایت ہم کو عام طور پر تمام غزل گو شعرا سے ہے جن کی نگاہ مین حسن و عشق کی حقیقی خصوصیات تک پہونچنے سے اکثر قاصر رہتی ہین، یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام سوز و اثر سے خالی ہوتا ہے اور ان کی شاعرانہ صناعیون مین دل کو کوئی لذت محسوس نہین ہوتی،

کہا جاتا ہے کہ فانی فلسفہ لکھتے ہین، ممکن ہے، یہ ایک حد تک صحیح ہو، لیکن ہمارے نزدیک غزل کے لئے فلسفہ ضروری نہین کیونکہ غزل کا تعلق دماغ سے نہین بلکہ دل سے ہے اس لئے اس کی اصلی روح جذبات ہین، جن کے بغیر غزل ایک پھول ہے جس مین نشہ نہیں نغمہ ہے جس مین سرور نہیں راکھ کا ایک ڈھیر ہے جس مین کوئی تپش نہین، فانی کی غزلون کا بعینہٖ یہی عالم ہے جن کو پڑھکر بجائے مستی و بیداری کے قلب و روح پر سکون مرگ طاری ہونے لگتا ہے،

(باقی)

کیا مدینۃ العلوم طاشکبری زادہ کی تصنیف ہے؟

از
جناب قاضی احمد میان صاحب اختر جوناگڑھی

علماے اسلام نے موضوعاتِ علوم پر متعدد کتابین لکھی ہین، یہان تک کہ انسائیکلوپیڈیا کی طرز کی کتابین لکھنا ایک باقاعدہ فن ہوگیا، اور ہر علم و فن پر خاص کتابین بھی لکھی گئین، انہی کتابون مین سے ایک کتاب مدینۃ العلوم بھی ہے، آج تک ہم یہی پڑھتے اور سنتے چلے آرہے ہین کہ اس کتاب کا مصنف ازنیقی ہے، اس کتاب کے قلمی نسخے کتبخانہ خدیویہ مصر اور ندوۃ العلما لکھنؤ کے کتب خانہ مین موجود ہین، اب تک جتنے اقتباسات اس کتاب کے نظر سے گذرے وہ سب کے سب ازنیقی کی طرف منسوب دیکھے گئے، لیکن جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ کتاب مذکور جو ازنیقی سے منسوب ہے، امیر احمد بک تیمور کی تحقیق کے مطابق دراصل طاشکبری زادہ کی تصنیف ہے[1] ایک اور مقام پر زیدان نے اس کا ذکر اس طرح کیا ہے:-

"مدینۃ العلوم: تعریفات علوم اور مصنفین کے حالات مین از مصطفےٰ بن خلیل (دسوین صدی) اس کا ایک مخطوطہ کتب خانہ خدیویہ مین ہے، جو ۲۴۴ صفحات پر مشتمل ہے، مؤلف سے اس کتاب کی نسبت کے متعلق اختلاف ہے کیونکہ کتب خانہ خدیویہ کے نسخہ مین کتاب کے نام (سرورق پر) کے ساتھ مصنفہ شیخ الاجل امام مولانا وسیدنا مفتی المسلمین لکھا ہوا ہے، اور مقدمہ کے دوران مین لکھا ہے کہ اس کے مولف شمس الدین بن قاضی برہان الدین ابراہیم بن ساعد انصاری ہین، جو ۸۳۰ھ مین قاہرہ مین موجود تھے، اور ابجد العلوم مین لکھا ہے کہ مدینۃ العلوم کا مؤلف الزنقی (ازنیقی) ہے، حالانکہ کتاب مین ایسے لوگون کا ذکر پایا جاتا ہے، جو نوین صدی کے بعد گذرے ہین کیونکہ اس مین سیوطی متوفی ۹۱۱ھ سے استشہاد کیا گیا ہے، پس اس کا مولف دسوین یا گیارھوین صدی کا ہے، اور کتاب کا موضوع مفتاح السعادہ از طاش کبری زادہ یا کشف الظنون کے قبیل سے ہے[2]"

قبل اس کے کہ اس اختلاف نسبت پر بحث کی جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے زیدان کے بیان مین جو غلطیان ہین ان کی تصحیح کر لی جائے،

(۱) مدینۃ العلوم کا مصنف مصطفےٰ ابن خلیل کو بتایا ہے، اس کی جگہ اس کے بیٹے احمد بن مصطفےٰ بن خلیل طاشکبری زادہ المتوفی ۹۶۸ھ[3] کا نام ہونا چاہیے[4]،

[1] تاریخ اداب اللغۃ العربیہ جلد ۴ ص ۲۷۵ [2] ایضاً جلد ۳ ص ۲۳۹، [3] العقد المنظوم مین بھی یہی سنہ وفات ہے، جو بالکل صحیح ہے تعجب ہے مفتاح السعادۃ مطبوعہ دائرۃ المعارف کے سرورق پر طاشکبری زادہ کا سنہ وفات ۹۶۲ چھپا ہے، جو صریحاً غلط ہے اس لئے کہ انھون نے ۹۶۵ھ مین تو اپنی آخری کتاب الشقائق النعمانیہ لکھی ہے، جیسا کہ خود انھون نے آخر کتاب مین اپنے حالات مین تحریر کیا ہے، [4] دیکھو مصطفےٰ کا تذکرہ جو ان کے بیٹے احمد نے اپنی کتاب الشقائق النعمانیہ (بہامش ابن خلکان ج ا ص ۴۳۱-۴۳۲) مین کیا ہے، اس مین اس نام کی کتاب کا ان کی تصنیف سے ہونا نہین بتایا گیا،

(۲) ازنیقی کو "ارتقی" لکھا ہے، جو صریحاً غلط ہے، ابجد العلوم میں بھی اس کو ازنیقی لکھا ہے،

اس تمام لمبی چوڑی تحریر کے بعد بھی یہ نہیں بتایا گیا، کہ آخر اس کتاب کا مؤلف کون ہے، پھر مکتبۂ خدیویہ کے نسخے سے ایک اسم مجہول کو بطور مؤلف پھر صدر مقدمہ میں شمس الدین بن قاضی برہان الدین کو اس کا مؤلف بتا کر آخر میں لکھا ہے کہ اس کا مؤلف کوئی دسویں صدی کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔

الغرض جرجی زیدان نے کوئی فیصلہ کن بات نہیں بتائی کہ آخر مدینۃ العلوم کا مؤلف کون تھا؟ اس کی عبارت سے صرف دو باتیں معلوم ہوتی ہیں:

(۱) مدینۃ العلوم طاشکبری زادہ کی تالیف ہے، جو دسویں صدی ہجری میں گذرے ہیں،

(۲) اصل کتاب کے مقدمہ میں شمس الدین بن ابراہیم کا نام بطور مؤلف لکھا گیا ہے جو صحیح نہیں معلوم ہوتا،

مدینۃ العلوم کو اور مصنفین نے بھی طاشکبری زادہ کی تالیف بتایا ہے، چنانچہ صاحب عقد المنظوم نے ان کے تذکرہ میں لکھا ہے:-

"اور ایک کتاب لکھی ہے جس میں علوم کی قسمیں اور ان کے موضوعات ہر فن کی مشہور تصنیفات مع مختصر حالات بیان کئے ہیں[۱]"

اس میں صرف کتاب کا موضوع بتایا گیا ہے، کتاب کے نام کی تصریح عقد المنظوم ہی کے حوالہ سے مولانا عبد الحی لکھنوی مرحوم نے اس طرح کی ہے:-

"اور ایک کتاب میں علوم کی قسمیں اور ان کے موضوعات بیان کئے ہیں اور اس کتاب کا نام مدینۃ العلوم ہے[۲]"

رہا اس کا شمس[۳] الدین کی تصنیف ہونا، تو حاجی خلیفہ نے ان کی کتاب ارشاد القاصد فی اسنی المقاصد[۴] کے متعلق جو موضوعات علوم پر بہترین کتاب ہے، لکھا ہے کہ یہ کتاب طاشکبری زادہ کی مفتاح السعادۃ کا ماخذ ہے[۵] اس لئے بہت ممکن ہے کہ مفتاح السعادۃ اور مدینۃ العلوم دونوں طاشکبری زادہ کی تصنیف سے ہوں، یا پھر دونوں کتابیں ایک ہی ہوں نواب صدیق حسن خان مرحوم اپنی کتاب ابجد العلوم کا ماخذ تمامتر ازنیقی کی مدینۃ العلوم کو بتاتے ہیں، جو ان کی معتمد علیہ کتاب ہے ساتھ ہی وہ اس بات کے بھی قائل ہیں کہ مفتاح السعادۃ اور مدینۃ العلوم کی عبارت میں کوئی فرق نہیں ہے، مفتاح السعادۃ سے وہ واقف نہ تھے، بلکہ صرف کشف الظنون میں اس کے منقولات انھوں نے دیکھے تھے،

چنانچہ فرماتے ہیں:

"اور ہم کتاب مفتاح السعادۃ سے واقف نہ تھے، بجز اس کے جو اس کتاب سے کاتب چلپی نے کشف الظنون میں نقل کیا ہے، جب مدینۃ العلوم کو ہم نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ گویا وہ مفتاح السعادۃ ہی ہے، ان دونوں کی عبارتیں اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ ان میں ذرہ بھر فرق نہیں پایا جاتا، لیکن صاحب کشف الظنون نے مدینۃ العلوم کا ذکر ہی نہیں کیا، جیسا کہ اوس نے مفتاح السعادۃ کا تذکرہ کیا ہے، حالانکہ مدینۃ العلوم اس سے پہلے

---

[۱] العقد المنظوم فی ذکر افاضل الروم بہامش ابن خلکان ج ۲ ص ۱۰۱ [۲] طرب الاماثل بتراجم الافاضل ص ۵۰، طبع لکھنؤ، [۳] شمس الدین محمد بن ابراہیم بن ساعد الانصاری المتوفی ۷۴۹ھ کا تذکرہ ابن حجر عسقلانی نے الدرر الکامنہ جلد ۳ ص ۲۷۹ میں لکھا ہے، حاجی خلیفہ نے ان کی تاریخ وفات ۷۹۴ھ غلط لکھی ہے [۴] ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال نے اس کو حدود النحو کے ساتھ شائع کیا ہے، مختصر رسالہ ہے، موضوعات علوم میں کہیں کہیں اس کی عبارتیں مفتاح السعادہ سے ملتی جلتی ہیں، حالانکہ مفتاح السعادۃ میں مصنف یا ان کی اس کتاب کا ذکر کہیں نہیں پایا جاتا [۵] کشف الظنون ج ۱ ص ۴۸،

کی تصنیف ہے تو ہمیں ان دونوں کتابوں میں مبنی اور معنی کی حیثیت سے کوئی فرق نہیں معلوم ہوا بجز اس کے کہ ان کے نام جدا ہیں، مگر موضوع کے لحاظ سے دونوں ایک ہی ہیں[۱]۔

لیکن خود ابجد العلوم مدینۃ العلوم کی نقل ہے، مصر کے مشہور محقق احمد زکی پاشا جنھوں نے اسلامی موسوعات (موضوعات) پر ایک محققانہ رسالہ لکھا ہے، ابجد العلوم کو مدینۃ العلوم یا مفتاح کی نقل بتاتے ہیں، چنانچہ ازنیقی کی مدینۃ العلوم کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:-

"ازنیقی کی کتاب مدینۃ العلوم ہے، اس پر صاحب ابجد العلوم نے اپنی کتاب کے اکثر مقامات اور ابواب میں اعتماد کیا ہے، اور اس کے مقدمہ سے بعض نئی معلومات نقل کی ہیں، اس سے مجھے خیال پیدا ہوا کہ مدینۃ العلوم اور مفتاح السعادۃ دونوں ایک ہی کتابیں ہیں، یا ایک نے دوسرے سے نقل کر لی ہے مصنف کے نام کی ذکر کئے بغیر اس سے میرا تعجب بڑھ گیا جس نے میری طبیعت میں کاوش پیدا کر دی خصوصاً جب کہ میں نے یہ دیکھا کہ صاحب ابجد نے مدینۃ العلوم کی فہرست اور بعض علوم کے ساتھ بعض کے ربط کی کیفیت کو نقل کیا ہے مجھے فہرست مفتاح السعادۃ کے ساتھ اس کی پوری مشابہت معلوم ہوئی جب کہ میں کتب خانۂ خدیویہ میں یہ رسالہ لکھنے میں مشغول تھا، اور ابجد سے واقف ہونے سے پہلے میں مدینۃ العلوم سے آگاہ ہو چکا تھا"[۲]

اس کے بعد ابجد کی محولۂ بالا عبارت کو نقل کرتے ہوئے احمد زکی لکھتے ہیں:-

"جب میں نے یہ دیکھا تو میں کتب خانۂ خدیویہ میں دوبارہ جانے سے اپنے آپ کو نہ روک سکا، اور میں نے مدینۃ العلوم کے مقدمہ اور اس کی فہرست سے (جیسی کہ وہ ابجد العلوم میں منقول ہے) مفتاح السعادۃ کے مقدمہ اور فہرست کا مقابلہ کیا، تو معلوم ہوا کہ دونوں کتابیں بعض الفاظ کی کمی بیشی اور تقدیم و تاخیر کے سوا جس کو کوئی محسوس نہیں کر سکتا، ایک ہی ہیں"[۳]

امور متذکرۂ بالا سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مدینۃ العلوم نام کی جو کتاب ہے وہ مفتاح السعادہ کی نقل ہے، اور دونوں کتابوں کا مصنف طاشکبری زادہ ہے نیز یہ کہ مفتاح السعادہ کا اصلی ماخذ ارشاد القاصد ہے لیکن احمد زکی کا یہ لکھنا کہ مدینۃ العلوم نام کی ایک مجہول المصنف کتاب کو طاشکبری زادہ نے اڑا لیا، اور اپنے نام سے شائع کر دیا صریحاً زیادتی ہے، اور یقیناً غلط ہے، خود ان کو بھی اس کا یقین نہیں تھا، چنانچہ فرماتے ہیں:-

مگر طاشکبری زادہ کی علمیت اور شہرت نیز ان کی کئی مفید کتابوں کا متداول ہونا ان کے متعلق دو رایئں نہیں ہو سکتیں، کاش میں جان سکتا، کہ اس اشکال عظیم کی اصل حقیقت کیا ہے آیا انھوں نے اس ضخیم کتاب (مدینۃ العلوم) کو چرا لیا، اور علماء کو دھوکا دینے کے لئے اس کا نام بدل ڈالا، میں اس معاملہ میں کچھ نہیں کہہ سکتا، اس بحث کو میں آئندہ زمانہ کے لئے چھوڑتا ہوں کہ وہی اس امر عجیب پر سے پردہ اٹھائے گا، اور اصل حقیقت کو بیان کرنے کا کفیل ہوگا[۴]۔

---

[۱] ابجد العلوم ص ۲۰۹ طبع بھوپال ۱۲۹۵ھ [۲] موسوعات العلوم العربیہ ص ۳۰ مطبوعہ ۱۳۲۶ھ [۳] ایضاً ص ۳۱۔

مطبوعاتِ جدیدہ

شاہ اسمٰعیل شہید مرتبہ جناب عطاء اللہ صاحب بٹ تقطیع بڑی ضخامت ۲۱۶ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عہ، پتہ قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور،

ہماری جدید تعلیم یافتہ نسل خصوصاً نوجوانوں کا طبقہ ہندوستان میں اپنے اسلاف کے مجاہدانہ کارناموں سے عموماً ناواقف ہے مسلمان سلاطین کے حالات سے تو اسکول کا بچہ بچہ واقف ہے لیکن حضرت مجدد الف ثانی شاہ ولی اللہ دہلوی حضرت سید احمد بریلوی اور مولانا اسمٰعیل شہید رحمۃ اللہ علیہم کے کارناموں سے بہت سے اچھے خاصے تعلیم یافتہ اشخاص تک ناواقف نکلیں گے، خوشی کا مقام ہے کہ پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس کانفرنس نے ان بزرگوں کی یاد کو تازہ رکھنے اور نوجوانوں کو ان کے کارناموں سے روشناس کرنے کے لئے ان کی یادگار منانے کا سلسلہ شروع کیا ہے جس میں ان کے حالات اور کارناموں پر مضامین پڑھے جاتے ہیں، زیر نظر مجموعہ حضرت مولانا اسمٰعیل شہید کے متعلق اردو اور انگریزی کے مضامین پر مشتمل ہے، لکھنے والوں میں مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی، مولانا محمد میاں مرادابادی، ڈاکٹر محمد باقر، ڈاکٹر تصدق حسین خان، غلام رسول صاحب مہر، نصر اللہ خان صاحب عزیز پروفیسر عبد القیوم صاحب خواجہ عبد الوحید صاحب پروفیسر سلیم چشتی اور لاہور کے متعدد اصحاب قلم ہیں، پنجاب مسلم اسٹوڈنٹس کانفرنس کا یہ ملی احساس قابلِ ستایش ہے، ہمارے موجودہ مسلمان نوجوانوں کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہئے جن کی قومیت پرستی کی معراج ملحدانہ اشتراکیت اور جن کی قلمی و ادبی کائنات نئے ادب سے آگے نہیں بڑھتی،

فیصلہ کن جنگیں مؤلفہ جناب محمود خان صاحب مورخ تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۹۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عا، پتہ ملک بک ڈپو لکشمی مینشن (؟) اسٹریٹ لاہور،

ہندوستان کی سرزمین پر محمود غزنوی بلکہ اس سے بھی پہلے محمد بن قاسم کے حملہ سے لیکر سلطان ٹیپو اور انگریزوں کی جنگ تک بہت سی اہم لڑائیاں ہوئیں جن کا اثر کسی نہ کسی حیثیت سے سارے ہندوستان پر پڑا، مولف نے اس کتاب میں ان میں سے آٹھ لڑائیوں پرتھوی راج اور محمد غوری کی جنگ تھانیسر ۱۱۹۲ء بابر اور ابراہیم لودی کی جنگ پانی پت ۱۵۲۶ء ہمایوں اور فرید خان کی جنگ قنوج ۱۵۴۰ء اکبر اور ہیمو کی جنگ پانی پت ۱۵۵۶ء دکن کی ہندو اور مسلمان حکومتوں کی متحدہ جنگ تالی کوٹہ ۱۵۶۴ء، سراج الدولہ اور انگریزوں کی جنگ پلاسی ۱۷۵۷ء احمد شاہ ابدالی اور مرہٹوں کی جنگ پانی پت ۱۷۶۱ء ٹیپو اور انگریزوں کی جنگ سرنگا پٹم ۱۷۹۹ء کے حالات لکھے ہیں جو ان کے نزدیک اپنے نتائج کے اعتبار سے زیادہ اہم اور فیصلہ کن تھیں اور جن کا اثر سارے ہندوستان پر پڑا، ان لڑائیوں کے درمیانی زمانوں کے مختصر حالات بھی لکھدیئے ہیں جن سے تاریخی خلا محسوس نہیں ہوتا، ہر جنگ کے حالات کے آخر میں اس کے ماخذ بھی دیدیئے ہیں، اور جا بجا حالات کے ضمن میں بھی حوالے ہیں، کتاب مفید ہے،

ذکرِ جمیل، از جناب ماہر القادری تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۲۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد ۸؍ پتہ نفیس اکیڈمی حیدرآباد دکن،

ذکرِ جمیل مصنف کی نعتیہ نظموں کا مجموعہ ہے، ان کا کلام اور ادبی ذوق تعارف سے مستغنی ہے، زیرِ نظر مجموعہ میں بھی ان کا حسنِ مذاق نمایاں ہے، خیالات بڑی حد تک نعت کی عام افراط و تفریط اور بے اعتدالی سے پاک ہیں، کہیں کہیں پر خفیف لغزش چنداں قابلِ توجہ نہیں، اندازِ بیان دلکش اور موثر ہے، یہ نظمیں میلاد کی مجلسوں میں پڑھنے کے لائق ہیں،

"م"

جلد ۵۶ ماہ جمادی الاول مطابق ماہ مئی ۱۹۴۵ء عدد ۵

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۹۷-۹۸
خطبۂ صدارت	"	۹۹-۱۰۶
غیر اسلامی ممالک مین سود و قمار کا حکم	جناب مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی استاذ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی،	۱۰۷-۱۱۳
"عرفانیاتِ فانی"	جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ایل ایل بی	۱۱۴-۱۱۹
روم کا ایک خط	جناب ریاض الحسن صاحب	۱۲۰-۱۲۳
"ادب اور زندگی"	" "	۱۲۴-۱۲۶
مطبوعات جدیدہ	"	۱۲۷-۱۲۸

شذرات

دار المصنفین صرف دار الاشاعۃ نہیں ہو بلکہ یہ ایک دار التکمیل اور دار التربیۃ ہے جہان عربی و انگریزی کے فارغ التحصیل سلیم الذوق اصحاب پانچ برس رہکر مزید تحقیق و تدقیق تلاش و جستجو اور توسیع علم و مطالعہ مین مصروف رہتے ہین اور ان کی تلاش اور محنت کے نتیجے وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہتے ہین، اس کی گذشتہ تیس سال کی زندگی مین متعدد فضلا یہان سے فارغ ہوکر باہر گئے، اور ملک و ملت ان کی تصنیفات و تحقیقات سے مستفید ہوا اور ہورہا ہے ۔

اس سلسلہ مین مولوی حاجی معین الدین صاحب ندوی مرحوم کا پہلا نام ہو جو یہان سے پہلے کلکتہ لائبریری مین پھر اورینٹل لائبریری پٹنہ مین اور پھر مدرسہ شمس الہدی پٹنہ مین صدر مدرس ہوئے، دوسرا نام پروفیسر نجیب اشرف صاحب ندوی کا ہو، جو اس وقت اسماعیل کالج بمبئی مین السنۂ مشرقیہ کے معلم ہین تیسرا نام مولوی سعید صاحب انصاری کا ہو جو ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کے رسالہ مین اڈیٹر ہوئے، چوتھا نام مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے کا ہو جو اب مسلم یونیورسٹی مین اردو کے لکچرر ہین، پانچوین صاحب مولوی ابو الجلال صاحب ندوی ہین، جو اس وقت جامعۂ دار السلام عمرآباد کے سلسلۂ تالیف و تصنیف مین منسلک ہین، چھٹے صاحب مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ہین، جو پہلے یہان سے شانتی نکیتن بنگال مین عربی کے پروفیسر ہوکر گئے، اور اب گجرات ورنیکلر سوسائٹی مین ریسرچ اسکالر ہین ۔

اس سلسلہ کا اخیر نام مولوی محمد اویس صاحب نگرامی ندوی کا ہو، جو ابھی پانچ برس کی مدت ختم کرکے دار العلوم ندوۃ العلماء مین درس قرآنیہ اور علوم قرآنیہ اور فقہ و کلام کے مدرس ہوکر گئے ہین، دلی دعا ہو کہ اللہ تعالیٰ اُن سے مدرسہ مذکور کے طلبہ کو مستفید فرمائے،

انگریزی یونیورسٹیوں کے ریسرچ اسکالر اور ڈاکٹریٹ کے طالب علم بھی وقتاً فوقتاً یہان سے مستفید ہوتے رہتے ہین خطوط سے

مشغول رہیں اور کبھی کبھی یہاں قیام کر کے اپنے مقالوں کو تیار کرتے ہیں، اس سلسلہ میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے ایک طالب العلم مہینوں یہاں مقیم رہے اور اپنے کام کو تکمیل کو پہنچایا، اور ابھی بمبئی یونیورسٹی کے ایک طالب علم نے کراچی سے آکر اور ایک ہفتہ رہکر اپنی ضرورت کے معلومات فراہم کئے، ایسے شائقین کے لئے دار المصنفین کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں،

دار المصنفین کا اس سے بھی ایک وسیع کام تلاش و تحقیق کے جویا کے لئے معلومات کی فراہمی اور ان کے علمی اشکالات کے حل کی تلاش ہے، چنانچہ اس قسم کے خطوط کے جوابات روزانہ ہمارے رفقا اور مصنفین لکھ کر بھیجا کرتے ہیں،

دار المصنفین کی طرف سے تاریخ ہند اور تاریخ اسلام کے دو سلسلوں کے شروع ہونے کا اعلان کیا گیا تھا، خدا کا شکر ہو کہ یہ دونوں سلسلے اتمام کو پہنچ رہے ہیں، اگو ابھی تک کاغذ اور چھپائی کے سامان کی کمیابی سے وہ چھپ نہیں سکے، تاریخ اسلام کے دو سلسلے ہیں ایک مشرقی سلطنتوں کا اور دوسری مغربی، مشرقی سلطنتوں کی تاریخ کی ترتیب مولوی شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی کر رہے ہیں، اس سلسلہ کی تین جلدیں چھپ چکی ہیں، اور چوتھی زیر طبع ہے، اس پر بنی عباس کی سیاسی تاریخ ختم ہو جائیگی، اور پانچویں جو ان کے علمی و تمدنی کارناموں پر مشتمل ہوگی، زیر ترتیب ہے، اس کے بعد سامانیوں، دیلمیوں، سلجوقیوں، غزنویوں اور خوارزم شاہیوں کی جلدیں ہوں گی انشاء اللہ تعالیٰ

مغربی سلطنتوں کا کام مولوی سید ریاست علی صاحب ندوی نے اپنے ذمہ لیا، اور سات آٹھ سال سے وہ اس میں لگے ہوئے ہیں، اس سلسلہ میں صقلیہ (سسلی) کی محققانہ تاریخ دو جلدوں میں لکھ کر وہ پیش کر چکے ہیں، اور وہ کتابیں اہل شوق کے ہاتھوں میں پہنچ چکی ہیں، اب وہ اندلس اور افریقیہ کی تاریخوں کی ترتیب دے رہے ہیں، اور ان کا بہت سا کام وہ ختم کر چکے ہیں، اور اب عنقریب ان کی اندلس کی جلد مطبع میں جانے والی ہے،

سب سے لمبی اور طویل اسلامی سلطنت دولتِ عثمانیہ (ٹرکی) ہے، اس کی تاریخ کی ترتیب کا کام مولوی محمد عزیر صاحب ایم اے نے انجام دیا ہے جس کی دو جلدیں چھپ چکی ہیں، اور تیسری زیر قلم ہے، اور اس پر اس سلسلہ کا خاتمہ ہوگا،

تاریخ ہند کی دو ابتدائی جلدیں جن میں سے پہلی سندھ کی عربی ریاستوں کی تاریخ اور دوسری غزنویوں سے متعلق ہے مولوی سید ابو ظفر صاحب ندوی نے لکھی ہیں اور بالکل تیار ہیں، اس سلسلہ کا ایک حصہ جو ہندوستان کی اسلامی سلطنتوں کے علمی و تمدنی کارناموں پر مشتمل ہے مولانا عبد السلام صاحب ندوی، مولانا ابو ظفر صاحب ندوی اور سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ایم اے کی محنتوں کا ثمرہ ہے، اور مکمل ہے، تاریخ ہند کی بقیہ جلدوں کی تکمیل سید صباح الدین صاحب سے متعلق ہے جس میں وہ برابر مصروف ہیں،

اردو اور ہندی کے قصہ کو کانگریس کے پلیٹ فارم پر لانے والے ٹنڈن جی ہیں، انہی نے پہلے یوپی کانگریس کمیٹی میں اس کو پھیلایا، اور بڑھایا، اور اب اس کو وہ سارے ہندوستان کا مسئلہ بنا رہے ہیں پچھلی کانگریس منسٹری میں یہی خیال تھا جس نے پیارے لال شرما جیسے شریف اور ملنسار آدمی کی جگہ سمپورنانند کو اسکول کی ماسٹری سے وزارت کی کرسی پر لا بٹھایا، اور سنسکرتی ہندی کے رواج کو اس تھوڑے اختیار کے برتے پر تعلیمات میں بزور پھیلانے کی اسکیم پر علانیہ عمل شروع کرایا گیا، فیض آباد کی تقریروں میں دونوں نے مل کر اس کا اعلان کیا، اور یہ کتنا حقیقت سے دور نہ ہوگا، کہ کانگریس منسٹری سے مسلمانوں کو نفرت دلانے میں ان سورماؤں کا بڑا حصہ ہے ٹنڈن جی کی ابھی حال کی پونہ کی تقریر سے پتہ چلتا ہے، کہ وہ اپنی رائے پر مضبوطی سے اڑے ہیں

مقالات

خطبۂ صدارت اجلاس جمعیۃ العلماء صوبہ بمبئی منعقدہ ۷ صفر ۱۳۶۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ نحمدہ و نستعینہ من یھدہ اللہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ و

اشھد ان لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ

الحمد للہ رب العلمین الرحمن الرحیم مالک یوم الدین ایاک نعبد وایاک نستعین اھدنا

الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین آمین

حضرات! آج بحمد اللہ ہم ایک ایسے مقام پر جمع ہیں جس کو ایک شہر کے بجائے ملک ہندوستان کا خلاصہ کہنا چاہئے، ہر صوبہ کے مسلمان اور ہر خیال کے ارکان یہاں آباد ہیں، اس لئے یہاں مسلمانوں کے سارے محاسن اور معائب جو کچھ ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں، اسی لئے ایک بزرگ کا یہ قول مجھے یاد آیا کہ "بمبئی کی اصلاح سارے ہندوستان کی اصلاح ہے"، اگر بمبئی کے مسلمان مسلمان بن جائیں تو پھر سارے ملک کو مسلمان سمجھئے، یہاں کے مسلمانوں کی کاروباری زندگی، تجارتی مشاغل اور حصول رزق اور کسب مال کے غیر محدود ذرائع نے ان کو معطل و بیکار بیٹھنے کے بجائے ان کو متحرک اور رواں دواں اور چلتا پھرتا بنا دیا ہے، یہاں کوئی ہاتھ پیر توڑ کر بیکار نہیں بیٹھ سکتا، ورنہ زندگی کے دن گذارنے مشکل ہو جائیں، یہاں جو ہے وہ اپنے کاموں میں مصروف اور اپنی کوششوں میں مشغول ہے، اس لئے یہاں کے مسلمانوں کی بیماری بیکاری اور تعطل اور جمود نہیں بلکہ غیر معتدل حرکت، نامناسب رفتار عمل اور غیر متوازن سمت سفر ہے،

حضرات! یہ شہر جس طرح باب مکہ ہے، اسی طرح گیٹ آف انڈیا بھی ہے، دنیا کے کسی حصہ میں بھی جو اچھے یا برے خیالات پیدا ہوتے ہیں، ہندوستان میں اس کے داخلہ کا راستہ یہی شہر ہے، یہاں کی گودیوں میں نہ صرف یورپ اور امریکہ کے نئے نئے سامان تجارت اترتے رہتے ہیں، بلکہ یورپ سے لدے لدے کرنئے نئے اسباب جہالت بھی آتے رہتے ہیں، اور یہیں سے وہ ملک کے گوشہ گوشہ میں پھیلتے ہیں، اس لئے مجاہدین امت کے لئے بڑی ضرورت تھی کہ اس بندرگاہ کی حفاظت کے لئے ایک مضبوط اور محفوظ چھاونی قائم کریں جو دشمنوں کا مقابلہ کرے، اور باطل خیالات کی فوج کو شکست دے سکے،

حضرات! میں نے ابھی جو سورۂ فاتحہ تلاوت کی یہ حقیقت میں مجموعۂ قرآن پاک کا خطبۂ افتتاحیہ ہے اکابر مفسرین کی تحقیق و تشریح کے مطابق اس سورہ میں قرآن پاک کے سارے مضامین کا خلاصہ مذکور ہے، توحید فی الذات، توحید فی الصفات، توحید فی العبادات، اتباع آثار انبیاء علیہم السلام، جزا، و سزا سب ہی مضامین اس میں موجود ہیں، ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اُس روایت کے مطابق کہ اس سورہ میں حمد و تمجید اور دعا و سوال کے مضامین یکجا ہیں، ارشاد ہے کہ جب بندہ نماز میں سورہ فاتحہ تلاوت کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قسمت الصلوٰۃ بینی وبین عبدی نصفین، نماز یا نماز کی یہ سورت پاک میرے اور میرے بندے کے درمیان آدھی آدھی بٹی ہوئی ہے، بندہ جب الحمد للہ رب العلمین کہتا ہے تو اللہ پاک فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری حمد کی اور جب الرحمن الرحیم مالک

یَوۡمِ الدِّیۡنِ کہتا ہے تو ارشاد فرماتا ہے کہ میرے بندہ نے میری بزرگی جتلائی، اور جب نمازی اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ کہتا ہے تو ارشاد ہوتا ہے کہ یہ میرے اور میرے بندہ کے درمیان ہے اور اس کے بعد اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ کی درخواست پیش ہوتی ہے، تو ارشاد ہوتا ہے کہ ولعبدی ماسأل میرے بندہ کے لئے وہ ہے جس کی اُس نے درخواست پیش کی،

آج کی مجلس میں مجھے درخواست کے اسی مضمون سے زیادہ تر بحث ہے، اس درخواست اور دعا کے الفاظ یہ ہیں جن کو ہر مسلمان نمازی دن رات میں بیسیوں دفعہ دہراتا ہے، بلکہ وہ نماز ہی نہیں جس میں حقیقتہً یا نیابتہً یہ درخواست اور دعا شامل نہ ہو اِھۡدِنَا الصِّرَاطَ الۡمُسۡتَقِیۡمَ صِرَاطَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمۡتَ عَلَیۡھِمۡ غَیۡرِ الۡمَغۡضُوۡبِ عَلَیۡھِمۡ وَلَا الضَّآلِّیۡنَ اس دعا اور درخواست میں بندہ اللہ تعالیٰ سے اپنی زندگی کے ہر پہلو میں سیدھے راستہ پر چلائے جانے کی استدعا بارگاہ الٰہی میں پیش کرتا ہے، اس مطلوبہ راہ راست اور صراط مستقیم کے ساتھ تین قیدیں لگی ہوئی ہیں، اے اللہ تو ہم کو سیدھے راستہ پر چلا، ان کا راستہ جن پر تیرا انعام ہوا، نہ ان کا جن پر تیرا غضب ہوا، اور نہ ان کا جو راہ راست سے بھٹک کر اپنی منزل مقصود کا راستہ کھو بیٹھے ہیں،

اب راہ راست کی ان تین قیدوں کی تشریح ضروری ہے جن میں سے پہلی قید تو تخصیصی ہے، اور پچھلی قیدیں احترازی ہیں، تخصیصی قید یہ ہے، کہ یہ سیدھا راستہ جس پر چلائے جانے کی درخواست ہے، وہ خاص ان بزرگوں کا راستہ ہو جن پر انعام ربانی اور فضل الٰہی کی بارش ہوتی ہے، دو احترازی قیدیں یہ ہیں، کہ ان کی راہ سے ہم کو بچایا جائے جن پر ان کی نافرمانی کے سبب سے اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا، اور نہ ان کا راستہ جو اپنی غلط روی کے باعث منزل مقصود سے دور جا پڑے ہیں،

قرآن پاک میں جا بجا یہ تصریحات ہیں کہ یہ انعام یافتہ گروہ کون ہے اور جن پر غضب ہوا وہ کون ہیں، اور جو راہ راست کو کھو چکے ہیں، وہ کون ہیں، قرآن پاک کی اصطلاح میں صراطِ مستقیم وہ راہ ہے جس پر انبیاء علیہم السلام چلے اور جن پر چلنے کی اللہ کے بندوں کو دعوت دی، ارشاد ہے :-

اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (یٰسٓ)	اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو پیغمبر ہو اور صراط مستقیم پر ہو،

دوسری جگہ ہے :-

وَاِنَّکَ لَتَھۡدِیۡۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (شوریٰ ۵)	اور اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو لوگوں کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی دعوت دیتا ہے،
فَھَدَی اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لِمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ مِنَ الۡحَقِّ بِاِذۡنِہٖ وَاللّٰہُ یَھۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (بقرہ - ۲۶)	یعنی اہل کتاب یہود و نصاریٰ نے جو دین کی مختلف راہیں نکالی ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو جو ایمان سے سرفراز ہیں ان سب سے بچا کر نبیوں اور صالحوں کے سیدھے راستہ پر چلاتے ہیں،

سورۂ انعام کے انیسویں رکوع میں عقائد، عبادات، معاملات، اور اخلاق کے اہم احکام کی تفصیل کے بعد ارشاد ہے،

وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیۡ مُسۡتَقِیۡمًا فَاتَّبِعُوۡہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمۡ عَنۡ سَبِیۡلِہٖ ذٰلِکُمۡ وَصّٰکُمۡ بِہٖ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ (انعام - ۱۹)	اور یہ ہی میری سیدھی راہ سو اس پر چلو اور مت چلو دوسرے راستوں پر کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے ہٹا دیں گے یہ کہہ دیا ہے تاکہ تم بچ سکو،

ان شواہد سے میرا مدعا ثابت ہے، کہ صراط مستقیم انبیاءؑ اور صلحاؑ کے راستہ کا نام ہے جس کے انبیاء علیہم السلام رہنما ہیں

اور جس کا دوسرا نام شریعت ہے جس کے لفظی معنی بھی راستہ ہی کے ہیں، صراطِ مستقیم کے کہنے ہی سے گو راستہ متعین ہو چکا ہے مگر احتیاط کا تقاضا اور رحمتِ الٰہی کا مطالبہ یہ تھا کہ اس راستہ کی مزید توضیح ایسی کر دی جائے جس سے اس راستہ پہ چلنے والے کا انجام بھی نظر کے سامنے آجائے، تو فرمایا وُہ راستہ جس پر وہ گروہ چلا جو اے اللہ تعالیٰ تیرے فضل و کرم اور انعام و الطاف سے سرفراز ہوا اور نہ ان کا راستہ جو مغضوب اور گمراہ گروہوں کا ہے" اس سے معلوم ہوا کہ اس سیدھے راستہ پر چلنے کا انجام انعام و اکرام الٰہی ہے اور جس کے چھوڑ دینے کا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے غضب کا نزول اور منزلِ مقصود سے بعد اور دوری ہے،

اب ہم کو اس انعام یافتہ گروہ کا پتہ چلانا ہے، سورہ نساء رکوع ۹ میں ہے،

وَلَوْ اَنَّهُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰهُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا وَّلَهَدَيْنٰهُمْ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا (نساء-۹)	اور اگر وہ بھی کریں جو ان کو کہا جاتا ہے تو ان کے حق میں بہتر ہو، اور زیادہ ثابت ہو، دین میں اور اس وقت ہم ان کو اپنے پاس سے بڑا ثواب دیں اور ان کو سیدھی راہ پر چلائیں، اور جو لوگ اللہ اور رسول کے حکم پر چلے ہیں، وہ ان کے ساتھ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے انعام سے نوازا ہے، نبی اور صدیق اور شہید اور صالح خوب ہے ان کی رفاقت یہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے فضل

(ترجمہ حضرت شاہ عبدالقادرؒ)

ان آیتوں میں سیدھے راستہ پر چلنے والے اطاعت گذار گروہوں کے چار نام یا اوصاف بتائے گئے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی نوازش اور مقبولیت سے سرفراز ہیں یعنی انبیائے کرام علیہم السلام جو انسانی جماعتوں میں سب سے اعلیٰ درجہ کے بندوں اور سرفراز افراد کے نام ہیں جن سے بڑھ کر رہنمائی اور انسانیت کے رہبروں کے لئے رہبری اور بشر کی اصلاح اور ہدایت کے لئے اللہ تعالیٰ نے دوسرا نمونہ نہیں بنایا، اس کے بعد ان تین گروہوں کے نام ہیں جو ان رہنماؤں اور رہبروں کے راستہ پر چل کر صدیقیت اور شہادت، در صلاح و فلاح کی منزلوں پر پہنچے ہیں، اور جنھوں نے اللہ تعالیٰ کے ان بنائے اور ڈھلے ہوئے نمونوں کو دیکھ کر اپنے کو درست کیا، اور دوسرے انسانوں کے لئے نمونہ بنے؛

اب ہم کو ان دو احترازی قیدوں کی طرف متوجہ ہونا ہے جن کے راستہ پر چلنے سے ہم کو اللہ تعالیٰ نے روکا ہے، ان میں سے پہلے گروہ کا نام مغضوب ہے، اور جن سے رحمتِ الٰہی مسلوب ہے، گو روایات میں تصریح ہے کہ یہ گروہ یہود ہے، مگر قرآن پاک میں بھی یہ تصریح ہے کہ اس غضب الٰہی کے مورد یہود اور یہود کے متبع ہیں "بقرہ رکوع ۷ میں ہے

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَالْمَسْكَنَةُ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ، (بقرہ-۷)	اور ماری گئی ان پر ذلت اور بے کسی اور کمالائے وہ اللہ کا غضب اور غصہ،

پھر اسی سورہ کے رکوع ۱۱ میں ہے کہ پہلے وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے انکار پر غضب کے مورد بنے اور آخری دفعہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے انکار و کفر پر ہمیشہ کے لئے غضب پر غضب کے مستحق ٹھہرے،

فَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ، (بقرہ-۱۱)	وہ غضب پر غضب یعنی دوہرے غضب کے مستحق ہو

اور اب ہمیشہ کے لئے لعنت اور غضب الٰہی کی آگ میں ڈال دیئے گئے، اور ہمیشہ کے لئے ان پر یہ حکم جاری کیا گیا، کہ اب دنیا کا کوئی

گوشہ ان کو اپنے دامن میں پناہ نہیں دیسکتا، وہ دولتمندی کے باوجود مفلس اور ذلیل وخوار رہیں گے، اور یہ حکم الٰہی ہو کہ کسی نہ کسی دوسری ظالم قوم کے غلام رہیں گے، اگران کو ہنگامی پناہ وقتاً فوقتاً ملے گی بھی توان کی دولت کے بٹورنے کی خاطر باری باری سے دولت پرست قومیں اپنی گود ون میں لیں گی، اوران کی جیبیں خالی کرکے ان کو پھر زمین پر ٹپک دیں گی، ارشاد ہوا:

ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا	ان یہود پر ذلت پھینک ماری گئی، جہاں وہ پائے گئے،
بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ	لیکن اللہ کی دستاویز اور لوگون کی دستاویز سے
بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ	یہ اس واسطے کہ وہ اللہ کے احکام کے ماننے سے،
ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ	انکار کرتے رہے، اور نبیون کو ناحق قتل کرتے تھے،
يَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا	یہ خصلت ان میں اس لئے آئی کہ وہ بے حکم اور
وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ، (آل عمران-۱۲)	حد سے بڑھ جانے والے تھے،

الغرض یہود پر اس غضب الٰہی کا نزول اور محکومی کی ذلت اور مسکنت اور قومی خواری کی لعنت میں وہ اس لئے گرفتار کئے گئے، کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے قبول سے منکر ہوئے، اوراب ان کی لعنت اس نبی آخر الزمان علیہ السلام پر ایمان اور اتباع کے سوا کسی اور تدبیر سے دور نہیں ہوسکتی، اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جو کوئی گروہ بھی انبیاء کی راہ چھوڑے گا، اور ان کی لائی ہوئی اور بتائی ہوئی صراط مستقیم سے منہ موڑے گا، اس کے لئے یہی جزا ہے،

وَمَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ (حج-۲) اور جسکو اللہ ذلیل کرے اسکو کوئی عزت دینے والا نہیں،

عزیزے کہ از درگہش سرتبافت بہر درکہ شد ہیچ عزت نیافت

یہود کی پوری تاریخ آغاز سے لے کر اس زمانہ تک قرآن پاک کی صداقت پر شاہد صادق ہے،

حضرات! اب ہم کو تیسرے گروہ کا پتہ لگانا ہے، جو راستہ سے بھٹکا ہے، منزل مقصود سے دور چلا گیا ہے اگرچہ روایات سے واضح ہے کہ یہ نصاریٰ کا گروہ ہے، لیکن قرآن پاک کی آیتیں خود بھی اس گروہ کا صاف صاف پتہ اور نشان بتارہی ہیں، نصاریٰ کے ذکر کے سلسلہ میں ہے، اس سے پہلے تثلیث کا ذکر ہے پھر ان کی مجسمہ پرستی کا اس کے بعد یہ آیتیں ہیں،

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ	اے اہل کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو اور
وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ	ان لوگون کے خیال پر نہ چلو جو تم سے پہلے راستہ سے
وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ	بھٹکے تھے اور بہتون کو گمراہ کیا تھا اور سیدھی راہ بھولے
(مائدہ-۱۰)	تھے،

اسی غلو فی الدین کی نصرانی حقیقت کا اظہار سورۂ نساء میں کیا گیا ہے،

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ وَلَا	اے اہل کتاب نہ زیادتی کرو اپنے دین میں
تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۭ اِنَّمَا الْمَسِيْحُ	اور نہ کہو اللہ پر مگر حق بیشک مسیح بن مریم اللہ
عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَكَلِمَتُهٗ (نساء-۲۳)	کے رسول اور اس کا کلمہ تھے،

بعض علمائے محققین نے لکھا ہے کہ یہود کا جرم احکام الٰہی میں تفریط اور کمی ہے، اور نصاریٰ کا جرم افراط یعنی احکام الٰہی پر زیادتی ہے جس کو قرآن پاک نے غلو کہا، تفریط غضب الٰہی کے نزول کا اور افراط ضلالت کا موجب ہے،

اس تفصیل سے یہ بات ہویدا ہے کہ امتِ محمدیہ کو ہر نماز کی ہر رکعت میں یہ تاکید ہے کہ یہ دعا مانگو کہ بارِ الٰہا ہم کو نبیون کی راہ پر چلنے کی توفیق عنایت فرما، اور یہود و نصاری جو تیرے مغضوب اور تیری راہ سے بھٹکے ہوئے ہین، ان کے راستون اور طریقون سے ہم کو بچا، اس موقع پر یہ بھی سمجھنا چاہئے کہ مغضوب اور ضال جس طرح اہل کتاب ہین، ہین اپنی اپنی مزاجی مناسبت کی بنا پر وہی صورتین متابعۃً شبہہ اہلِ کتاب مین بھی ہین جن کی دو جماعتون سے ہم کو قرآن نے واقف کرایا ہے، اور وہ مجوس اور صابئین ہین جن مین ایرانِ قدیم اور ہندِ قدیم کے باشندے بھی داخل ہین، ان کے راستون اور طریقون کی پیروی بھی انبیاء علیہم السلام کے راستون سے دور لے جاتی ہے،

انبیاء علیہم السلام کے بالمقابل انسانی رہبری و رہنمائی کے مدعی گروہ کا نام حکما ہے، جن کا دعوی ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا فیصلہ اپنی عقل و ذہنی حکمت سے کر سکتے ہین، اور وحی الٰہی کے علم و معرفت سے مستغنی ہین، اس لئے جن قومون نے انبیاء کو چھوڑا ہے، انھون نے یا تو براہِ راست حکما کی راہ اختیار کی، یا حکما اور انبیاء کے علوم اور تعلیمات مین اس طرح تطبیق اور مصالحت کی کوشش کی ہے کہ عقل پرستون کے علوم و تعلیمات کو صحیح و صادق باور کرکے انبیاء علیہم السلام کے علوم و تعلیمات مین تاویلِ فاسد کی راہ اختیار کی ہے، انبیاء علیہم السلام کے امتیون مین یہ راہ سب سے پہلے یہود نے اختیار کی، دیکھئے جب مصر سے نکل کر دریا پار ہوتے ہین، تو سامری مصری دیوتا کی طلائی مورت بچھڑے کی شکل مین بنی اسرائیل کے سامنے پیش کرتا ہے، اس وقت بنی اسرائیل پکار اٹھتے ہین، کہ یہی تمھارا اور موسی کا خدا ہے، هٰذَا اِلٰهُكُمْ وَاِلٰهُ مُوسٰى، اور بنی اسرائیل سربسجود ہو جاتے ہین، اور جب حضرت موسی علیہ السلام اس سے مواخذہ فرماتے ہین، تو صاف کہتا ہے :-

بَصُرْتُ بِمَا لَمْ يَبْصُرُوْا بِهٖ فَقَبَضْتُ قَبْضَةً مِّنْ اَثَرِ الرَّسُوْلِ فَنَبَذْتُهَا وَكَذٰلِكَ سَوَّلَتْ لِيْ نَفْسِيْ، (طٰہٰ - ۵)

مین نے وہ دیکھا جو انھون نے نہین دیکھا، پھر مین نے اس فرستادہ خداوندی کے نقش قدم سے ایک مٹھی بھر خاک اٹھائی تھی، سو مین نے وہ مٹی اس کے اندر ڈال دی اور میرے جی کو بھی یہی بات

آگے بڑھکر جب بنی اسرائیل کسی دوسری بت پرست قوم کے درمیان پہنچتے ہین، تو اپنے نبی سے فرمایش کرتے ہین کہ

اِجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ، (اعراف - ۱۶)

جیسے ان کے دیوتا ہین ہمارے لئے بھی ایک دیوتا بنا دیجئے،

موجودہ تورات مین بار بار یہ ذکر ملتا ہے کہ بنی اسرائیل نے غیر قومون کے معبودون کے آگے سر جھکایا، حضرت موسی علیہ السلام کے بعد جب حضرت عیسی علیہ السلام تشریف لائے، تو ان کا انکار کیا، ان کو طرح طرح سے ستایا، جن حواریون نے ان کو نبی مانا، حضرت عیسی علیہ السلام کی تشریف بری کے بعد حواریون کی گمراہی کے لئے یہودی ہی آگے بڑھے، اور انہی مین کے ایک نئے مدعی الہام کے آگے بڑھکر تثلیث پرستی وغیرہ کے فاسد عقیدے حضرت عیسی علیہ السلام کے دین مین داخل کئے، اور بالآخر ان کو گمراہ بنا کر چھوڑا، اور مصریون اور یونانیون کی دیومالا کی مالا ان کے گلے مین ڈال دی گئی، جس کو وہ اب تک ڈالے ہین پھر اسلام کے ظہور کے بعد امتِ محمدیہ مسلمہ کا جب وجود ہوا تو ان دونون گروہون نے مل کر اس نئی جماعت کی گمراہی کی چالین اور سازشین شروع کین، چنانچہ اللہ تعالی نے مطلع فرمایا،

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ — اہلِ کتاب مین سے کچھ لوگ دل سے چاہتے ہین

لَو يُضِلُّونَكُم (آل عمران - ۷) کہ تم کو گمراہ کر دین،

اہلِ تاریخ جانتے ہین کہ اسلام مین سب سے پہلا فتنہ یہود نے کیونکر پیدا کیا، اور شبہہ اہلِ کتاب مجمیون نے اس چنگاری کو پھونک پھونک کر ضلالت کا آتشکدہ کیونکر تیار کیا، پھر جب دمشق اور بغداد مین مسلمانون کی حکومتون کے تخت بچھے، تو یہی تھے جنھون نے قرآن پاک کے ساتھ ساتھ ارسطو و افلاطون کے نسخون کو آمیز کرکے اسلام کے عقائد و اعمال کا نیا صحیفہ بنا کر پیش کر دیا،

اے حضرات! بہتر ہو کہ اس موقع پر ماضی کی داستان تہ کر دی جائے اور حال کی کہانی سنائی جائے، سب کو معلوم ہے کہ یہود نے جب سے یورپ کی زمین مین یونانیون کے زمانہ سے قدم رکھا ہے، اور وقتاً فوقتاً مختلف ملکون کی عیسائی قومون کے بظاہر زیر سایہ رہ کر ان پر ذہنی و علمی اور مالی فرمانروائی کی ہے، اور جب اس قوم کو تنبہ ہوا ہے، تو اس نے ان کے خلاف ہنگامہ برپا کرکے ان کو تہ تیغ کرکے اور ان کی لوٹی ہوئی دولت کو تصرف مین لا کر خود ان کو اپنے ملک سے جلا وطن کرکے اپنی گلو خلاصی کی ہے، یہ واقعہ ایک دفعہ نہیں بلکہ یورپ مین بار بار پیش آیا ہے، اور جس کی آخری مثال نازی ہٹلر کی صورت مین ہمارے اور آپ کے زمانہ مین بھی پیش آئی،

یورپ کا ہر فتنہ اور ذہنی انقلاب کا ہر ہنگامہ جو دنیائے نصاریٰ مین رونما ہوتا رہا ہے، اس کی تہ مین جو قوت کارفرما ہوتی ہے وہ یہودی ہوتی ہے، وطنیت کا فتنہ، بین الاقوامیت کا فتنہ، ڈیموکریسی کا فتنہ، سوشلزم کا فتنہ، بالشوازم کا فتنہ، ان مین سے کون چیز ہے جو یہود کی دماغی سرکشی اور ذہنی طغیان خیال کی ممنون نہین، آج یورپ اور امریکہ مین ایک طرف سرمایہ پرستی اور جمہوریت کا پرا قائم ہے اور دوسری طرف مزدورون اور کسانون کی دعوت کی غلط صورت اور سوشیالسٹ تحریک کی لادینی حکومت کے کیمپ لگے ہوئے ہین، اور دونون چیزین یہودیون کی طاغیانہ رہنمائی اور نصاریٰ کی گمراہی کے دوگونہ عناصر سے مرکب ہین، اور ساری دنیا ان دونون طغیانی و گمراہی کے فتنون مین سر سے پاؤن تک مبتلا ہے، افسوس کہ وقت کا تقاضا ان تخاصمین کی اصلی حالت کی تفصیل و تشریح و تطبیق کی اجازت نہین دیتا،

آج ہمارے اسلامی ممالک خواہ وہ اپنے کو آزاد کہین یا غلام، حاکم کہین یا محکوم، کیا انہی دو فتنون مین سے کسی ایک مین مبتلا نہین، اب یاد کیجئے، رب العالمین مالک یوم الدین نے اول روز سے ہم کو یہ بتایا تھا، کہ تم ہمیشہ ہر ایک حال اور اپنی ہر ایک چال مین انبیاء علیہم السلام کے راستہ پر قائم رہنا اور مغضوب اور ضال قومون کے راستون سے بچتے رہنا، مگر کیا یہ واقعہ نہین کہ ہم نے اس کا الٹا کیا، یعنی انبیاء کے راستہ کو چھوڑ کر مغضوب اور ضال قومون کی راہون کو اختیار کیا، اور آج بھی یہی حال ہے، آج مسلمانون کی ہر جماعت خواہ وہ کسی ملک مین ہو اپنی ترقی و اصلاح اور سعادت کے لئے انبیاء علیہم السلام کی طرف نہین، بلکہ انہی مغضوب اور ضال قومون کی امامت کی اقتدار کے لئے بے قرار ہے، وضع و قطع تراش و خراش، صورت و سیرت، تعلیم و تربیت، تہذیب و تمدن، اخلاق و عادات، رفتار و گفتار، تجارت و اقتصاد و معاملات اور حکومت و سلطنت غرض زندگی کے ہر شعبہ مین اس کا رُخ انبیاء علیہم السلام کی طرف ہے، یا مغضوب و ضال قومون کی طرف ہے، ہم زبان سے تو کہتے ہین کہ منہ میرا طرف کعبہ شریف کے، مگر رفتار کی سمت لندن، پیرس، ماسکو، برلن اور نیویارک ہے، زبان سے تو اپنی سعادت اور ہدایت کو انبیاء علیہم السلام کی اور خصوصاً سرورِ کائنات احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی مین منحصر جانتے ہین، مگر دل مین اپنی ترقی کا راز یورپ اور امریکہ کی پیروی مین منحصر مانتے ہین، ہم مین سے بعضون نے جو دانشمندی کے مدعی ہین، دین اور دنیا کے دو حصے کر رکھے ہین، اور دین مین انبیاء کی اور دنیا مین ان مغضوبون اور

گمراہون کی پیروی کے داعی ہین، لیکن دین و دنیا کی یہ تقسیم کی تاویل بھی انہی گمراہون کی تعلیم کا اعادہ ہے جنھون نے اپنے آسمانی صحیفون مین یہ لکھا پایا ہے، کہ "جو قیصر کا ہے، وہ قیصر کو دو، اور جو خدا کا ہے، وہ خدا کو دو"، گویا وہ دو خداؤن کے قائل ہین، قیصر جو دنیا پر حکومت کرتا ہے، اور خدا جو آسمان پر فرمانروا ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کی تعلیم مین وہ واحد ہے، وہ قیصر کون ہے جو خدا کے ساتھ برابر کی حکومت کا دعویدار ہے، للہ ملک السموات والارض (آسمانون اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے)، ان مغضوب وضال قومون کی ایجاد و اختراع، دولت و طاقت، حکومت و سلطنت کی ظاہری چمک دمک نے ہماری آنکھون کو خیرہ کر دیا ہے، ان کی عریانی و بے پردگی ان کی نفس پرستی و ہوسناکی و خود پسندی، ان کے تکبر و استکبار ان کے کفر و عصیان کی ہر تصویر ہمارے دل کو پسند ہے، ہمارے بچے، جوان، بوڑھے، عورت اور مرد ہر ایک اس کوشش مین ہے کہ وہ یہود و نصاریٰ کے اس مشترکہ پیدا کردہ تہذیب و تمدن، طور و طریق، شکل و لباس، تعلیم و تربیت کی راہون کی اقتدا کی تیز سے تیز دوڑ مین دوسرون سے آگے بڑھ جائے، اور ہر اس ناصح کی تکذیب مین مصروف ہے، جو ان کو ان مغضوبون اور گمراہون کی پیروی سے باز رکھنے کی کوشش کرے، آج مسلمان نوجوان اپنی زندگی کے ہر پہلو مین اپنی ملت کے رہنماے اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ نہین، بلکہ لینن، اسٹالن، ہٹلر، مسولینی، چرچل اور روزویلٹ کے نمونون کی تلاش اور ان کے روپ بھرنے مین ہر طرح کوشان ہین، اور انہی کی پیروی مین مسلمانون کی نجات سمجھتے ہین، انا للہ وانا الیہ راجعون،

اہل سیاست کو موجودہ مغضوب وضال قومون کے مذموم تمدن و تہذیب، مکروہ اور بے آئین نظام سلطنت و حکومت، ظالمانہ طریق حکمرانی و فرمانروائی، گمراہانہ طریق تعلیم و تربیت، فاسد اخلاق و کردار، اور قزاقانہ اقتصاد، وحشیانہ طاقت اور مجرمانہ سیاست پر افسوس نہین، بلکہ اس پر حسرت ہے، کہ اس مجرم، گنہگار، عریان، خوشنما، فاسد الاخلاق قزاق اور وحشی طاقت کے حکمران و فرمانروا اور ظالم نظام اقتصاد اور فاسد اصول قضا و عدالت کے مالک ہم کیون نہ ہوئے ان کو یہ افسوس نہین کہ شیطان کا یہ تخت جبروت کیون بچھا ہے، بلکہ یہ افسوس ہے کہ ہم اس پر کیون نہ بیٹھے، نہین ان کو شیطان کے تخت الٹنے کی فکر نہین، بلکہ اس پر جلوس فرمانے کی فکر مستولی ہے،

مسلمان مدت سے اس حالت مین ہین کہ وہ اپنے کو بھول گئے ہین، اور دوسری قومون کی نقالی مین مشغول ہین، اسلام ایک مستقل نظام حیات، نظام اقتصاد، نظام سیاست اور نظام اخلاق کا نام ہے، خود اپنے نظامات سے روگردان ہو کر یا ان مین ترمیم و تبدیلی کر کے دنیا کے دوسرے ناقص و فاسد نظامات کو اختیار کرنے مین اپنی زندگی کی نجات سمجھتے ہین

ترکی، مصر، شام، عراق، افغانستان، شمالی افریقہ، ہندوستان، غرض وہ جہان کہین بھی ہین، خواہ وہ حاکم ہون محکوم، یورپ کی نقالی کو اپنی نجات کا واحد ذریعہ سمجھتے ہین، وہ دنیا مین قیصریت اور کسرویت کے علمبردار اور پیغمبرون کے بجائے ہلاکوؤن اور چنگیزون کے جانشین بن گئے،

آج انقلاب کا عہد ہے، مسلمانون کو چاہئے کہ وہ پھر سے اپنی رفتار کی سمت اور زندگی کے مقصد کو درست کرین، وہ اللہ کے محکوم، اس کی شریعت کے حامل اور دنیا مین اس کی شہنشاہی کے نمایندہ ہین، ان کو پہلے اللہ کے قانون کو اپنے اوپر اور پھر اس کے بعد دوسرون کے اوپر نافذ کرنا چاہئے،

مسلمانون کو ان معنون مین قوم نہین کہنا چاہئے جن معنون مین رنگ اور نسل و نسب اور وطن کے اجزائے ترکیبی سے دنیا مین قومین بنائی جاتی ہین، بلکہ انسانی جماعتون کا وہ ایسا مجموعہ ہین، جن کے ترکیبی اجزاء خاص خیالات، خاص عقائد،

خاص اعمال، خاص اخلاق، خاص تمدن، خاص اصول سلطنت و حکمرانی ہین، اسی لئے وہ دوسری قومون کے ساتھ متحد و محکوم ہوکر نہین بلکہ مصالحانہ و معاہدانہ اصول پر دوست بن کر زندگی بسر کرسکتے ہین، ورنہ ان کا وجود دوسری قومون کے ساتھ مخلوط ہوکر پائدار نہ ہوگا خصوصیت کے ساتھ اس احاطۂ بمبئی مین جہان مسلمان تعداد مین نسبتہً کم ہین اور دنیا بھر کی مختلف قومون، مذہبون اور فرقون کے سمندر مین غرق ہین،

اے حضرات! ضرورت ہو ذہنیت کے بدلنے، خیالات کے پلٹنے اور صحیح فکر کو سامنے رکھنے، اور صحیح نصب العین کو اپنے دل مین جگہ دینے کی جہان تک جمعیت العلمائے بمبئی کا تعلق ہے، اس مقصد کو حسب ذیل طریقون سے حاصل کیا جاسکتا ہے،

(۱) بمبئی مین ایک عظیم الشان مذہبی درسگاہ کا قیام عمل میں آئے، جس میں صحیح تعلیم و تربیت کی پوری نگرانی و حفاظت ہو،

(۲) یہان کی مسجدون مین قرآن پاک کے عام فہم درس کا انتظام کیا جائے جس سے عام مسلمانون کو اپنے دین کی صحیح واقفیت ہو،

(۳) عام ماہانہ مواعظ کے ذریعہ سے اخلاق و عاداتِ فاسدہ اور شادی و غمی کے بیجا مراسم کی اصلاح ہو،

(۴) وقتاً فوقتاً اردو اور گجراتی و مرہٹی زبانون مین اسلامی رسالون کی اشاعت کا سامان کیا جائے،

(۵) ایسی مخلص جماعتین بنائی جائین، جو محلہ محلہ مین پھر کر مسلمانون میں کلمۂ توحید کی تلقین اور نماز کی تاکید کرین؛

تابعین رض

علم و عمل اور مذہب و اخلاق میں صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے سچے جانشین اور ان کے تربیت یافتہ تابعین کرام رضی اللہ عنہم تھے اور صحابۂ کرام کے بعد انہی کی زندگی مسلمانون کے لئے نمونۂ عمل ہو، اس لئے سیر الصحابہ کی تکمیل کے بعد دار المصنفین نے اس مقدس گروہ کے حالات کا یہ تازہ مرقع مرتب کیا ہو، اس مین حضرت عمر بن عبد العزیز رض، حضرت حسن بصری رض، حضرت اویس قرنی، حضرت امام زین العابدین رض، حضرت امام باقر رض، حضرت امام جعفر صادق رض، حضرت محمد بن حنفیہ رض، حضرت سعید بن مسیب رض، حضرت محمد بن سیرین رض، حضرت ابن شہاب زہری رض، امام ربیعۃ الرائی، امام مکحول شامی، قاضی شریح رض وغیرہ چھیانوے اکابر تابعین رض کے سوانح ان کے علمی، مذہبی، اخلاقی اور علمی مجاہدات اور کارنامون کی تفصیل ہے،

مرتبہ شاہ معین الدین احمد ندوی ضخامت ۵۶۰ صفحے قیمت: للعہ

اشتراکیت اور اسلام

ازمسعود عالم ندوی

جس مین اسلام اور اشتراکیت کی تعلیمات کے تقابلی مطالعہ اور اشتراکیت کے خلافِ فطرت معاشی اصولون کی علمی و فنی تنقید کی گئی ہے، نیز اس کے مابعد الطبیعی نظریون پر ایک ناقدانہ نظر بھی ڈالی گئی ہے، ضخامت ..صفحے قیمت عمر

منیجر

غیر اسلامی ممالک مین

سود و قمار وغیرہ کا حکم

از

مولانا ظفر احمد صاحب عثمانی تھانوی استاذ دینیات ڈھاکہ یونیورسٹی

جون ۱۹۴۵ء کے معارف مین مولانا گیلانی کا ایک مضمون عنوان بالا کے تحت مین نظر سے گذرا جو اسلامی معاشیات کے سلسلہ مین بطور تحتانی عنوان لایا گیا ہے، یہ سلسلہ بہت ہی نافع اور مفید ہے، جو مولانا کی وسعت نظر پر دال ہے اور ان لوگون کے لئے جو اسلام مین مسائل معاشیات کے منکر ہین، یا یہ سمجھتے ہین کہ مذہب اسلام مین اس باب کو مکمل طور سے نہین بیان کیا گیا، بہت کچھ سبق آموز ہے، مگر کاش مولانا اس باب مین اس مسئلہ کو نہ چھیڑتے، جس پر اس وقت مجھے قلم اٹھانا پڑا ہے، اگر مولانا اس مسئلہ پر مقلدانہ طریق سے ہی کلام فرماتے، تو مجھے کچھ لکھنے کی ضرورت نہ تھی، کیونکہ مقلد کو اپنے امام کے قول پر فتوی دینے اور اس پر تفریعات کرنے کا حق ہے، گو ہنوز یہ امر بھی محل کلام ہے کہ جس اطلاق کے ساتھ مولانا گیلانی دار الحرب مین، ربا و قمار کو جائز کر رہے ہین وہ امام اعظم کا مذہب ہے بھی یا نہیں؟ امام اعظم اور ان کے شاگرد امام محمد بن حسنؒ کے اصلی الفاظ اس مسئلہ مین کیا ہین، اور کتب فتاوی مین جو کچھ مذکور ہے، وہ ان کے الفاظ کا مفہوم ہے یا نہین؟ یہ مباحث علیحدہ حیثیت سے لائق غور ہین، لیکن ایک مقلد کو دائرۂ تقلید سے باہر قدم نکالتے ہوئے تو گردوپیش کے تمام پہلوؤن پر نظر کر لینا ضروری ہے، افسوس ہے کہ مولانا گیلانی نے ایسا نہین کیا، اور بڑی عجلت مین ان لوگون سے جو اس مسئلہ مین امام ابو حنیفہؒ کے مسلک پر چلنے کو خلاف احتیاط سمجھتے ہین یہ مطالبہ کر ڈالا کہ "قرآن و حدیث و اجماع و قیاس الغرض کسی شرعی دلیل سے الحربی کے اموال کی عدم اباحت کا ثبوت پیش کر سکتے ہون تو پیش کرین" (معارف جون ۱۹۴۵ء ص ۴۳۰)

میری سمجھ مین نہین آیا، کہ مولانا کو ان سے اس مطالبہ کا حق کس قاعدہ سے حاصل ہے؟ اگر وہ بقاعدہ مناظرہ گفتگو فرما رہے ہین، تو دوسری جماعت منکر اباحت ہے، اور مولانا مدعی اور بالاتفاق بار ثبوت بذمہ مدعی ہے نہ بذمہ منکر، اور اگر فقہی اصول سے گفتگو کی جا رہی ہے، تو دوسری جماعت احل اللہ البیع وحرم الربوا کو قید مکان سے مطلق مانتی ہے، اور مولانا اس کو دار الاسلام کی ساتھ مقید کرتے ہین، اور مطلق کا اپنے اطلاق پر ہونا اصل ہے، تو جو اطلاق کا قائل ہے، وہ متمسک بالاصل ہے اس کے ذمہ بار ثبوت نہین، بار ثبوت اس کے ذمہ ہے جو مطلق کو مقید قرار دے رہا ہے، ان کو اس کی وجہ خود بتلانا چاہئے کہ جب "احل اللہ البیع" مطلق ہے، کہ حلت بیع کسی مکان کی ساتھ مقید نہین تو اس کا قرین "وحرم الربوا" دار الاسلام سے کیون مقید ہے،

اسی طرح آیت:۔

یَاأَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَیْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّیْطَانِ،	اے ایمان والو! شراب اور جوا اور یہ (بتون کے) مجسمے اور (فال دینے کے) تیر یہ سب پلید ہین شیطانی کام ہین اور کچھ نہین ۱۲

میں خمر وانصاب وازلام کی حرمت مسلمانوں کے لئے مطلق ہو یعنی نہ دار الاسلام میں اس کی اجازت ہے، نہ دار الحرب میں، پھر حرمت میسر (قمار) دار الاسلام سے کیوں مقید ہے، حالانکہ وہ خمر وغیرہ کے ساتھ ساتھ مذکور ہے، شریعت نے زنا کو حرام کیا ہو تو وہ ہر جگہ حرام ہے یہی حال حرمت ربوا کا ہونا چاہئے، رہا یہ فرمانا کہ یہ معاملہ "ربوا" کا معاملہ ہی نہیں، بلکہ ایک مباح مالی کو قبضہ کرکے اپنی ملک بنانا ہو تو اس پر سوال یہ ہے کہ آپ کے پاس اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ ربا کا معاملہ نہیں کیونکہ لغۃً وعرفاً یہ عقد عقد ربا ہے، تعریف ربا اس پر صادق ہے، اور جب لغۃً وعرفاً یہ عقد عقد ربا ہے، تو یقیناً آیت کے تحت میں داخل ہو، اگر مولانا اس کو آیت ربوا سے خارج کرنا چاہتے ہیں، تو کوئی دلیل قطعی پیش کریں، قرآن نے تو کفار اہل حرب ہی کے قول کو اس آیت میں رد کیا ہے،

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا،　　یہ (عذاب) اس وجہ سے ہو کہ وہ کہتے ہیں کہ بیع بھی تو ربا ہی کے مثل ہو حالانکہ اللہ نے بیع کو حلال کیا ہو، اور سود کو حرام　　(بقرہ - ۳۸)

مجھے یہ تبلایا جائے کہ انما البیع مثل الربوا کہنے والے کون لوگ تھے؟ جب قرآن نے کفار کے اس قول کو رد کیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اسلام کفار کے لئے بھی باہم عقد ربا کو جائز نہیں رکھتا، بلکہ بیع کو حلال اور ربوا کو حرام قرار دیتا ہے، جب کفار کے لئے بھی باہم یہ عقد جائز نہیں، اسی لئے کفار اہل ذمہ و اہل صلح کو ہمیشہ ربا سے منع کیا گیا، اور بصورت مخالفت ان کو ناقض عہد صلح قرار دیا گیا تو مسلمانوں کو کفار کے ساتھ اس عقد کی کیونکر اجازت ہوسکتی ہے؟ پس ثابت ہوا کہ کافر کا عقد ربا بھی لغۃً وعرفاً ربا ہے، اور اس آیت کے تحت میں داخل ہے،

اب اگر کوئی یہ دعوی کرے کہ مسلمانوں کو کافر حربی سے سودی لین دین کی اجازت ہے، کیونکہ وہ حقیقت میں ربا نہیں، اس کو دلیل قائم کرنا چاہئے، اور تبلانا چاہئے کہ جو عقد لغۃً وعرفاً ربا ہے، وہ اس صورت میں ربا کیوں نہیں رہا، اور اگر مال حربی باوجود اس کے قبضہ و ملک میں ہونے کے ایسا مباح ہے، جیسے جنگلی جانور تو پھر کافر حربی سے کسی مال کا خریدنا بھی جائز نہ ہونا چاہئے، کیونکہ مال مباح جب تک مباح ہے، بیع و شراء کا محل نہیں، پس کافر کے ساتھ عقد ربا کی اباحت اس کی ساتھ عقد بیع کی حرمت کو مستلزم ہوگی،

اگر کہا جائے کہ لغۃً وعرفاً تو یہ ربا ہے مگر شرعاً ربا نہیں اور حدیث لَا رِبٰوا بَيْنَ الْمُسْلِمِ وَالْحَرْبِيِّ فِيْ دَارِ الْحَرْبِ اس کی دلیل ہے، تو مولانا کو معلوم ہونا چاہئے، کہ یہ حدیث خبر واحد بھی ہے، اور ضعیف بھی، خبر واحد ہونا تو ظاہر ہے کیونکہ کسی نے

---

[۱] اس کی مزید تائید آیت يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوٓا، سے ہوتی ہے، کیونکہ تفاسیر واحادیث سے معلوم ہوتا ہے، کہ یہ بقایا سود جس کے چھوڑنے کا آیت میں حکم دیا گیا ہے زمانہ جاہلیت کا تھا جب کہ مکہ دار الحرب تھا، اگر یہ معاملہ حلال ہوتا، تو حلال معاملہ سے جو حق واجب ہو، اس کا مطالبہ ہر حال میں درست ہے، گو مطالبہ کے وقت وہ معاملہ ناجائز ہو، مثلاً ایک کافر نے دوسرے کافر سے ایک روپیہ کی شراب خریدی، ان کے لئے یہ معاملہ حلال تھا، پھر دونوں مسلمان ہوگئے، تو باوجودیکہ اب ایسی بیع و شرا درست نہیں، مگر پچھلا روپیہ وصول کرنا درست ہے، پس جب ربا میں پچھلا بقایا لینے کی اجازت نہ ہوئی تو معلوم ہوا کہ اس وقت بھی حلال نہ تھا، پھر جب حربی حربی میں درست نہ ہوا تو مسلم اور حربی میں کیسے درست ہوگا، فافہم،

بھی اس کو حدیث مشہور یا متواتر نہیں کہا، وَمَنْ ادعیٰ فعلیہ البیان، اور ضعیف اس لئے ہے کہ امام صاحب نے اس کو حدثنا بعض مشیختنا عن مکحول عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم لکھکر بیان کیا ہے جس میں امام صاحب کے شیخ مجہول ہیں اور مکحول سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک سند متصل نہیں منقطع ہے،

آپ تقلید کی بنا پر یہ کہہ سکتے ہیں، کہ چونکہ امام صاحب نے اس حدیث سے احتجاج کیا ہے، اس لئے صحیح ہے، مگر یہ تصحیح تقلیدی ہوگی نہ تحقیقی، اور اس وقت گفتگو تقلیدی نہیں، کیونکہ آپنے دائرہ تقلید سے نکل کر دوسرے علماء سے دلیل کا مطالبہ کیا ہے"، اور صورت اول میں بھی خبر واحد سے آگے یہ حدیث نہ بڑھے گی، اور حنفیہ کا اصول ہے، کہ نص قطعی کے اطلاق یا عموم کو خبر واحد سے مقید یا مخصوص کرنا جائز نہیں،

اب آپ کے ذمہ امام صاحب کے اس قول کو خود ان کے اصول پر صحیح ثابت کرنا لازم ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اموال اہل حرب مباح ہیں، اس لئے وہ محل ربا ہی نہیں، پس امام صاحب نے آیت کے اطلاق کو باطل نہیں کیا، کہ اس کو ربا مان کر جائز کہا ہو بلکہ ایک مستقل حکم مان کر بیان کیا ہے کہ اموال اہل حرب بوجہ اباحت کے محل ربا نہیں ہیں، اس کا ایک جواب تو اوپر گذر چکا کہ اگر اموال اہل حرب مطلقاً مباح ہیں تو ان کو آپس میں بھی معاملہ ربا جائز ہونا چاہئے، اور یہ نص کے خلاف ہے، اور اگر صرف مسلمان کے لئے مباح ہیں تو مسلمانوں کو ان کے ساتھ عقد بیع و شراء جائز نہ ہونا چاہئے"

دوسرے اسپر سوال یہ ہے کہ مال الحربی مباح یہ تو صغریٰ ہوا، اس کے بعد کبریٰ کا ثبوت آپ کے ذمہ باقی رہے گا کہ

وکل ماکان مباحاً فعقد الربا فیہ جائز د	جو مال مباح ہو اوس میں عقد ربا جائز ہے یا
لیس ھو محلا للربا ودون اثباتہ خرط القتاد	یا وہ محل ربا نہیں، اور آپ اس کو ثابت نہیں کر سکتے،

فقہا نے لکھا ہے کہ بوقت حاجت باپ کے لئے بیٹے کا مال بقدر حاجت مباح ہے، تو کیا باپ کو بیٹے کے ساتھ عقد ربا بھی جائز ہے حالت اضطرار میں ایک مسلمان کو دوسرے کا مال لینا مباح ہے، تو کیا اس کے ساتھ عقد ربا بھی جائز ہوگا، اگر کوئی شخص اعلان کردے ابحت مالی لمن اخذہ (میں نے اپنا مال ہر شخص کے لئے مباح کردیا ہے جس کا جی چاہے لیلے) تو کیا اوس کے ساتھ عقد ربا جائز ہو جائے گا، کیونکہ اس کا مال مباح ہو چکا ہے، ہرگز نہیں، اگر آپ اس کے قائل ہو بھی جائیں، تو آپ کے امام اس کے قائل نہیں، پھر اموال اہل حرب کا مباح ہونا ایک دوسری اصل پر مبنی ہے، کہ "اہل الحرب کلھم ارقاء" اہل حرب سب غلام ہیں، مگر اس سے مراد وہ اہل حرب ہیں، جو معصوم الدم نہ ہوں، ورنہ کون نہیں جانتا کہ اگر کفار اہل حرب سے صلح ہو جائے، تو وہ غلام نہیں بنتے، بلکہ آزاد رہتے ہیں، تو اہل حرب کے اموال کی اباحت بھی مطلق نہ ہوگی، بلکہ اموال مقاتلین کے ساتھ مخصوص ہوگی، کہ مقاتلہ کے وقت اہل حرب کا جو مال بطور غنیمت کے ہمارے قبضہ میں آئے، وہ مباح ہے اور اس میں بھی احراز بدار الاسلام شرط ہے، (کہ مال غنیمت دار الحرب سے دار الاسلام کی طرف منتقل کر دیا گیا ہو) اسی لئے حنفیہ کے نزدیک دار الحرب میں تقسیم غنائم جائز نہیں، اگر اموال اہل حرب کی اباحت پرندوں کے شکار کی طرح ہوتی، تو ان قیود کی کیا حاجت تھی، پھر اموال غنیمت میں بھی یہ جائز نہیں کہ جس مسلمان کا جس چیز پر قبضہ ہو جائے، وہ اس کا مالک بن جائے، بلکہ امام کی تقسیم کے بعد مالک ہوگا، اور مال غنیمت میں غلول و خیانت

سلہ اور یہاں سے ان کا بھی رد ہو گیا جو دار الحرب میں مال حربی کو فئی قرار دیتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ مسلمان حربی سے عقد ربا کرکے مال فئی پر قبضہ کرتا ہے، ان کو جاننا چاہئے کہ مال فئی عامۂ مسلمین کا حق ہے، نہ کسی خاص شخص کا، بہرحال جو مال بطریق عقد ربا حربی کی رضامندی سے لیا جاتا ہے، اگر یہ فئی میں داخل ہوتا تو امام ابو یوسف اور دیگر ائمہ کو اس کی حلت میں اختلاف کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی،

سخت جرم ہے، اسی طرح اگر کفار کسی مسلمان کو دارالاسلام سے یا میدان جنگ سے قید کرکے دار الحرب لے جائین، یا کوئی مسلمان بدون استیمان کے متلصصاً (جاسوس بنکر) دار الحرب میں جائے، اوس کے لئے بھی اموال اہل حرب بجز عورتون کے مباح ہین، کیونکہ قیدی یا متلصص سے کسی قسم کا معاہدہ یا صلح کا معاملہ نہین ہوتا، لیکن جو مسلمان دار الحرب مین مستامن بنکر جاتے ہین، یا کسی معاہدہ کے تحت وہان زندگی گذارتے ہین، خواہ معاہدہ قولی ہو یا حالی[1] اُن کے لئے اموال اہل حرب کا مطلقاً مباح ہونا مسلم نہین جس کو دعوی ہو وہ اس پر دلیل قائم کرے،

اس تقریر سے یہ قیاس بھی باطل ہوگیا، کہ لاربا بین المسلم والحربی (مسلمان اور حربی کافر کے درمیان ربا نہین) یہ حکم ویسا ہی ہے، جیسا لاربا بین العبد والمولی (کہ غلام اور آقا کے درمیان ربا نہین) کیونکہ غلام اور آقا کا تعلق ایسا ہے، کہ آقا بدون غلام کی رضا کے بھی اوس کا مال لے سکتا ہے، وہ حقیقت مین آقا ہی کا مال ہے، غلام کا مال ہے ہی نہین، اور حربی اہل صلح سے بدون رضا کے اس کا مال لینا جائز نہین، پس یہان رضا کا شرط ہونا وہان شرط نہ ہونا خود اس قیاس کے غلط ہونے کو واضح کر رہا ہے" حربی کی رضا کا مشروط ہونا اوس کی ملکیت کی دلیل ہے، اور ملکیت کے ساتھ اباحت مطلقہ کا حکم کیونکر صحیح ہوسکتا ہے، پس شرط رضا کے ساتھ مولانا کا یہ فرمانا کہ مباح و جائز مال کا مملوک ہونے کے لئے صرف قبضہ کافی ہے، مثلاً جنگل کے کسی پرندے کا شکار کرکے قبضہ کرلینا اس پرندے کے مالک ہونے کے لئے کافی ہے" بہت ہی بعید از قیاس ہے، اگر مال حربی مباح ہے تو صرف قبضہ کافی ہونا چاہئے، اس کی رضا شرط نہ ہونا چاہئے، مین اوپر بتلاچکا ہون، کہ اباحت مال اہل حرب کا حکم مطلق نہین، بلکہ خاص حالات کی ساتھ مخصوص ہے، جب کہ حربی غیر معصوم الدم ہو خواہ مقابلہ و مقاتلہ کی وجہ سے یا مصالحت نہ ہونے کی وجہ سے پس جب لشکر اسلام دار الحرب پر حملہ آور ہو یا کوئی

---

[1] ودلیل اعتبار المعاهدة الحالیة مارواه ابوداؤد فی باب صلح العدو والبخاری فی باب الشروط فی الجهاد بلفظ وکان المغیرة صحب قوماً فی الجاهلیة فقتلهم واخذ اموالهم ثم جاء واسلم فقال النبی صلی الله علیه وسلم اما الاسلام فاقبل واما المال فلست منه فی شیئ الحدیث،

قال القسطلانی لان اموال المشرکین وان کانت مغنومة عند القهر فلا یحل اخذها عند الامن فاذا کان الانسان مصاحباً لهم فقد امن کل واحد منهما صاحبه فسفك الدماء واخذ الاموال عند ذلك غدر والغدر بالکفار محظور وانما تحل اموالهم بالمحاربة والمغالبة،

وذکر نحوه الکرمانی وصاحب الخیر الجاری ولا نعلم فیه خلافاً وفیه دلالة علی عدم اباحة مال الحربی عند الامن،

اور معاہدہ حالی کے معتبر ہونے کی دلیل وہ حدیث ہے جو ابوداؤد نے باب صلح العدو میں اور بخاری نے باب الشروط فی الجہاد میں نقل کی ہے، کہ مغیرہ اسلام لانے سے پہلے چند آدمیون کے ساتھ تھے، ان کو قتل کرکے ان کے مال پر قبضہ کرلیا، پھر آکر اسلام لائے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا را اسلام تو مین قبول کرتا ہون لیکن اس مال سے مجھے کوئی تعلق نہین،

قسطلانی کا بیان ہے کہ مشرکین کا مال اگرچہ غلبہ کے وقت غنیمت ہے لیکن امن کی حالت مین ان کا خون بہانا اور ان کا مال لینا جائز نہین ہے اور پھر جب انسان ان کا ساتھی ہو تو گویا دونون ایک دوسرے سے مامون ہون گے اور ایسی صورت مین قتل و مال لے لینا دھوکا ہے، اور دھوکا کفار کے ساتھ بھی ممنوع ہے البتہ ان کا مال جنگ اور غلبہ کی صورت مین حلال ہے،

اسی قسم کی رائے کرمانی اور صاحب خیر جاری نے بھی ظاہر کی ہے جس مین کوئی اختلاف نہین ہے، یہ اس کا ثبوت ہے کہ امن کی حالت مین دار الحرب مین حربی کا مال اس طرح لینا جائز نہین ہے،

مسلمان تصص یا قید کی حالت مین دار الحرب جائے، اس صورت مین مسلم کو حربی سے عقد ربا جائز ہوسکتا ہے، کیونکہ ان حالات مین بدون رضا کے غصباً وجبراً بھی وہ اس کا مال لے سکتا ہے، تو بذریعہ عقد ربا کے تراضی کے ساتھ بدرجۂ اولیٰ لیگا، اور غالباً حدیث مکحول مین حربی سے ایسا ہی حربی غیر معصوم الدم مراد ہے، کہ وہی حربی کامل ہے، والمطلق اذا اطلق یراد بہ الفرد الکامل (لفظ مطلق سے فرد کامل ہی مراد ہوا کرتا ہے) اور عجب نہین کہ امام صاحب کی مراد بھی یہی ہو کیونکہ ظاہر روایت مین یہ قول بہت مجمل ہے کتب فتاویٰ مین جو اس کی تفصیل[۱] مذکور ہے امام ابو حنیفہ اور محمد کے کلام مین وہ تفصیل ابھی تک نہین ملی، اور اس صورت مین جواز عقد ربا سے آیت کے اطلاق یا عموم کی تقلید لازم نہین آتی، کیونکہ آیت مین حرمت ربا کی علت اوس کا ظلم ہونا مذکور ہے لا تظلمون ولا تظلمون اور یہ علت اسی وقت پائی جائے گی جب کہ عقد ربا معصوم الدم کے ساتھ کیا جائے، اور غیر معصوم الدم کا نہ مال معصوم ہے نہ جان کہ قہر و غضب سے بھی اس کا مال لینا جائز ہو تو وہان عقد ربا سے ظلم کا تحقق نہ ہوگا، مگر دوسرے ائمہ نے اس حالت مین بھی صورت عقد ربا کو اس لئے گوارا نہین کیا کہ ربا پر نص مین وعید شدید وارد ہے، تو گو اس حالت مین حقیقت ربا متحقق نہین، مگر جس چیز پر وعید شدید وارد ہے، اس کی صورت سے بھی بچنا چاہئے، لیکن جن حالات مین حربی معصوم الدم ہو اوس وقت اس کا مال اوس کی ملک ہے، ہمارے لئے بدون اوس کی رضا کے حلال نہیں اس وقت اس کو اس درجہ مین مباح کہنا کہ عقد ربا سے حقیقت ربا متحقق نہ ہو، بعید از قیاس ہے پس ہندوستانی مسلمانون کو کفار ہند کے ساتھ عقد ربا جائز نہ ہونا چاہئے، کہ آیت قرآنیہ کا اطلاق اسی کو مقتضی ہے"

غالباً ناظرین نے اس تفصیل سے سمجھ لیا ہوگا، کہ ہمارے مولانا گیلانی کا یہ ارشاد کہ "میرا مطلب یہ ہے کہ ہندوستان کی غیر مسلم رعایا کے اموال کی عدم اباحت کی دلیل پیش کرنا آسان نہین چہ جائیکہ ان کی حرمت کا دعویٰ، کس قدر حقیقت سے دور ہے، بلکہ برعکس واقعہ یہ ہے کہ نص قرآنی اور بخاری کی اوپر کی حدیث کو پیش نظر رکھتے ہوئے درجۂ شک مین بھی ان کی اباحت کی گنجایش نظر نہین آتی، چہ جائیکہ اباحت کا قطعی دعویٰ"

کیا ہمارے مولانا کو معلوم نہین کہ اس مسئلہ مین جملہ ائمہ نے امام ابو حنیفہ کی رائے سے اختلاف کیا ہے حتیٰ کہ ان کے سب سے بڑے شاگرد امام ابو یوسف بھی ان کے ساتھ نہین ہین، دوسرے ائمہ کے پاس نص قرآنی کا قطعی فیصلہ ہے جس کے مقابلہ مین امام ابو حنیفہ کے پاس بجز ایک ضعیف حدیث یا ضعیف قیاس کے کوئی بھی قوی دلیل نہین، اور اس حالت مین ہمارے لئے اتنا ہی بس ہے، کہ امام صاحب کے اوپر سے کسی طرح مخالفت نص قطعی کے الزام کو دفع کرکے ان کے دامن اجتہاد کو طعن وتشنیع سے بچالین نہ یہ کہ اتنی جرات سے کام لین کہ دوسرے ائمہ سے یہ مطالبہ کرین کہ قرآن وحدیث واجماع وقیاس

---

[۱] اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد رحمہا اللہ کی مراد وہی ہے جس کا فقہا نے اپنے فتاویٰ میں ذکر کیا ہے، تو اس سے زیادہ سے زیادہ اُس مال کی اباحت ثابت ہوگی جس کو مسلمان نے حربی کی رضامندی سے دار الحرب مین لیا، لیکن مال کی اباحت عقد کی اباحت کو مستلزم نہین ہو، مثلاً ایک شخص نے اس کا ثبوت دے دیا، کہ زید نے اپنی بیوی کو طلاق بائنہ دی، اور قاضی نے اس کے مطابق فیصلہ کردیا، لیکن ثبوت جھوٹا تھا، تو امام ابو حنیفہ کے نزدیک اس (جھوٹے) مدعی کے لئے اس عورت سے اس بنیاد پر شادی کرنا جائز ہے، کہ امام موصوف کے نزدیک معاملات کے انعقاد اور فسخ مین ظاہراً و باطناً دونون پہلوؤن سے قاضی کا فیصلہ نافذ ہوگا، باوجودیکہ یہ طریقہ بالاجماع حرام ہے،

غرض کسی شرعی دلیل سے الحربی کے اموال کی عدم اباحت کا ثبوت پیش کر سکتے ہوں، تو پیش کریں"

اس ناچیز نے اعلاء السنن میں امام صاحب کے اس قول کے متعدد دلائل بیان کر دیئے ہیں، مگر ان کا حاصل اتنا ہی ہے کہ امام صاحب کا یہ قول بے دلیل نہیں، اس لئے کسی کو ان پر طعن کا حق نہیں باقی، انصاف یہ ہے کہ دیگر ائمہ کا قول اس باب میں بہت قوی اور بڑا وزنی ہے، اس لئے ہم کو نصِ قرآنی پر نظر کر کے بے تکلف یہ کہنا چاہئے کہ اس باب میں مذہب حنفیہ وہی ہے جو امام ابو یوسف نے فرمایا ہے، کہ وہی ساری امت کا قول ہے، اور طرفین کا قول مذہب نہیں، بلکہ مذہب کی ایک ضعیف روایت ہے، بشرطیکہ اس کا مطلب وہی ہو جو کتب فتاوی میں بیان کیا جاتا ہے، اور ان کی مراد حربی سے غیر معصوم الدم ہے تو اس صورت میں دوسرے ائمہ کا اختلاف محض تورع پر مبنی ہے حقیقی اختلاف نہیں،

آخر میں مولانا گیلانی فرماتے ہیں:-

"افسوس کہ علماے اسلام نے اسلام کے اس قیمتی نقطۂ نظر پر ٹھنڈے دل سے غور نہیں کیا، ورنہ ادھر ڈیڑھ سو سال میں مسلمان جن معاشی دقتوں میں مبتلا ہو گئے، غالباً صورت حال یہ نہ ہوتی، ملک کے باشندوں کا ایک طبقہ صرف سود لیتا رہا اور دوسرا طبقہ صرف دیتا رہا، اس کی وجہ سے جو معاشی عدم توازن اس ملک میں پیدا ہو گیا ہے، اس کی ذمہ داری اسلام پر نہیں بلکہ زیادہ تر علما پر اس لئے ہے کہ ان کے معاشی نظام میں اس صورت کا علاج موجود تھا، لیکن انھوں نے ایک جزو پر عمل کیا، اور دوسرے کو ترک کر دیا"

گویا مولانا کے نزدیک معاشی توازن قائم رہنے کی صورت یہ تھی، کہ مسلمان کفار کو سود دیتے بھی، اور ان سے لیتے بھی، ذرا مجھے بتلایا جائے کہ دار الحرب میں مسلمانوں کا حربی کو سود دینا کس امام کے قول میں جائز ہے؟ اس کی اجازت تو امام ابو حنیفہ نے بھی نہیں دی، اور نہ علمائے ہندوستان میں سے کسی نے اس کو جائز کہا، علما ہمیشہ سودی قرضہ لینے کو حرام کہتے اور لوگوں کو اس لعنت سے بچنے کی تاکید کرتے رہے،

لعن اللہ آکل الربا وموکلہ وکاتبہ وشاھدہ، اللہ تعالیٰ نے سود لینے والے پر بھی لعنت کی ہے، اور دینے والے پر بھی، اس کے لکھنے والے پر بھی، اور گواہ پر بھی، اگر مسلمان ان کی نصیحت پر کان دھرتے، اور فضول خرچی اور عیاشی سے جو سودی قرضہ لینے پر مجبور کرتی ہے، دور رہتے تو یقیناً اس ملک میں معاشی توازن اس طرح قائم رہتا، کہ نہ مسلمان کسی کو سود دیتے نہ کوئی ان سے لیتا، نہ ان کی جائدادیں سودی قرضہ میں نیلام ہوتیں، نہ دوسری قوموں کے گھر گھی کے چراغ جلتے،

پھر مجھے بتلایا جائے کہ ہندوستان میں وہ کتنے مسلمان ہیں جنھوں نے علما کے فتوی کی وجہ سے سود لینا چھوڑا ہے جن کے پاس ضرورت سے زیادہ روپیہ ہے، وہ برابر اس کو سود پر چلا رہے ہیں، اور کافروں سے نہیں، بلکہ مسلمانوں سے سود لے رہے ہیں کیونکہ کافروں کو سودی قرضہ دینے والے ہندو مہاجن بہت ہیں، وہ مسلمانوں سے سودی قرضہ لینے کیوں آئیں گے؟ اور بہت سے مسلمان اپنا روپیہ بنک میں جمع کرتے ہیں، اور برابر بنک سے سود لیتے ہیں، مجھے بتلایا جائے کہ ایسے مسلمان کتنے ہیں جو علما کے فتوی کی وجہ سے بنک کا سود چھوڑ رہے ہیں،

مولانا جن جن لوگوں کے دلوں میں علمار کے فتوی کی کچھ وقعت ہے، وہ نہ تو کسی کو سود دیتے ہیں اور نہ کسی سے

لیتے ہین، اور وہ اس طرح معاشی توازن کو قائم کئے ہوئے ہین اور جو مسلمان دوسرون کو سود دے رہے ہین، وہ برابر اُن سے لے بھی رہے ہین، پھر بھی جو اس ملک مین معاشی توازن قائم نہین ہوتا، اوس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان فضول خرچیون سے باز نہین آتے، اور تجارت وصنعت وحرفت کو عار سمجھتے ہین، فضول خرچی نے جائدادین برباد کر دین تجارت وصنعت وحرفت کا ان مین حوصلہ نہیں، اور کسی مین ہے بھی تو اصول تجارت سے واقف نہین، الا نادرا و قلیل مّا ھُو، دوسری قومین تجارت وصنعت وحرفت کے میدان مین بڑھتی چلی جارہی ہین، اور مسلمان ملازمتون اور نوکریون کے پیچھے پڑے ہوئے ہین جس مین آمدنی محدود اور ان کے مصارف غیر محدود، پھر اس ملک مین توازن معاشی کیونکر قائم ہو سکتا ہے، پس علماء کو الزام دینا سراسر غلط ہے، کیونکہ جو علماء دار الحرب مین حربی سے معاملہ ربا کو ناجائز کہتے ہین، وہ اسی کو اسلامی حکم سمجھے ہوئے ہین اسلام صرف قول ابی حنیفہ کا نام نہین، بلکہ قرآن وحدیث کے احکام کا نام ہے، اگر قول ابی حنیفہ ان کے موافق ہو گا اسلام ہوگا، ورنہ امام کے قول کا کوئی محمل حسن تلاش کیا جائے گا[۱]، اور فتوی ائمہ حنفیہ کے اُس قول پر دیا جائے گا، جو قرآن وحدیث کے موافق ہو،

پس آپ ہندوستانی مسلمانون کو تجارت وصنعت وحرفت کی ترغیب دیجئے، فضول خرچی سے روکئے کہ ترقی اقتصادی کا صحیح راستہ یہی ہے، کافرون سے سود لینے مین کچھ ترقی نہین، کیونکہ کفار مسلمانون سے سودی قرضہ لینے کبھی نہ آئین گے، البتہ جو تاجر یا زمیندار گورنمنٹ کو ٹیکس یا لگان دے رہے ہین، اگر وہ ڈاکخانہ یا امپیریل بنک مین روپیہ جمع کرکے گورنمنٹ سے سود وصول کرین تو ان کو بقدر اپنے ادا کردہ ٹکس ولگان کے گورنمنٹ سے سود لینا جائز ہے، افتی بہ سیدی حکیم الامۃ قدس سرہ کیونکہ یہ سود لینا نہین بلکہ اپنے حق کو وصول کرنا ہے، وھو مسئلۃ الظفر بجنس حقہ فافھموا ولا تعجل واللہ تعالی اعلم واجل"

---

[۱] چنانچہ ہم نے قول امام کے دو محمل اوپر بتلا دیئے ہین، والحمد للہ علی ذلک فلیراجع۔

ارض القرآن جلد اول

جدید اڈیشن

عرب کا قدیم جغرافیہ، عاد وثمود، صبا، اصحاب الایکہ، اصحاب الحجر، اصحاب الفیل کی تاریخ اس طرح لکھی گئی ہے، کہ قرآن مجید کے بیان کردہ واقعات کی یونانی، رومی، اسرائیلی لٹریچر، اور موجودہ آثار قدیمہ کی تحقیقات سے تائید وتصدیق ثابت کی ہے، ضخامت ۴۳۲ صفحے قیمت ۳ر

ارض القرآن جلد دوم

قرآن مجید کے اندر جن قومون کا ذکر ہے ان مین سے مدین، اصحاب الایکہ، قوم ایوب، بنو اسمعیل، اصحاب الرس، اصحاب الحجر، بدار، انصار، اور قریش کی تاریخ، اور عرب کی تجارت، زبان اور مذہب پر تفصیلی مباحث، قیمت ۳ر ضخامت ۴۰۷ صفحے،

منیجر

عرفانیاتِ فانی

از

جناب مرزا احسان احمد صاحب بی اے ال ال بی

(۳)

جہان تک فانی کے فلسفیانہ خیالات کا تعلق ہے، ان مین بھی ہم کو کوئی خاص عمق یا ندرت و جدت محسوس نہین ہوتی، بلکہ وہ صرف قدیم تخیلات کی صدائے بازگشت ہین، جو صدیون سے پامال ہوتے چلے آرہے ہین، مثلاً

عالم جز اعتبار نہان و عیان نہ تھا — یعنی کہ تو عیان نہ ہوا اور نہان نہ تھا
مفہوم کائنات تمھارے سوا نہیں — تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہان نہ تھا
حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری — ہون تو مین شمع مگر بھیس ہے پروانے کا
ہر تجلی ہے اک نظام جمال — لاکھ عالم ہین ایک عالم کیا
نشان ہر ہے ہر ذرہ ظرف ہر نہین — خدا کہان نہ ملا، اور کہیں خدا نہ ملا

غور کرو ان اشعار مین جو خیالات ادا کئے گئے ہین، ان مین فانی نے کوئی ترقی یا اضافہ کیا ہے، یا کوئی ایسا خاص پہلو پیدا کیا ہے، جو اب تک اہل حقیقت کی نگاہون سے مخفی تھا، اکثر طرز ادا کی طرفگی فرسودہ خیالات مین بھی ایک خاص لطف پیدا کردیتی ہے، مین اس کو بھی غنیمت اور شاعرانہ کمال کی ایک بڑی دلیل سمجھتا ہون، لیکن اس حیثیت سے بھی ان اشعار مین کوئی ندرت نہین،

بعض لوگون کا خیال ہے کہ فانی کے کلام مین کچھ تصوف کا عنصر بھی نظر آتا ہے، ممکن ہے کہ انھون نے کچھ تصوف کے مسائل بیان کئے ہون لیکن تصوف کی روح ہم کو پورے مجموعۂ زیر تنقید مین کہین نظر نہیں آئی، کاش وہ اس جام لاہوتی کے لذت شناس ہوتے تو ان پر یاس و قنوط کی کیفیت طاری نہ رہتی، بلکہ اصغر کی طرح وہ جوش مستی مین تمام عرصۂ عالم پر چھا جاتے،

بنا کے شیشہ و ساغر ہجوم مستی مین — تمام عرصۂ عالم پہ چھا گیا ہون مین

فانی کے کلام کا ایک بڑا نقص یہ ہے کہ انھون نے تنوع مضامین کا بالکل لحاظ نہین رکھا، اور اپنی جبین نیاز صرف آستانۂ غم پر جھکا کر بیٹھ گئے، اور یہ نہ سمجھے کہ ایک ہی قسم کے خیالات کا اعادہ ہمیم ذوق شناس طبیعتون پر کس قدر گران گذرتا ہے، اور شاعر کے کلام کو کس حد تک بے کیف بنا دیتا ہے، جس طرح چمن کی رونق مختلف رنگ و بو کے پھولون سے ہوتی ہے، اسی طرح چمنستان تغزل کا سرمایۂ آرایش شاعر کے گوناگون جذبات و احساسات ہوتے ہین، افسوس ہے کہ فانی نے صرف داستان غم کو اپنا واحد موضوع شاعری قرار دے کر غزل کے دائرۂ سخن کو اس طرح محدود کردیا، کہ اس کی تمام رنگینی لطافت، اور دل آویزی کا خاتمہ ہوگیا، انھون نے زندگی کو صرف غم کی نگاہ سے دیکھا، اور اس طرح دیکھا کہ اس کے کسی گوشہ مین ان کو بجز یاس وحسرت و اندوہ کے امید و آرزو کی کوئی روشنی نظر نہین آئی، ان کے دل کی پژمردگی و افسردگی کا یہ عالم تھا کہ وہ برق و باران کے دلفریب منظر

سے بھی کوئی لطف نہین اٹھا سکتے تھے، اور ان کے نزدیک اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے،

"اک بے قرار تڑپا، اک دلفگار رو دیا"

لیکن یہی سمان جب ایک صاحب ذوق کی نگاہ سے گذرتا ہے تو وہ جوش نشاط مین بے اختیار پکار اٹھتا ہو :-

خم گردون سے موج مے اٹھی ہے کس قیامت کی (اصغر)

اب تک جو کچھ کہا گیا، اس سے مقصود یہ دکھانا تھا، کہ فانی نے معنوی لحاظ سے اردو تغزل کے قالب حیات مین کوئی جدید روح نہین پھونکی، اب دیکھنا یہ ہے کہ انداز بیان کی حیثیت سے غزل پر ان کے کیا احسانات ہین؟

تاثیر شعر کی جان ہے، اس کے لئے حسن خیال کے علاوہ حُسن بیان نہایت ضروری چیز ہے، اکثر بلند اور لطیف خیالات صرف اس لئے غارت ہوجاتے ہین، کہ شاعر اپنی طرز ادا مین کوئی خاص ندرت اور طرفگی پیدا نہیں کرسکا، اس بنا پر جو شعرا نکتہ رس اور بلاغت شناس ہوتے ہین، وہ لطافت خیال کے ساتھ ساتھ انداز بیان کی خوبی اور دلکشی کا خاص لحاظ رکھتے ہین، اور ہمیشہ اس کوشش مین رہتے ہین، کہ معمولی خیال بھی ایسے اچھوتے طریقہ سے ادا کیا جائے، کہ سننے والا وجد کرنے لگے، اس کے لئے غیر معمولی قدرتِ زبان درکار ہے، خواجہ حافظ کو دیکھو ایک معمولی سی بات کو لیتے ہین، اور اپنے حسن بیان سے معجزہ بنا دیتے ہین، مثلاً یہ خیال کہ دنیا مین بجز نیکی کے اور کوئی چیز باقی رہنے والی نہین، ایک نہایت معمولی خیال ہے کہ لیکن اس کو اس دلکش پیرایہ مین ادا کرتے ہین،

برین رواق زبرجد نوشتہ اند بزر کہ جز نکوئی اہل کرم نخواہد ماند

مولانا روم کی نکتہ سنجی اور دقیقہ رسی سے کس کو انکار ہوسکتا ہے؟ لیکن اگر ان کو خواجہ حافظ کی قدرت زبان ملی ہوتی تو تم اندازہ کرسکتے ہو کہ ان کے کلام کا حسن کہان سے کہان پہونچا ہوتا!

غرض شاعر کو یہ نہ بھولنا چاہئے کہ وہ شاعر ہے، ناصح یا واعظ نہین، خواہ وہ فلسفہ لکھے، یا علمی و اخلاقی نکتے بیان کرے خواہ اسرار محبت کی گرہ کشائی کرے، یا مناظر قدرت کی تصویر کھینچے، ہر موقع پر اس کا انداز بیان شاعرانہ رہنا چاہئے، ورنہ اس کی تمام جدت طرازیان برباد ہوجائین گی، اور سننے والے پر کوئی اثر نہ ہوگا، خواجہ حافظ کا کمال یہی ہے، کہ وہ ہر قسم کے علمی، اخلاقی، فلسفیانہ مضامین ادا کرتے ہین، لیکن انداز بیان کی شاعرانہ رنگینی اور لطافت مین فرق نہین آنے پاتا،

افسوس ہو کہ فانی نے پیرایۂ بیان کی جدت اور دلآویزی کا لحاظ بھی کم رکھا ہے جس کی وجہ سے ان کے اکثر عمدہ خیالات بھی بے مزہ ہو گئے ہین، اس کا اندازہ مثالون سے ہوسکتا ہے،

اک حق کے سوا کوئی ہستی ہی نہ تھی یارب یون میرے سر آنکھون پر تمیز حق و باطل

کہنا یہ ہے کہ بجز حق کے اور کسی شے کا وجود نہین ہے، دنیا مین جو کچھ ہے سب کچھ حق ہے، باطل کی کوئی حقیقت نہین، خیال کی خوبی سے انکار نہین، لیکن غور کرو، طرز ادا کس قدر خشک اور پھیکا ہے، خصوصاً ثانی مصرعہ کی تعقلات اور گرانی قابل لحاظ ہے، جس نے انداز بیان کو بہت کچھ صدمہ پہنچایا ہے، علاوہ اس کے فانی کے شعر سے اس کا پتہ نہین چلتا کہ آخر باطل کا وجود کیون نہین ہے؟ اور ہر چیز حق کیون نظر آرہی ہے؟ اس کا سبب محض طرز ادا کا نقص ہے، وہ شعر مین کوئی ایسا لفظ نہ رکھ سکے جو اس نقص کو رفع کردیتا، دیکھو اقبال سہیل اس مشکل کو کتنے آسان طریقہ سے حل کردیتے ہین،

چھایا ہوا ہے دیدۂ و دل پر جمال حق باطل بھی اب نگاہ مین باطل نہین رہا

یہ صرف قدرت زبان اور طرز ادا کی خوبی کا فیض ہے، کہ اس شعر مین ایک عمدہ دعوی اس قدر

عمدہ طریقہ پر ثابت کر دیا گیا ہے، کہ دل کو تسکین ہو جاتی ہے، اور سامع کے ذہن کو کوئی الجھن محسوس نہین ہوتی،

جبر و اختیار کے پامال موضوع پر فانی نے بہت زیادہ طبع آزمائی کی ہے، لیکن پیرایۂ بیان مین کوئی خاص ندرت یا طرفگی پیدا نہ کر سکے، چند اشعار ملاحظہ ہون،

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی — سانچے مین اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہین
زندگی جبر ہے، اور جبر کے آثار نہین — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہین
جسم آزادی مین پھونکی تونے مجبوری کی روح — خیر جو چاہا کیا، اب یہ بتا ہم کیا کرین
مختار ہون کہ معترف جبر دوست ہون — مجبور ہون کہ یہ بھی کوئی اختیار ہے
محشر مین جبر دوست سے طالب ہون داد کا — آیا ہون اختیار کی تہمت لئے ہوئے

اس قسم کے اور بھی اشعار ہین، جن کو ہم طوالت کے لحاظ سے قلم انداز کرتے ہین، فانی نے تقریباً ہر شعر مین جبر و اختیار کے الفاظ استعمال کئے ہین، حالانکہ ان کو سمجھنا چاہئے تھا، کہ علمی اصطلاحات کے علانیہ استعمال سے انداز بیان کی تاثیر بہت زیادہ گھٹ جاتی ہے، اور شعر مین شعریت باقی نہین رہتی، خواجہ حافظؔ بھی جبر کے قائل ہین، اور اس خیال کو مختلف طریقون سے ادا کیا ہے، مثلاً

در پس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند — آنچہ استاد ازل گفت ہمان می گویم
برق غیرت کہ چنین می جہد از پردۂ غیب — تو بفرما کہ من سوختہ خرمن چہ کنم

دیکھو حافظ نے جبر یا اختیار کا لفظ کہین استعمال نہین کیا ہے، بلکہ محض لطیف تشبیہات کے پردے مین اپنے مفہوم کی طرف اشارہ کر دیا ہے، اور یہی ان کے پیرایۂ بیان کے موثر ہونے کا راز ہے، نفس خیال مین کوئی خاص ندرت نہین، لیکن طرز ادا کی خوبی نے ان اشعار مین جو دلآویزی پیدا کر دی ہے، اس کو ہر صاحب ذوق بآسانی محسوس کر سکتا ہے،

اب ہم چند اشعار بلا کسی تشریح کے نقل کرتے ہین جن سے ناظرین کو اندازہ ہوگا، کہ فانی کا انداز بیان اکثر کس حد تک غیر شاعرانہ ہوتا ہے،

مین ہون اک مرکز ہنگامۂ ہوش رم ہوش — دل اگر عالم مستی ہو تو سر عالم ہوش
عدم ہوش پہ ہے، فطرت ہستی مائل — کس توقع پہ اٹھائے کوئی ناز غم ہوش
بیخودی مایۂ طوفان خودی ہے یعنی — محرم جلوۂ اسرار ہے نا محرم ہوش
مظہر ہستی و خلاق عدم ہے مری ذات — کچھ نہ تھا ورنہ بجز سلسلۂ برہم ہوش

ان اشعار کو پڑھو، ان مین کہین جذبات کی تپش یعنی شعریت کی روح نظر آتی ہے، یہ نہین معلوم ہوتا، کہ کوئی شاعر دل کی گہرائیون سے بول رہا ہے، بلکہ یہ صاف محسوس ہوتا ہے، کہ کوئی بزرگ پیرانہ سال مکتب مین بیٹھے ہوئے فلسفہ کا درس دے رہے ہین،

اب اسے دار پہ لیجا کے سلا دو ساقی — یون بہکنا نہین اچھا ترے مستانے کا

انداز بیان خصوصاً مصرعۂ اول جس قدر لطیف ہے، وہ محتاج اظہار نہین، لیکن افسوس ہے کہ شاعر کو اتنا بھی
[illegible]

کا، جس کو رندون کی فطری صلاحیت کا اندازہ نہ ہو، اور ان کو اتنا پلا دے کہ قابو سے باہر ہو جائین، اور سزائے دار دینے کی ضرورت پیش آئے،

ازل مین خلق ہوئی تھی جو بجلیون کی روح   تری نگاہ مری جان بے قرار ہوئی

خیال اچھا تھا، لیکن دیکھیے محض طرزِ ادا کی خامی کی وجہ سے بالکل برباد ہو گیا، پہلے مصرعہ کی سستی بندش اور گرانی الفاظ محتاج بیان نہین،

قدیم لکھنوی انداز بیان کی بھی جھلک اکثر فانی کے کلام مین نظر آتی ہے، مثلاً:-

بدلا ہوا ہے آج مرے آنسوؤن کا رنگ   کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا ادھڑ گیا
اللہ رے جوش بادِ بہاری ترا اثر   پیمانہ لڑکھڑا کے صراحی سے لڑ گیا
صیاد یون پرون مین گرہ باندھتے ہین کیا   بے دردِ بند بند کسی کا جکڑ گیا
میرے دل کو چین آ جانے کی ضامن موت ہے   تم کسی دن نبض دل پر ہاتھ رکھ کر دیکھنا
ہنسی آتی ہے تیری سادگی شوق پر فانی   وہ میت ہی پہ کب آئے جواب آئین گے مدفن پر
نگاہِ شوق کی رعنائیون کا کیا کہنا   مگر خدا کی قسم آپ کا جواب نہین
طوق منت کے بڑھا، ہو گئی منت پوری   بیڑیاں موت نے کاٹین ترے دیوانون کی
ساتھ جائے گا مری میت کے سامان خلش   دل مین رکھ چھوڑے ہین پیکان مین نے تیر کے
ہائے کیسی کشمکش ہے یاس بھی ہے آس بھی   دم نکل جانے کو ہے خط کا جواب آنے کو ہے
کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبور خاموشی کا ہائے   وہ جنازہ پر ترا کہنا خفا کیون ہو گئے
ابھری ہوئی ہے چوٹ دلِ دردمند کی   رکھنا قدم تصورِ جانان سنبھال کے
نگاہِ ناز کا صدقہ نیازمند ہین ہم   کبھی قبول ہمارا اسلام ہو جائے
سُنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے   کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ

ان اشعار کی پستی تخیل پر کسی تبصرہ کی ضرورت نہین، ان مثالون سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ فانی نے لطافتِ زبان اور حُسن اسلوب و جدت ادا کے لحاظ سے غزل کو کوئی خاص ترقی نہین دی،

فانی جیسا کہ ان کی فارسی غزلون سے اندازہ ہوتا ہے، ایک بڑی حد تک فارسیت کے ذوق سے آشنا تھے، اس مین شبہہ نہین، کہ فارسی ترکیبین انداز بیان کو موثر اور دلکش بنانے مین بہت زیادہ معین ہوتی ہین، بشرطیکہ وہ ثقیل و نامانوس نہ ہون، غزل مین اس کا خاص طور پر لحاظ رکھنا ضروری ہے، کیونکہ غزل مین جو جذبات ادا کئے جاتے ہین، ان کی نزاکت مقتضی ہے کہ جو زبان اختیار کی جائے، وہ لطیف، شیرین، شستہ اور ہر قسم کی گرانی اور ثقالت سے پاک ہو، لیکن فانی اکثر اس نکتہ کو بھول جاتے ہین، چند مثالین ملاحظہ ہون،

ہوش سے احتراز کر فاش نہ غم کا راز کر   دغدغۂ حساب کیون شکوۂ روزگار کیا
ہوش کا سرمایہ وحشت کے سوا کچھ بھی نہین   عالم اک مجموعۂ ذرّاتِ صحرا بیز ہے
دل لہو کر دے وہ ضبط رنج پنہان چاہئے   ہر لہو کی بوند لیکن رہنِ طوفان چاہیئے

کچھ شرح بیخودی ہے کچھ ہوش کا فسانہ یہ بے حسی جو شاید تنقید زندگی ہے
دل کی حد پہ خاک اڑانے چلا ہے عشق ذرے سے اکتساب بیابان کئے ہوئے

خط کشیدہ ترکیبوں پر غور کرو، غزل کی زبان کے لحاظ سے ان میں کہاں تک شیرینی اور لطافت ہے،
فانی نے اکثر ایسی ترکیبیں استعمال کی ہیں جن کا مفہوم غالبًا وہی خود سمجھ سکتے تھے، مثلاً محشر سکوت، گریۂ حیران سکوت برہم، عشرت تجلی وغیرہ،

اس میں شبہہ نہیں کہ فانی کی زبان میں ایک حد تک صفائی اور برجستگی ضرور ہے، لیکن حسن اسلوب اور جدت ادا کے لحاظ سے اکثر فروگذاشتیں محسوس ہوتی ہیں، جن کے متعلق ہم سطور مذکورۂ بالا میں اشارہ کر چکے ہیں،

اگرچہ ہمارے معیار تغزل پر فانی کا کلام پورا نہیں اترتا، تاہم اس کو خوبیوں سے بالکل معرا قرار دینا سخت ناانصافی ہوگی، فانی کو قدرت نے جو فلسفیانہ نظر اور شاعرانہ دماغ عطا کیا تھا، اس سے اردو تغزل کی تہذیب ترقی کی بہت کچھ بجا طور پر توقع ہو سکتی تھی، لیکن افسوس ہے کہ وہ گرد و پیش کے خارجی حالات کی ناخوشگواری سے اس درجہ متاثر اور افسردہ ہو گئے کہ ان کا دست طلب ساز محبت کے پردہ ہائے آتشیں کو چھیڑنے کی جرأت نہ کر سکا، تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا غمکدہ کبھی کبھی حسن تخیل کی شعاعوں سے بھی چمک اٹھتا ہے، اور ایسے اشعار بھی ان کے قلم سے بے ساختہ نکل جاتے ہیں جو عام غزل گو شعرا کی دسترس سے باہر ہیں، بطور نمونہ کے چند اشعار اہل ذوق کی ضیافت طبع کے لئے ہم نقل کرتے ہیں جن سے بخوبی اندازہ ہوگا، کہ فانی کی نگاہ یکسر عامیانہ نہ تھی۔

اٹھ اے نگاہ شوق اٹھ متاع جان لئے ہو وہ دامن نگاہ میں ہیں بجلیاں لئے ہوئے
ترے کرم سے کیا سماں ہے عالم گناہ کا سیاہیاں امید کی تجلیاں لئے ہوئے
کیفیت نگاہ سحر و آفریں نہ پوچھ شبنم کو جس نے بادۂ عرفان بنا دیا
ہر موج گل کو جلوہ گہ کیف صد بہار ہر بوئے گل کو میکدۂ جان بنا دیا
خود برق ہو اے طور تجلی سے گذر جا خود شعلہ بن اور وادی سینا سے گذر جا
سرکار محبت میں خبر بے ادبی ہے اے نشۂ دیوانگی ہوش اتر جا
اے جذب بیخودی ترے قربان جائیے پھرتا ہے دل میں کوئی مجھے ڈھونڈھتا ہوا
لطف حیات بے خلش مدعا کہاں یعنی بقدر تلخی صہبا سرور تھا
دل حاصل حیات ہے اور دل کا ماحصل وہ بے دلی کی جان تمنا کہیں جسے
کب تک رہیں ذوق تماشا ہو کوئی اب وہ نگاہ دے کہ تماشا کہیں جسے
گم ہیں رہ تسلیم میں طالب بھی طلب بھی سجدہ ہی در یار ہے سجدہ ہی جبین ہے
بہار نذر تغافل ہوئی خزاں ٹھہری خزاں شہید تبسم ہوئی بہار ہوئی
ہے یاد تری رونق خلوت گہ خاطر ہے ذکر ترا شمع شبستان تمنا
مری ہر معصیت ہے مطلع انوار صد رحمت گناہوں سے فضائے دل منور ہوتی جاتی ہے

اس شعر کی لطافت پر ذوق سلیم جس قدر وجد کرے کم ہے، دو ایک شعر اور ملاحظہ ہوں،

یا رب تری رحمت سے مایوس نہیں فانی لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہئے

تیرا کرم کہ تونے وہ دل کو عطا کیا — جو غم بقدرِ حوصلۂ آسمان نہین

اس کشتیِ ہستی کو توفان ہی مبارک تھا — گردابِ حوادث کے آغوش مین تھا ساحل

تلاش سے مجموعۂ زیرِ تنقید مین اس قسم کے بلند و پاکیزہ اشعار اور بھی مل سکتے ہین جنھین پڑھ کر ایک وجدانی کیفیت محسوس ہوتی ہے اور جن سے کسی حد تک فانی کی مذکورۂ بالا فروگذاشتون کی تلافی ہو جاتی ہے، لیکن ان کی تعداد بہت کم ہے، آخر مین مجھ کو اس کے اظہار مین تامل نہین کہ عام غزل گو شعراء مین فانی کا کلام ایک امتیازی حیثیت رکھتا ہے، اور اگر وہ لکھنویت کے برے اثرات سے پاک ہوتا، تو بلاشبہہ جدید غزل گو شعراء مین ان کا درجہ بلند ہوتا، فانی کی ہر فروگذاشت کو بآسانی نظر انداز کیا جا سکتا ہے، لیکن لکھنوی مذاقِ تغزل کا انھون نے جو نمونہ پیش کیا ہے وہ خود ان کے عارضِ سخن کے لئے ایک بدنما دھبہ ہے جس کو مذاقِ سلیم کسی طرح گوارا نہین کر سکتا، اس لئے مین نے اس حصہ پر کسی قدر سختی سے تنقید کی ہے تاکہ آیندہ غزل گو شعراء اس سے احتراز کرین تاہم حتی الوسع اس کی کوشش کی ہے کہ حق و انصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے، لیکن اگر قلم نے کہین نادانستہ بے راہ روی اختیار کی ہو تو مین اس کے لئے فانی مرحوم کی روح سے معذرت خواہ ہون،

آخر مین انجمن ترقی اردو سے ہماری درخواست ہے کہ وہ اصحابِ ذوق کے لئے فانی کے کلام کا ایک عمدہ انتخاب شائع کرے، جس سے ان کے کمالاتِ شاعری کا صحیح اندازہ ہو سکے، اس مجموعہ میں خزف ریزون کے ڈھیر مین ان کے جواہر پارے بھی چھپ کر رہ گئے ہین،

فقہی کتابین

تاریخ فقہ اسلامی

مصری عالم خضری کی تاریخ التشریع الاسلامی کا ترجمہ جس میں ہر دور کی فقہ اور فقہاء پر مکمل اور ایسا تبصرہ ہے، جس سے جدید فقہ کی ترتیب مین مدد مل سکتی ہے، حجم ۲۸۰ صفحے، قیمت عہ

القضاء فی الاسلام

اس میں طریقۂ شہادت اور انفصالِ مقدمات کے متعلق قرآن حدیث اور فقہ کی کتابون سے اخذ کر کے اسلامی اصول اور قوانین کی تشریح کی گئی ہے، اور قانون پیشہ حضرات کے لئے اس کا مطالعہ بے حد مفید ہے، ضخامت ۴۲ صفحے:- قیمت ۱۰ر

اسلامی قانون فوجداری

مولانا سلامت خان المعروف بہ حذاقت خان کی کتاب الاختیار کا ترجمہ جس مین تمام تعزیرات و جرائم کے متعلق پندرہ ابواب مین اسلامی قانونِ فوجداری کی تمام دفعات فقہ کی مستند کتابون کے حوالہ سے جمع کی گئی ہین، قانون پیشہ حضرات کے لئے اس کا مطالعہ نہایت مفید اور ضروری ہے،

ضخامت ۵۳ صفحے قیمت ۳ر

منیجر

رومہ کا ایک خط

"اٹلی کے پایہ تخت رومہ سے یہ ایک خط موصول ہوا ہے، چونکہ اس مین بعض امور عام ناظرین کی دلچسپی کے ہین، اس لئے ہدیۂ ناظرین کیا جاتا ہے" "م"

پیڈوا، رومہ، اٹلی

۴ دسمبر ۱۹۴۴ء

مکرمی جناب سید صاحب

السلام علیکم، آپ کو شاید یاد ہوگا کہ ۱۹۴۰ء کے شروع مین مین نے یہان سے آپ کو ایک خط لکھا تھا، مجھے آپ کا جواب بھی مل گیا تھا، اس مین آپ نے اس ملک مین مشرقی علوم کی ترقی اور نشو و نما کی بابت دریافت کیا تھا، آپ کا خط ملنے کے کچھ ہی دنون بعد جنگ شروع ہو گئی، اور پھر کوئی خط و کتابت کا سلسلہ نہ ہو سکا، جنگ کی یہ مدت خوش و ناخوش ہین گذری، آپ سمجھ سکتے ہین کہ جنگ کا زمانہ، ہندوستانی پروانۂ راہداری، خوراک کی قلت، پولیس کی جارحانہ تفتیش، اور نگرانی، غرض ان تمام وجوہ سے زندگی ایک عذاب بن گئی تھی، اس عذاب کے زمانہ مین بہرحال جو کچھ ممکن ہو سکا، مین نے خاصکر اسلامی علوم کی نشو و نما کی بابت کچھ مواد فراہم کیا، مگر وہ تمام جستہ جستہ یادداشت کی صورت مین ہے، اور پولیس کی نگرانی اور تفتیش کے خیال سے آج تک ایک لفظ نہین لکھا کہ مبادا کسی روز تمام سامان کی تلاشی ہو، اور یہ مضمون پاکر وہ سمجھے کہ مین کوئی روزنامچہ تیار کر رہا ہون اور پھر اسے لیجائے، یہان ذاتی روزنامچے پولیس کی تحقیقات کا ایک ضروری جزتھے، تفتیش کے دوران مین پولیس اس قسم کے کاغذات پر پہلے قبضہ کرتی تاکہ اس سے پتہ چلے کہ کن کن لوگون کے حالات اس مین درج ہین، اور لکھنے والے کے کیا خیالات ہین، مسولینی کی حکومت اتنی جابرانہ تھی، کہ لوگ جب صبح کو اٹھتے تھے، تو خوش ہوتے تھے، کہ ایک رات اور آزادی کی گذر گئی، پولیس ہمیشہ آدھی رات کو یا صبح ۴ بجے آتی، اور خانہ تلاشی اور گرفتاریان کرتی، سلطان عبدالحمید خان کا نام مفت بدنام ہے، مسولینی نے جس قسم کی جابرانہ حکومت کی ہے، اس کی اگر آپ تفصیل سنین تو یقیناً کہین گے، کہ مشرق کا کوئی شخص بھی شیطنت کی اس حد تک نہین جا سکتا، بیٹا باپ پر جاسوسی کرتا ہے، شوہر اور بیوی ایک دوسرے پر شبہ کرتے ہین، بھائی بھائی مین بگاڑ ہے، اور لطف یہ کہ سب کے سب مسولینی کے تنخواہ دار جاسوس ہین، یہ ہے اس چیز کا کرشمہ جس کو کہا جاتا ہے تہذیب!

مشرقی علوم سے آپ کا کیا مطلب تھا؟ مشرقی علوم مین تو سارے مشرق کے علوم آتے ہین، یعنی چینی، جاپانی، سنسکرت، عربی، فارسی، عبرانی زبانون کی تعلیم اور ان کی تاریخ پر تصنیفات، ان تمام علوم پر مواد فراہم کرنا میرے لئے بہت مشکل ہے، البتہ عربی فارسی کے متعلق مین نے کچھ مواد فراہم کیا ہے، اگر آپ کہین تو ان کو ایک مضمون کی شکل مین مرتب کر کے بھیجون، اس سلسلے مین مشرقی علوم خاص کر عربی زبان کی تحصیل کی ابتدا نہایت دلچسپ ہے، یورپ مین یہ پہلا ملک ہے، جہان عربی زبان کی تحصیل کا خیال پیدا ہوا، عام طور پر کتابون مین درج ہے، کہ پوپ نے اسلامی ممالک مین عیسائیت کی تبلیغ کے لئے عربی زبان کی تحصیل کو ضروری سمجھا، اور پادریون کے لئے مدرسے قائم کئے، یہ ایک حد تک صحیح ہے، مگر دو چیزین اور بھی ہین، جو میرے ذہن

مین آئی ہین، اور جن کے متعلق مین نے تھوڑی بہت تحقیقات بھی کی ہے، اول یہ عیسائی تبلیغ صلیبی جنگون کے بعد شروع ہوئی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ عیسائیت نے دراصل ہتھیار بدل دیئے، یعنی جب تلوار سے کام نہ چلا تو پھر قلم اور زبان کا ظاہرا پرامن طریقے پر استعمال ہونا شروع ہوا ۔۔۔۔۔۔ لیکن دوسری وجہ اور بھی دلچسپ ہے، یہ بات تو اب علمی دنیا مین رفتہ رفتہ آتی جاتی ہے، کہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ بڑی حد تک اسلام کی مرہون منت ہے، اور اسلام کا یہ فیض صقلیہ اور ہسپانیہ سے شروع ہوا، صقلیہ مین جب اسلامی علوم کا آفتاب طلوع تھا، تو اس کی کرنین اس ملک تک برابر پہنچتی تھیں، انھی کرنون نے دراصل ازمنۂ وسطی کی تاریکی کو صاف کیا، اس سے عیسائی دنیا کے عقائد مین ایک ہل چل پیدا ہوگئی، پیر کلیسا کے بجائے عقل اور درایت کی رہنمائی تسلیم کی جانے لگی، لوگون کو خیال پیدا ہوا، کہ یہ سارا کرشمہ عربی علوم کا ہے، اس لئے عقل و درایت کے مخالفین نے اس طوفان کو روکنے کے لئے اصل عربی ماخذ کی طرف توجہ کرنی شروع کی تاکہ عقل کے حامیون کا جواب خود عربی مصنفین کی تصنیفون سے دیا جاسکے، یہین سے دراصل عربی علوم کی ابتدا ہوتی ہے، لیکن اس کا اب کوئی ذکر نہین کرتا، کیونکہ مسلمانان درگور، اور مسلمانی درکتاب نے خیالات کی رو کو علم سے ہٹا کر استعماری سیاست کے میدان مین ڈالدیا ہے ہمارے شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

دنیا مین فقط مردان حُر کی آنکھ ہے بینا

اس سلسلہ مین پرنس کاستانی کے کتب خانے مین ایک کتاب دیکھنے کا اتفاق ہوا، یہ تین جلدون مین ہے، اور لاطینی زبان مین ہے، اس کا سنہ اشاعت غالباً ۱۶۵۵ء ہے، مصنف اس کا سوئستان کا باشندہ تھا، اس کتاب مین اس نے بتایا ہے کہ طامس اکوناس کے فلسفے پر بہت گہرا اسلامی اثر پڑا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اہل کلیسا آج تک اس مصنف کے خلاف مضامین لکھتے ہین، اور اس کی غلطی فاش کرتے ہین، یہان ایک بات ضروری کہنی ہے، آپ کا ادارہ اسلامی تاریخ کے گم شدہ اور بھولے ہوئے اوراق کو جمع کرنے اور یاد دلانے کی کوشش کرتا ہے، اس سلسلے مین غیر زبانون کا علم بے حد ضروری ہے، غیر زبانیں اگر آج ہمارے ملک مین کم رائج ہین، لیکن کل ضرور ان کا علم زیادہ ہوگا، لیکن اس سلسلہ مین سب سے پہلے غیر زبانون کی کتابون کی فراہمی ضروری ہے، ہمارے کتب خانے غیر زبان کی کتابون سے بالکل خالی ہین، یہان اس ہنگامۂ دار وگیر مین صقلیہ اور ہسپانیہ کی اسلامی تاریخ کی بابت بہت سے پرانے نسخے بازار مین آئے ہین، یہ اطالوی، فرانسیسی اور ہسپانوی زبان مین ہین، یہ خیال کرکے کہ آپ کا ادارہ ان سے دلچسپی لیتا ہے، یہ خط آپ کو لکھ رہا ہون، دو تین کتابون کے نام لکھتا ہون، اول صقلیہ مین اسلامی دور کی تاریخ، یہ اطالوی زبان مین تین جلدون مین ہے، پہلا اڈیشن اس کا ۱۸۷۲ء مین شائع ہوا، اور دوسرا ۱۹۳۳ء مین، قیمت کوئی پانچسو لیرا کے قریب، اسی مصنف زمیکیل اماری) کے قلم سے صقلیہ مین فریڈرک دوم کے حالات پر دوسری تصنیف بھی ہے ۱۸۵۶ء قیمت کوئی دوسو لیرے، سوم صقلیہ پر اجانب کی حکومت ۱۸۵۸ء قیمت کوئی ۱۵۰ لیرے،

پھر ہسپانوی تاریخ پر کئی کتابین ہسپانوی زبان مین ملتی ہین، اس سلسلے مین ایک چیز اور آپ کو سناؤن ہسپانوی اکادیمی کے صدر کے قلم سے ۱۹۳۵ء مین ایک طویل مقالہ ہسپانوی شاعری پر شائع ہوا، اس مین انھون نے بتایا ہے کہ جدید ہسپانوی شاعری، اور اس کے ذریعہ سے جدید یورپ کی شاعری بڑی حد تک عربی شاعری کی ممنون احسان ہے، یہ کوئی ۵۰ صفحے کا مضمون ہے، اس مین انھون نے اسلامی دور کی ہسپانوی شاعری پر ایک نہایت فاضلانہ تبصرہ کیا ہے،

پھر لفظی، صوری، اور معنوی لحاظ سے یورپ کی شاعری پر اس کے درجہ بدرجہ اثرات کو ظاہر کیا ہے، اگر موقع ملا، تو اس مضمون کا ترجمہ کرون گا، ورنہ پھر کسی آیندہ فرصت پر اٹھا رکھون گا،

ہان تو اگر آپ مندرجۂ بالا یا اس قسم کی دوسری کتابون کو دار المصنفین کے لئے حاصل کرنا چاہتے ہین تو اس کی صورت یہ ہوسکتی ہے کہ آپ عبد الرحمن صدیقی، ایم اے، اڈیٹر مارننگ نیوز، کلکتہ کو لکھین، براہ راست ہندستان سے کسی قسم کی کوئی رقم یہان نہین آسکتی، البتہ لندن سے یہ رقم یہان آسکتی ہے، لیرا اور پونڈ کے درمیان جو نرخ تبادلہ مقرر ہوا ہے اس کی شرح ۱ پونڈ = ۸۰ لیرا ہے، عبد الرحمن صاحب اپنے لندن کے دفتر کے ذریعہ یا لندن مین اور کسی کے ذریعہ سے یہ رقم یہان بھیج سکتے ہین، پھر جون ہی آمد و رفت کا سلسلہ جاری ہوگا، یہ کتابین آپ تک پہنچ جائین گی، میرے متعلق اگر آپ اور کوئی معلومات چاہتے ہون، تو وہ رحمن صاحب سے مل سکتی ہین،

آپ کو شاید یاد ہو کہ مین نے کایتانی کی تاریخ اسلام کے اردو ترجمہ کرنے کا ذکر کیا تھا، مگر آپ نے اس کے نفس مضمون کے متعلق کچھ شبہہ ظاہر کیا تھا، مین نے بعد کو جو اس کی اور دوسری تصنیفین دیکھین تو مجھے آپ کی راے یاد آئی، اور مجھے اس سے پورا اتفاق ہے، در اصل کایتانی کے اسلام کے متعلق صحیح خیالات اس کی تاریخ اسلام مین نہین ملتے، مگر اس کی دوسری چھوٹی تصنیفون مین ملتے ہین، اور ان تصنیفون کا بہت کم لوگون کو علم ہے، ان تصنیفون مین تو وہ بعض جگہ ازمنۂ وسطیٰ کے پادریون سے بھی دو قدم آگے بڑھ جاتا ہے، اور وہ رویہ اختیار کرتا ہے، جو صلیبی جنگون کے جنون کو یاد دلاتا ہے، گو اس پر علم کا پردہ ڈالا گیا ہے جس پر معلومات اور غیر جانبداری کی خوب مینا کاری بھی کی گئی ہے، لیکن اس کا کتب خانہ بلاشبہ ایک عجیب چیز ہے، ۱۹۲۵ء مین اوس نے اپنا کتب خانہ یہان کے ایک بڑے کتب خانہ کو دے دیا، پندرہ برس یہ تمام کتابین کس مپرسی کے عالم مین پڑی رہین، جنگ کے زمانے مین جب یہان کے لوگون کو مصر، شام فلسطین پر قبضہ کرنے کا شوق چرایا، تو معلومات کی ضرورت ہوئی، اور پھر اس کتب خانے کو مرتب کرنے کی فکر ہوئی، گو کام پہلے شروع ہوگیا تھا، مگر پوری ترتیب ۱۹۴۰ء اور ۱۹۴۱ء مین ہوئی، اور مئی ۱۹۴۱ء مین اس کا باقاعدہ افتتاح ہوا، اس کتب خانے مین اسلامی تاریخ کی بابت فرانسیسی، جرمن، انگریزی، عربی، اور ایک حد تک روسی مین جو کچھ لکھا گیا ہے، اس کا ایک بڑا حصہ موجود ہے، پھر انیسوین صدی مین جو چھوٹے چھوٹے رسالے مختلف ملکون مین شائع ہوتے اور جو بعض معلومات کے لحاظ سے بہت قابل قدر ہین، وہ بھی یہان ملتے ہین، اس کے قلمی نسخون کی ایک فہرست بھی شائع ہو چکی ہے، اگر آپ کو کسی معلومات کی یا کسی کتاب سے کچھ حصہ نقل کرنے کی ضرورت ہو، تو براے مہربانی ضرور لکھئے،

آپ کی نظر سے ابن جبیر کا سفرنامہ ضرور گذرا ہوگا، اس کا عربی ایڈیشن لیڈن سے مدت ہوئی، پروفیسر دی گوئے (DE. GOEJE) نے تصحیح کے بعد شائع کیا، پھر ۱۹۰۶ء مین اس کا ایک اطالوی ترجمہ یہان سے شائع ہوا، یہ ترجمہ میری نظر سے گذرا، میرے خیال مین یہ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا اردو ترجمہ ہو،[1] بس تو آپ کے سامنے یہ تجویز پیش کرون گا کہ عربی سیاحون کے جتنے سفرنامے ہین، ان کا اردو ترجمہ شائع ہونا چاہئے، یہ معلوم کرکے افسوس ہوتا ہے، کہ یورپ کی زبانون مین ان کے ترجمے چھپتے ہین، جہان ان کے پڑھنے والے تھوڑے لوگ ہین، مگر خود ہماری

---

[1] معارف:- اس کا اردو ترجمہ رامپور سے شائع ہوچکا ہے،

زبان میں اس کے ترجمے موجود نہیں ہیں، حالانکہ ہماری تاریخ اور ثقافت کے لئے یہ سفرنامے کتنے ضروری ہیں،

حال میں یہاں عمر خیام کی رباعیات کا ایک ترجمہ شائع ہوا ہے، شروع میں ایک تنقیدی دیباچہ بھی ہے، اس دیباچہ میں وہی حالات درج ہیں جو تذکرۂ دولت شاہ اور دوسرے مغربی مصنفین کی تصنیفوں میں ملتے ہیں، مگر اس کی شاعری کو پرکھنے اور اس پر صحیح تنقیدی نظر ڈالنے کے لئے ایک ایسی لسانی تیاری کی ضرورت تھی جو لغات کی ورق گردانی سے بالاتر ہو یعنی اس تمدن کی رگ رگ میں سرایت کرنے اور اسی فضا میں سانس لینے کی ضرورت تھی، اور یہ چیز اس براعظم کے باشندوں کے لئے آسانی سے ممکن نہیں اس لحاظ سے مجھے اجازت دیجئے، اگر میں آپ کی تصنیف عمر خیام کا ذکر کروں، جو یہاں کی اس قسم کی تمام تصنیفوں سے کہیں بلند ہے، میں نے جب اس کا مترجم سے ذکر کیا، تو انھوں نے آپ کی تصنیف دیکھنے کا بہت شوق ظاہر کیا، گو اردو سے اپنی لاعلمی پر افسوس بھی کیا، پروفیسر براؤن نے اپنی تاریخ ادبیات ایران کی چوتھی جلد میں شعر العجم کا ذکر جس پیرایہ میں کیا ہے، اس سے اردو کا شوق بعض لوگوں میں بڑھ گیا ہے لیکن اردو کے شائقین میں ایک بڑا حصہ ایسا ہے، جو اردو کی تحصیل کو محض استعماریت کے آلے کے طور پر استعمال کرنا چاہتا ہے کیونکہ بغیر اس آلے کے اس جماعت کے خیال کو نہیں سمجھا جا سکتا، جو یہ زبان بولتی اور لکھتی ہے،

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے،

اگر آپ ہوائی ڈاک سے جواب دیں گے تو مجھے جلد مل جائے گا، گو میں ہوائی ڈاک سے خط نہیں بھیج سکتا کیونکہ غیر فوجی اشخاص کو ہوائی ڈاک استعمال کرنے کی اجازت نہیں ہے،

خاکسار

ریاض الحسن

مکاتیب شبلی

حصہ اول و دوم

مولانا مرحوم کے دوستوں، عزیزوں، شاگردوں کے نام خطوط کا مجموعہ جس میں مولانا کے قومی خیالات اور علمی تعلیمی اور ادبی نکات ہیں، درحقیقت مسلمانوں کی تیس برس کی تاریخ ہے،

قیمت :- جلد اول ۱۲/، جلد دوم ۱۲/، مکمل سٹ ۱/

کلیات اردو

مولانا کی تمام اردو نظموں کا مجموعہ جس میں مثنوی صبح امید، قصائد جو مختلف مجلسوں میں پڑھے گئے، اور وہ تمام اخلاقی سیاسی مذہبی اور تاریخی نظمیں جو کانپور، ٹرکی، طرابلس، بلقان، مسلم لیگ، مسلم یونیورسٹی وغیرہ کے متعلق لکھی گئی ہیں، یہ نظمیں درحقیقت مسلمانوں کی چہل سالہ جد وجہد کی ایک مکمل تاریخ ہے، قیمت :- ۱۲/

منیجر

بابُ التقریظ والانتقاد

ادب اور زندگی

از جناب مجنون گورکھپوری تقطیع چھوٹی ضخامت ۱۶۰ صفحے کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد عارؔ پتہ کتابخانہ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

یہ کتاب نئے ترقی پسند ادب، پرانے اردو ادب اور ادب کے بعض دوسرے پہلوؤن پر مصنف کی چند تنقیدی تقریرون اور مضامین کا مجموعہ ہے، ادب وزندگی، مبادیاتِ تنقید، زندگی اور ادب کا بحرانی دور، ادب اور ترقی، ہندوستانی ناٹک نظیر اکبرآبادی حالی کا مرتبہ اردو ادب مین نیا ادب کیا ہے، اردو افسانے مین جدید میلانات ان مضامین مین ترقی پسند ادب کے نقطۂ نظر سے پرانے ادب پر تنقیدی نگاہ ڈالی گئی ہے، اور نئے ادب کی حقیقت اور اس کی ضرورت واہمیت ظاہر کی گئی ہے، نیا اور ترقی پسند ادب نئی اصطلاح ضرور ہے لیکن نئی چیز نہین ہے، بلکہ وہ اپنے ماقبل کے مقابلہ مین نئے زمانہ کے مذاق ورجحان کا فطری نتیجہ ہے ہر دور کے ادب کو اس مرحلہ سے گذرنا پڑتا ہے، صرف زمانہ کے مذاق ورجحان کا فرق ہے، اردو زبان کا موجودہ دور بھی اس سے مستثنیٰ نہین وجہی کی سب رس سے لیکر مصنف کی اس تالیف تک ہر زمانہ مین اُس کے رجحان ومذاق کے مطابق پرانا ادب بدلتا اور نیا اور ترقی پسند ادب پیدا ہوتا رہا، غالب ورسرسید کے عہد سے یعنی جب سے اردو مین خیالی افسانہ طرازی کے بجائے واقعیت وسنجیدگی پیدا ہوئی، خیالات ورجحانات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ اردو ادب ترقی کے کتنے مدارج طے کر چکا ہے، سرسید کے زمانہ مین اصلاح معاشرت تعلیم جدید مغربی علوم وفنون اور مغربی خیالات کا زور تھا، اس لئے اس زمانہ کا ادب بھی اسی کا ترجمان ہے، شعروشاعری مین ترقی پسند خیالات کا نمونہ مولانا حالی کا مسدس اور مقدمۂ شعروشاعری ہے، اس کے بعد آزادی سیاست کا دور شروع ہوا، اس مین جس قدر ترقی ہوتی گئی اسی تناسب سے ادب پر سیاست کا رنگ چڑھتا گیا، اب اشتراکیت اور اقتصادیات کا زمانہ ہے اسلئے اس کے اثرات ونتائج بھی فطری ہین، اسلئے ترقی پسند ادب کوئی نئی چیز نہے، اور نہ اس کا موجودہ معیار آخری معیار ہے، آج کا ترقی پسند ادب پچاس سال کے بعد افسانۂ پارینہ اور قدامت کی دستاویز بن جائے گا، اس لئے قدیم ادب کے شیدائیون اور نئے ادب کے پجاریون مین نفس ترقی پسندی مین نہین بلکہ ترقی پسندی کی تعبیر اور اس کی بے اعتدالی اور انتہا پسندی مین اختلاف ہے،

ترقی پسند ادیبون کا یہ کہنا کہ ہمارا پرانا ادب عوام اور نیچے طبقون کی زندگی سے الگ ہے، بڑی حد تک صحیح ہے لیکن یہ پرانے ادب اور پرانے ادیبون کا نقص نہین بلکہ ہندوستان کی جہالت کا نتیجہ ہے، ضرورت ادب پیدا کرتی ہے، ادب ضرورت نہین پیدا کرتا، ایسے جاہل عوام کے لئے جن مین ادب سے فائدہ اٹھانے ہی کی صلاحیت نہ تھی، ادب پیدا کس طرح ہوسکتا تھا جس قسم کے ادب افسانون کا ذوق اس زمانہ کے عوام مین تھا، اور جس حد تک اس سے فائدہ اٹھانے کی ان مین صلاحیت تھی، اس قسم کا موجود تھا؛ اور آج بھی ہو سنسکرت ہندی اور فارسی کے بہت سے عام پسند قصون اور حکایتون کے ترجمے بلکہ ہندی آمیز اردو کے لئے کہانیون کی کتابین ہر زمانہ مین موجود تھین، جن سے عوام لطف اندوز ہوتے تھے یہ صحیح ہے کہ اس مین دیہاتی زندگی کی مصوری

مزدوروں اور کسانوں کی اصلاح و ترقی کی تعلیم، اور خالص دیہاتی مذاق کی چیزیں نہ تھیں لیکن ہندوستان کے موجودہ حالات میں ترقی پسند ادب کی اصلی غرض و غایت کے اعتبار سے موجودہ ترقی پسند ادب اور پرانے قصے کہانیاں دونوں جاہل عوام کے لئے برابر ہیں، بلکہ پرانے قصص و افسانے تو ان کی مجلسوں کو گرم بھی کرتے تھے، اور کم از کم ان کے لئے تفریح طبع کا سامان بہم پہنچاتے تھے، اور موجودہ ترقی پسند ادب سے استفادہ کا سوال تو الگ ہے ان کے کانوں تک اس کا پہنچنا بھی مشکل ہے اور وہ محض خواندہ طبقہ کی تفریح ذہنی کا ذریعہ ہے ترقی پسند ادیبوں نے جو لٹریچر پیدا کیا ہے، اس سے کتنے غریب جاہل دیہاتی فائدہ اٹھا سکے ہیں، اور ان کی زندگی کہاں تک سنور سکی ہے محض کاغذ کے صفحات پر فلسفہ بیان کر دینے سے تو کچھ حاصل ہوتا نہیں، جب تک عوام جاہل ہیں ان کے لئے لیلیٰ کا پرانا افسانہ اور مجنوں کی یہ نئی "ڈائری" دونوں برابر ہیں، درحقیقت سیاست کے ساتھ ادب میں بھی وہی اندھی ذہنی غلامی کارفرما ہے سارے ترقی پسند ادیب سوویٹ لٹریچر کی تو نقالی کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے، کہ روس اور ہندوستان کے حالات میں فرق کتنا ہے وہاں انقلاب روس سے پہلے بھی عوامی ادب سے فائدہ اٹھانے والا خاصہ طبقہ موجود تھا، اور انقلاب کے بعد تو قریب قریب ہر شخص تعلیم یافتہ یا کم از کم خواندہ ہو گیا، اس کے مقابلہ میں ہندوستان کی حالت کو دیکھئے پھر دونوں کے سیاسی حالات میں بڑا فرق ہے، غرض یہ ہے کہ محض کاغذی گھوڑے دوڑانے سے عوام کو کوئی فائدہ نہیں پہونچ سکتا، ضرورت اس کی ہے کہ پہلے ان کو نئے ادب سے فائدہ اٹھانے کے لائق بنایا جائے،

ترقی پسند ادیبوں کا سب سے بڑا عیب ان کی انتہا پسندی اور بے اعتدالی ہے، انھوں نے ترقی پسند ادب کو خاص طرز کے افسانوں اور نظموں میں محدود کر دیا ہے، اور مذہب و اخلاق کے استہزار و استخفاف اور فحاشی اور عریاں نگاری کو نئے ادب کا ضروری جزو بنا لیا ہے جس سے نہ صرف اردو زبان بلکہ خود ترقی پسند ادب کی مقبولیت کو نقصان پہنچ رہا ہے، اور سنجیدہ طبقہ کو خواہ وہ قدیم تعلیم یافتہ ہو یا جدید اس سے کراہت پیدا ہوتی ہے، کوئی زبان محض انقلابی افسانوں اور نظموں پر زندہ نہیں رہ سکتی، دین و مذہب کی تحقیر ترقی پسند ادب کا ایسا ضروری جزو بن گئی ہے، کہ لائق مصنف بھی جن کا شمار سنجیدہ اور خوش مذاق ترقی پسند ادیبوں میں ہے، اس کے خرافات سے اپنا دامن نہ بچا سکے، اور ان کے قلم سے ایسی لغو اور غلط باتیں نکل گئیں جس کی توقع کسی پڑھے لکھے آدمی سے نہیں کی جا سکتی، مثلاً انھوں نے سامنتی دور کی کتابوں کو دو قسموں میں تقسیم کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں "ایک وہ ہیں جن میں ترک دنیا اور درویشی کی تعلیم دی گئی ہے، دوسری وہ ہیں جن میں یا مجادلہ و یا مقاتلہ اور کشت و خون کی ترغیب دی گئی ہے، یا عیش و امارت و فرصت و فراغت کی زندگی کی تخئیل ہے: (صٹ) اس میں انھوں نے گلستان سعدی ...... کو بھی شامل کیا ہے، یہ تو بدگمانی نہیں کی جا سکتی، کہ مصنف کی نظر سے یہ کتاب نہیں گذری یا وہ اس سے واقف نہیں لیکن اس کا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انتہا پسندی اور غلط روی انسان کو کہاں تک پہنچا سکتی ہے گلستان کے متعلق یہ ایسا انکشاف ہے جس کی جانب آج تک کسی کا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ "نعوذ باللہ کلام مجید اور انجیل ادبی اختراعات اور معقول و مدلل ادبی خرافات ہیں" اور اس کے مقابلہ میں مہابھارت اور رامائن کو اپنے زمانہ کی غیر فانی یادگار قرار دیا گیا ہے، خوب ع:-

یا ترقی آنچنان یا تنزل اینچنین

خدا کے کلام کے مقابلہ میں یہ آزادی اور انسانوں کے مواخذہ کا یہ خوف بیشک ایک انقلابی کی یہی شان ہونی چاہئے اور دانشمندی کا تقاضا بھی یہی تھا،

اوراق گل مرتبہ جناب ضمیر احمد صاحب ہاشمی ڈپٹی ریونیو منسٹر ریاست رام پور تقطیع بڑی ضخامت ۳۵۲ صفحے، کاغذ نفیس کتابت وطباعت دیدہ زیب قیمت مرقوم نہیں، غالباً کتب خانہ یا بزم سخن رامپور سے ملے گی،

اردو شاعری اور اساتذہ سخن کی قدردانی اور سرپرستی ریاست رامپور کی دیرینہ روایت ہے، دلی اور لکھنؤ کی محفل اجڑنے کے بعد یہاں کے گم کردہ آشیان نو اسیخوں کو ریاست رامپور ہی کے سایہ عاطفت میں پناہ ملی تھی، اور رامپور اردو شاعری کا تیسرا مرکز بن گیا تھا، اب بھی وہاں شعر و سخن کا مذاق موجود اور بزم سخن کے نام سے ایک مجلس قائم ہے، جو وقتاً فوقتاً ہندوستان کے مشہور اور نامور شعراء کو مدعو کرتی رہتی ہے، اس لطف میں دوسروں کو شریک کرنے کے لئے مجلس مذکور کی جانب سے اس کے مدعو کردہ انتیس مشہور شعراء کا یہ دلچسپ تذکرہ شائع ہوا ہے، اس میں ان شعراء کے مختصر حالات، فوٹو، قلمی عکسی تحریریں، کلام کا انتخاب اور اردو زبان و شاعری کی اصلاح و ترقی کے متعلق چند استفسارات کے جوابات ہیں، اس جدت نے اس تذکرہ کو نہایت دلچسپ بنا دیا ہے، ظاہری نفاست بھی دلفریب ہے، کاغذ کے اس قحط کے زمانہ میں یہ اہتمام ایک ریاست ہی کر سکتی تھی، یہ تذکرہ ظاہری اور باطنی دونوں خوبیوں کے لحاظ سے اصحاب ذوق کے مطالعہ کے لائق ہے،

شمس بازغہ از جناب محمودہ رضویہ مدیرہ رسالہ شعاع تقطیع چھوٹی ضخامت ۹۰ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت اوسط قیمت مجلد عہ، پتہ:۔ مجلہ شعاع اردو و انجمن ترقی اردو کراچی،

اردو میں سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنا وافر اور مستند ذخیرہ فراہم ہو چکا ہے، کہ اس کی مدد سے بآسانی سیرت نبوی پر چھوٹے چھوٹے رسالے لکھے جا سکتے ہیں، مذکورہ بالا کتاب بھی اسی قسم کا رسالہ ہے، واقعات صحیح اور اسلوب تحریر مناسب ہے، البتہ کہیں کہیں مبالغہ کا رنگ آگیا ہے، اور ایک دو مقاموں پر واقعات کی ترتیب میں فرق ہے، غالباً اصل مقصود کو پیش نظر رکھا گیا ہے، اور ترتیب کا لحاظ عمداً نہیں کیا گیا ہے، یہ کتاب اس حیثیت سے لائق قدر ہے، کہ ایک خاتون کی تصنیف ہے لیکن سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم پر شمس بازغہ کی تمثیل ایک عورت کی شکل میں بہت نامناسب ہے، اس تصویر کے نیچے مصنفہ کا نام اور اشتباہ پیدا کرتا ہے، کہ وہ شمس بازغہ کی تمثیل ہے، یا مصنفہ کی قلمی تصویر، کتاب کے آخر میں یزید اور زینب کا واقعہ بالکل بے جوڑ ہے، اس کو سیرت نبوی سے کیا تعلق پھر اس قسم کے واقعات کے قبول کرنے میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے،

ہندوستان کی معاشی ترقی کا لائحہ عمل مترجمہ جناب سعید احمد صاحب مینائی بی اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۸۰ صفحے، کاغذ کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸؍ پتہ مکتبہ امداد باہمی طلبائے جامعہ عثمانیہ، انڈیا بک ہاؤس عابد روڈ حیدرآباد دکن،

کسی ملک کی معاشی ترقی کے مفہوم میں وہ ساری ضروریات و لوازم داخل ہیں، جو موجودہ زمانہ میں کسی ملک کی ترقی و آسودہ حالی کے لئے ضروری ہیں، اس لحاظ سے ہندوستان کی معاشی حالت بہت پست ہے، یہاں کے آٹھ معاشی اور کاروباری ماہرین نے ہندوستان کی آیندہ ابتدائی معاشی ترقی کی ضروریات اور اس کے مصارف کا ایک اجمالی خاکہ انگریزی زبان میں مرتب کیا تھا، لائق مترجم نے اردو میں اس کا ترجمہ کر دیا ہے، انگریزی میں تو اس قسم کی بہت سی کتابیں ہیں، لیکن اردو داں طبقہ کے معلومات کے لئے غالباً متفرق مضامین کے علاوہ کوئی مستقل کتاب نہ مل سکے گی، اور اس زمانہ میں اس قسم کے مسائل عام ہیں، اس لئے اس کتاب کا ترجمہ مفید ہے "م"

جلد ۵۵ ماہ جمادی الثانی ۱۳۶۴ھ مطابق ماہ جون ۱۹۴۵ء عدد ۶

مضامین

شذرات	سید سلیمان ندوی	۱۲۹ - ۱۳۰
زمانہ حاضر کا انسان اور اقبال	ڈاکٹر میر ولی الدین صدر شعبۂ فلسفہ جامعہ عثمانیہ	۱۳۱ - ۱۴۱
انڈونیسا،	جناب مولوی محمد صابر صاحب ندوی کسماٹری متعلم مسلم یونیورسٹی	۱۴۲ - ۱۵۳
استدراک بر ترجمۂ ابن خلکان	جناب مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورنیکلر سوسائٹی احمد آباد،	۱۵۴ - ۱۵۵
اردو کی دو قدیم کتابیں،	جناب ڈاکٹر سید نور الحسن ہاشمی لکچرار اردو لکھنؤ یونیورسٹی	۱۵۶ - ۱۵۷
تابش سہیل،	جناب مولوی اقبال احمد خان صاحب سہیل،	۱۵۸
غزل،	جناب عزیز احمد صاحب بلال جھانسی،	
مطبوعات جدیدہ	"ا - ع"	۱۵۹ - ۱۶۰

شذرات

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ معارف اپنی پہلی ضخامت کی طرف آہستہ آہستہ لوٹ رہا ہے، پچھلے مہینہ سے ۳۲ صفحوں پر شائع ہو رہا ہے انشاء اللہ آیندہ ماہ سے ۴۸ پر ہوگا اور امید ہے کہ چند ماہ کے بعد اس کی اصلی ضخامت پھر اپنی جگہ پر آجائے گی، صفحوں کی کمی کے سبب سے مضامین کے تنوع اور رسالہ کی دلچسپی میں جو کمی آگئی تھی، ہم کو خود اس کا افسوس تھا پھر بھی قدر دانوں کی طرف سے اوس کی مانگ برابر بڑھتی ہی رہی، اور کاغذ کے استعمال کی کمی کے حکم سے ہم اون کی تعمیل بروقت نہ کر سکے، امید ہے کہ یہ مشکل بھی دور ہو جائے گی،

چھ برس سے دنیا میں لڑائی کی جو تباہی چھائی تھی، اس مہینہ جرمنی کی شکست سے یورپ کے ملکوں میں اس کا خاتمہ ہو گیا، تاریخ کے لحاظ سے یہ اپنی قسم کا کوئی نیا واقعہ نہیں، ہمیشہ ہی سے یہ دستور الٰہی رہا ہے کہ جو اپنی تلوار کے زور سے دوسروں کو گراتے ہیں، وہ آخر دوسروں کی تلوار کے زور سے ایک دن خود گرائے جاتے ہیں،

لیکن یہ دیکھنا ہے کہ یہ لڑائی جس مقصد سے لڑی گئی، اس میں دنیا کو کہاں تک کامیابی ہوئی، یا ہوگی چھوٹی قوموں کی حفاظت، کمزور ملکوں کی حمایت اور جمہوریت کا بول بالا اس جنگ کا ترانہ تھا، اب ہم کو دیکھنا ہے اور تاریخ کو اپنے اوراق میں قلمبند کرنا ہے کہ اس زمانہ کے مہذب فاتح اور متمدن کشور کشا کہاں تک میدان جنگ کے وعدوں کو صلح کی میزوں پر یاد رکھتے ہیں، اور فتح و شکست کے نتیجوں میں قوت اور ضعف کی پرانی بار بار کی دہرائی ہوئی دلیلوں کے علاوہ اس مدعیانہ ترقی و تہذیب کا عہد بھی کچھ تبدیلی پیدا کرتا ہے یا نہیں،

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں دنیا کی بڑی بڑی جبار و قہار قوموں کی تباہی کا نقشہ پیش فرمایا ہے، اور بتایا ہے کہ قوت کا زور، طاقت کا گھمنڈ، دولت کا غرور اور ساز و سامان کی فراوانی نے ہمیشہ قوموں کو حدود الٰہی سے قدم باہر نکالنے پر آمادہ کیا ہے، فرعون و نمرود اور عاد و ثمود، تبابعۂ یمن اور شاہان سبا کے واقعات کو قرآن پاک میں بڑی تفصیل سے بتایا گیا ہے، اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ یہ واقعات اور ان کے یہ نتیجے یہ قوت اور ان کے یہ پھل صرف پچھلی ہی قوموں کے حق میں تھے نہیں دنیا کا کوئی دور، تاریخ کا کوئی ورق، اور زمانہ کا کوئی عہد ان واقعات اور ان کے ان

لازمی نتیجوں سے کبھی خالی نہیں رہا ہے، فاعتبروا یااولی الابصار۔

تاریخ کا یہ کس قدر عبرتناک انجام ہے کہ وہ ہٹلر، وہ مسولینی، وہ ہملر، وہ گوئرنگ، وہ گوئبلز جن کے لفظ لفظ کو دنیا تقدیر مبرم سمجھتی تھی جن کے ہر محال دعویٰ کو صرف ان کے کہدینے ہی سے ممکن یقین کر لیتی تھی جن کے رعب و دبدبہ سے زمین کا ہر قطعہ خوف و دہشت سے لرزہ براندام تھا اور جن کے ایک ایک قدم سے ہر وقت دنیا زیر و زبر ہو رہی تھی، آخر وہ گھڑی آئی کہ بیکسی اور مایوسی نے ان کی ہر امید کا خاتمہ کر دیا، ان میں سے کسی نے اپنے ہاتھ سے آپ اپنا گلا کاٹ لیا، کسی نے زہر کا پیالہ پی لیا، کوئی اپنے دوستوں کی تلواروں سے آپ مارا گیا، اور برلن جو کبھی بابل کا مینار تھا، آج خاک کے تودوں کے سوا کچھ نہیں ۔

یہ تو وہ نقشہ ہے جو لڑائی کے میدانوں میں نظر آیا، اب دیکھنا یہ ہے کہ سان فرانسسکو کے دلکش ایوانوں، اور ۴۸ ملکوں کی نشست گاہوں میں کیا نظر آتا ہے، گو کہ مستقبل کے چہرے پر بھاری پردہ پڑا ہے، پھر بھی دوربین نگاہوں کو شام کے سبزہ زاروں، ٹریسٹ کے کناروں، پولینڈ کی وادیوں، افریقہ کے ریگستانوں، چین اور برما کے بندرگاہوں، اور جزائر ہند کے ٹاپوؤں میں ابھی سے آنے والی مشکلوں کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں،

حقیقت یہ ہے کہ جب تک اشخاص کی طرح قومیں بھی حرص و طمع اور لالچ اور نہ ختم ہونے والی زمین کی بھوک سے آزاد نہ ہوں گی، ایک سان فرانسسکو کیا، سو سان فرانسسکو بھی دنیا میں امن اور چین پیدا نہیں کر سکتے، جنرل اور سپہ سالار اپنی جیت اور ہار کی بازی ختم کر چکے، اب سیاست کے ماہروں اور ڈپلومیسی کے شاطروں کی بساطیں بچھی ہیں، اور تلوار کی بخشی ہوئی قوت کو قلم کی نوک سے کام میں لا رہے ہیں،

یاد ہوگا کہ جرمن خطرہ کے عہد میں شام اور لبنان کے لوگوں کو فرانس کی منظوری سے اتحادیوں کی طرف سے خودمختاری کی سند عطا ہوئی تھی، ابھی زخموں سے چور فرانس بستر سے اٹھا بھی نہیں، پھر بھی بستر سے اٹھنے کے ارادہ کے ثبوت میں سب سے پہلا قدم شام و لبنان سے ان کی اس مجبورانہ عطا کی ہوئی خودمختاری کی سند کو چھیننے ہی کی طرف بڑھ رہا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ کی قوموں کی اخلاقی بیماری اتنی پرانی ہو چکی ہے، کہ موت کے سوا ان کا کوئی دوسرا علاج نہیں،

جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اقلیت والی قومیں اکثریت کے مقابلہ میں کچھ نہیں کر سکتیں، وہ دیکھیں کہ دنیا کی سب سے چھوٹی، سب سے پراگندہ اور آوارہ قوم یہود آج اپنی دولت کی قوت اور تنظیم کی مضبوطی سے دنیا کے سب سے زیادہ آزادی پسند ملک (امریکہ) کے پریسیڈنٹ، اور انگلستان کی سب سے زیادہ آزادی دوست پارٹی (لیبر پارٹی) کے نمایندہ کی زبانوں سے اپنے دلی مقصد کا اظہار کر رہی ہے، اور ان کی مدد سے یہود فلسطین میں اپنے جبروت کا تخت بچھانا چاہتے ہیں، اور اس طرح قرآن پاک کی پیشینگوئی الا بحبل من اللہ الخ پوری ہو رہی ہے،

آج عیسائی اور یہودی قوموں نے مسلمانوں کے خلاف جو باہم اتحاد کیا ہے، وہ بھی قرآن پاک ہی کی تصدیق ہے بعضھم من بعض مسلمانوں میں جو لوگ ان کی ہر چیز میں نقالی کر کے قوت و عظمت حاصل کرنا چاہتے ہیں، ان کو قرآن پاک کی ایک اور پیشینگوئی یاد دلاتا ہے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ (بقرہ - ۱۴) — تم سے یہود اور نصاریٰ اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے، جب تک تم اپنا دین چھوڑ کر ان کی ملت اختیار نہ کرو،

مسلمان زبان سے اس تبدیلی کا انکار کریں گے لیکن ان کا ظاہر و باطن کیا ان کے زبان حال کا اعتراف نہیں

مقالات

زمانۂ حاضر کا انسان

اور

اقبال

از جناب ڈاکٹر میر ولی الدین صاحب صدر شعبہ فلسفہ، جامعہ عثمانیہ

عشق ناپید و خرد می گزدش صورت مار ۔۔۔ عقل کو تابعِ فرمانِ نظر کر نہ سکا
ڈھونڈنے والا ستاروں کی گذرگاہوں کا ۔۔۔ اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
اپنی حکمت کے خم و پیچ میں الجھا ایسا ۔۔۔ آج تک فیصلۂ نفع و ضرر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا ۔۔۔ زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

زمانۂ حاضر کا انسان !؟ ایجاد و اختراع، فن و حکمت، سائنس اور ہنر کے لحاظ سے کمال کے انتہائی مدارج پر گامزن ہے، اس کی نکتہ رس اور باریک بین عقل نے ناممکنات کو ممکن بنا دیا، جو چیزیں گمان و قیاس و وہم کے ماورا تھیں، اب وہ روزمرہ کے حقائق میں شامل ہیں، عقل جن کے ادراک و فہم سے عاجز تھی، اب وہ بلاتکلف استعمال میں آرہی ہیں، اب ہم اپنے مقام پر بیٹھے سات سمندر پار کے بسنے والوں سے گفتگو کرتے ہیں، اپنے گھروں میں ٹلی وژن سٹ نصب کرتے ہیں، تصویریں بولتی ہیں اور ہمیں اپنے دلربا نغموں سے مست کرتی ہیں لاشعاعیں (X-rays) ہمارے لئے ان دریچوں کا کام دیتی ہیں جن کے پٹ کھول کر ہم اپنے معدے اور انتوں کو دیکھ سکتے ہیں، ہماری سڑکیں ربر سے بنائی جا رہی ہیں، ہماری کھیتی برقی قوت کے ذریعہ پکتی ہے، ہمارے بالوں میں پیچ و خم برقی لہریں پیدا کرتی ہیں، طی الارض کی کرامت کا ہم سے ظہور ہوتا ہے، فاصلے ہمارے لئے وجود نہیں رکھتے، ہمارے طیاروں نے زمین کو گھیر لیا ہے، بہرحال ہم نے مشین ایجاد کی، اور مشین نے ہماری زندگی میں عظیم الشان تغیر پیدا کر دیا، اسی تغیر کی ماہیت اور اس کے دور رس نتائج پر ہمیں یہاں اقبال کے ساتھ ایک نظر ڈالنی ہے، اور بتلانا ہے کہ زندگی پر مشین کے تسلط کی وجہ سے جو تہذیب پیدا ہوئی ہے، وہ فسادِ قلب اور فسادِ نظر میں مبتلا ہے، اس کی روح میں عفت، اس کے ضمیر میں پاکی، اس کے خیال میں روحانی علو و بلندی، اور اس کے ذوق میں لطافت و پاکیزگی مفقود ہے، !

فسادِ قلب و نظر ہے فرنگ کی تہذیب ۔۔۔ کہ روح اس مدنیت کی رہ سکی نہ عفیف
رہے نہ روح میں پاکیزگی تو ہے ناپید ۔۔۔ ضمیر پاک و خیال بلند و ذوق لطیف

اقبال کی نظر میں عہد حاضر کا انسان قلب اور نظر کے امراض فاسدہ میں مبتلا ہے اور یہ امراض یوں تو بے شمار ہیں لیکن ان میں کے زیادہ مہلک یہ ہیں:

لادینی اور تشکیک، جبر یا اپنے اختیار و آزادی کے فقدان کا احساس، لذت پرستی، اور واقعیت یا

"خوش باش دمے کہ زندگانی این است" کا فلسفہ،

آیئے کچھ دیر کے لئے اقبال کے ساتھ ان روحانی امراض پر ایک نظر ڈالیں:

(۱) تشکیک ولادینی: تہذیب حاضر کے زیر اثر جو نسل پیدا ہوئی ہے، وہ عملاً دین و ایمان سے خالی و عاری ہے، اس کی نظر میں مذہب ایک "جنون خام" ہے، اور "ہستی غائب" کے تلاش کرنے والے احمق اور نادان ہیں، علوم جدید کی بنا محسوس پر ہے، موجود ان کی رو سے وہی ہے جو محسوس ہے، حقیقت کا علم ہمیں ادراک، مشاہدہ اور ارتسام کے ذریعہ ہوتا ہے، اور ہمارے تمام تصورات ان ہی ارتسامات کی نقول ہیں، ارتسام تصور کی اصل ہے، تصورات کے پہلے ارتسامات کا ہونا ضروری ہے، لہذا کسی چیز کا جاننا اس کا حواس کے ذریعہ ادراک حاصل کرنا ہے، تو جاننے کے معنی "حصول ارتسامات" کے ہوئے یعنی احساس کرنے کے، ہمارے لئے وہی چیز حقیقی ہوگی، جس کو ہم محسوس کریں گے، اور مذہب کا معروض "ہستی غائب" ہے، جس کا کوئی ادراک یا احساس ممکن نہیں، لہذا اس کا کوئی علم قابل حصول نہیں، لہذا اس کی تلاش ایک سیاہ بلی کی تلاش ہے، جو ایک تاریک کمرہ میں کی جارہی ہے، جو اس کمرہ میں موجود نہیں، یہ ہے استدلال دور حاضر کے نوجوانوں کا جو اپنا مسلک "مذہب کے خلاف انتہائی تجربیت یا احساسیت (Se-nsationalism) کو قرار دیتے ہیں، اقبال نے ان کے ان خیالات کو اس طرح ادا کیا ہے، اور آخر میں بیدل کے الفاظ میں ان کا فلسفیانہ جواب بھی دیدیا ہے، جس کی توضیح ہم بعد میں چل کر کریں گے،

تعلیم پیر فلسفہ مغربی ہے یہ ۔۔۔ نادان ہیں جن کو ہستی غائب کی ہے تلاش!
پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا ۔۔۔ ہے شیخ بھی مثال برہمن صنم تراش!
محسوس پر بنا ہے علوم جدید کی ۔۔۔ اس دور میں ہے شیشہ عقائد کا پاش پاش!
مذہب ہے جس کا نام وہ ہے اک جنون خام ۔۔۔ ہے جس سے آدمی کے تخیل کو ارتعاش!
کہتا مگر ہے فلسفہ زندگی کچھ اور ۔۔۔ مجھ پر کیا یہ مرشد کامل نے راز فاش!

با ہر کمال اندکے آشفتگی خوش است،
ہر چند عقل کل شدۂ بے جنون مباش!

مذہب سے بیزاری کا نتیجہ یہ ہے، کہ عصر حاضر کے نوجوانوں کے لئے نہ زندگی کی کوئی غایت ہے، اور نہ تخلیق کائنات کی کوئی غرض یا مقصد، بلکہ وہ اس سوال ہی کے اٹھانے کو حماقت تصور کرتے ہیں، کہ کیا زندگی کی کوئی غایت ہوسکتی ہے اور عالم کا کوئی مقصد؟ بیس طلبہ کی ایک جماعت (جو عمر کے لحاظ سے بیس پچیس سال کے درمیان تھے) سے پوچھا گیا، کہ مذہب کے متعلق تمھارا کیا عقیدہ ہے، تو صرف تین نے اس کی جانب اپنا میلان ظاہر کیا، آٹھ نے کہا کہ انھوں نے اس مسئلہ کی ایجابی یا سلبی جانب پر کوئی غور ہی نہیں کیا، اور باقی نو تو کھلے لامذہب تھے، اکوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ جو تناسب دیندار اور بے دین طلبہ کا ان جوابات سے ظاہر ہوتا ہے، وہ کس طرح غیر معمولی یا استثنائی سمجھا جائے، مسلمانوں کی نئی پود میں لادینی اور الحاد کے اس میلان کو اقبال نے ایک اثر انگیز نظم میں جس کا عنوان "فردوس میں ایک مکالمہ" ہے یوں ظاہر کیا ہے،

ہاتف نے کہا مجھ سے کہ فردوس میں اک روز ۔۔۔ حالی سے مخاطب ہوئے یوں سعدی شیراز
اے آنکہ ز نور گہر نظم فلک تاب ۔۔۔ دامن بچراغ مہ و اختر زدۂ باز!
کچھ کیفیت مسلم ہندی تو بیان کر ۔۔۔ واماندۂ منزل ہے کہ مصروف تگ و تاز؟

مذہب کی حرارت بھی ہو کچھ اس کی رگوں میں / تھی جس کی فلک سوز کبھی گرمیٔ آواز ؟
باتوں سے ہوا شیخ کی حالی متاثر / رو رو کے لگا کہنے کہ اے صاحبِ اعجاز !
جب پیرِ فلک نے ورق ایام کا الٹا / آئی یہ صدا پاؤ گے تعلیم سے اعزاز
آیا ہے مگر اس سے عقیدوں میں تزلزل / دنیا تو ملی طائرِ دیں کر گیا پرواز
دیں ہو تو مقاصد میں بھی پیدا ہو بلندی / فطرت ہے جوانوں کی زمیں گیر زمیں تاز
مذہب سے ہم آہنگیٔ افراد ہے باقی / دیں زخمہ ہے جمعیتِ ملت ہے اگر ساز
بنیاد لرز جائے جو دیوارِ چمن کی / ظاہر ہے کہ انجام گلستاں کا ہے آغاز
پانی نہ ملا زمزمِ ملت سے جو اس کو / پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز
یہ ذکر حضورِ شہِ یثرب میں نہ کرنا / سمجھیں نہ کہیں ہند کے مسلم مجھے غماز

"خرما نتوان یافت ازان خار کہ کشتیم
و دیبا نتوان بافت ازان پشم کہ رشتیم" (سعدی)

طائرِ دین کے پرواز کر جانے، اور الحاد کے انداز پیدا ہوتے ہی کردار میں تغیر کا رونما ہونا ضروری تھا، اوامر و نواہی کی پابندی اور رضائے الٰہی کا خیال، سزا کا خوف اور جزا کی امید، یہ سب محرکات ہمارے نوجوانوں کے ہاں نہ قابلِ التفات ہیں، اور نہ لائق توجہ، جدید نفسیات (تحلیلی نفسیات Psycho-analysis) نے انھیں تعلیم دی کہ ذہن انسانی کا بیشتر حصہ غیر شعوری ہے، انسانی شخصیت کی مثال برف کے اس انبار کی سی ہے، جو سمندروں میں بہتا رہتا ہے، اس کا تھوڑا ہی سا حصہ سطح شعور کے اوپر نظر آتا ہے، باقی سب نیچے پوشیدہ ہوتا ہے، یہ حصہ جس کو غیر شعوری نفس کہا جاتا ہے، نہ صرف نسبتہً بہت زیادہ بڑا ہوتا ہے، بلکہ اہمیت کے لحاظ سے بھی نفس شعوری سے کہیں زیادہ عظیم الشان ہے، شعور میں جو کچھ نمایاں ہوتا ہے، وہ اس غیر شعوری نفس ہی میں پیدا ہوا ہے، اور اس راہ سے آیا ہے، یا یوں کہو کہ اس کا تعین غیر شعوری نفس ہی سے ہوتا ہے، لہٰذا انسان کے ذہن کا شعوری حصہ کوئی زیادہ اہمیت کی چیز نہیں، اس لئے کہ اس کا سارا مواد اور اس کے سارے اعمال و وظائف ان قوتوں کے اظہار ہیں، جو ہمارے باطن میں مستور اور پوشیدہ ہیں، جن کا نہ ہمیں عام طور پر علم ہوتا ہے، اور نہ یہ ہمارے تصرف و اختیار میں ہوتے ہیں،

ان ذہنی حالات سے واقف ہونے کے بعد یہ بات فوراً سمجھ میں آجاتی ہے، کہ ہماری ساری خواہشات اور آرزوؤں کا مبدأ غیر شعوری نفس ہے، اب غیر شعوری نفس میں کیا ہو رہا ہے، ہم نہیں جانتے، جب نہیں جانتے، تو ظاہر ہے کہ ان پر ہمارا تصرف یا اختیار بھی نہیں ہو سکتا، لہٰذا جب کسی غیر شعوری خواہش کا ظہور شعور میں ہوتا ہے، تو وہ ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی، ہمارا اس پر کوئی اقتدار نہیں ہوتا، ہم اپنی سیرت کے آپ معمار نہیں، ہماری سیرت نتیجہ ہے ان تاثرات، تحریکات، ترغیبات اور قوتوں کے باہمی عمل یا تعامل کا جو غیر شعوری دائرہ میں جاری ہیں، اور جن کا ہمیں کوئی علم نہیں، اگر ہم سے اب یہ کہا جائے کہ ہمیں ضبط نفس سے کام لینا چاہئے، بری خواہشات پر قابو رکھنا چاہئے، ان کی نفی کرنی چاہئے تو یہ ہمارے بس کی بات نہیں !

اگر ہم ان کے ضبط پر قادر بھی ہوں تو جدید نفسیات کی تعلیم ہے، کہ ان کی نفی یا ان کا دبا دینا ہماری ذہنی

صحت کے لئے سخت مضر ہوتا ہے، آسکر وائیلڈ نے کہا تھا کہ کسی خواہش نفسی سے نجات پانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ اس کی تکمیل کرلی جائے، جدید نفسیات اس قول کی تصدیق کررہی ہے، ہماری توانائی و قوت کے مبدأ اصلی کو جو لی بی ڈو (Libido) کہلاتا ہے، فرائیڈ اس چشمۂ آب سے تشبیہ دیتا ہے، جو زمین کے نیچے بہ رہا ہے، اور کسی مخرج کی تلاش مین ہے، اگر تم اس چشمہ کو پشتہ لگاکر روک دو، اور اس کے پانی کو بہ کر نکل جانے نہ دو، تو پھر یہ بند ہو کر کیچڑ پیدا کرتا ہے، جو فوراً ہمارے شعور کو آلودہ کرتا ہے اور ہماری ذات کو مضر اخلاط اور متعفن بخارات سے مسموم کر دیتا ہے، یہ کیچڑ گویا مولفات (Complexes) سے تعبیر کر اور بخارات عہد حاضر کی زندگی کے وہ بے شمار عصبی امراض (neurosis) اور سقیم خوف (phobias) ہین جن کا نفسی تحلیلی علاج کرنا چاہتی ہے، اور علاج کا طریقہ بھی یہی ہے، کہ ان رکی دبی خواہشات کو ظاہر ہونے دیا جائے اور مریض کو ان کی موجودگی کا علم ہو جائے، جس کے تحت شعور دائرہ مین یہ مقفل پڑی تھین، اور سڑکر روگ پیدا کررہی تھین،!

دین و مذہب کی روح تو یہ ہے کہ اوامر الٰہی کے امتثال اور نواہی سے اجتناب کی کوشش کی جائے، اور جدید نفسیات کی تعلیم یہ کہ خواہشات کو بے لگام رکھنا ہی صحت ذات کے لئے ضروری ہے، جہان نفس کو اشتعال ہوا یا ہوس رانی سے زبردستی روکا گیا، کہ انسان کی شخصیت سیکڑون عصبی امراض اور سقیم خوف و ترس مین مبتلا ہو جاتی ہے، اظہار ذات (Self-expression) نہ کہ انکار ذات (Self-denial) جدید نفسیات کا مشورہ ہے یعنی نفس کو خواہشات یا باصطلاح مذہب ہویٰ سے روکا نہ جائے، ان کی تکمیل کی جائے، اور اسی ہوس رانی کا نام اظہار ذات ہے! ڈی، ایچ، لارنس (D. H. Lawrence) وغیرہ کے ناولون نے ان خیالات و اصول کو اتنا عام اور قابل فہم بنا دیا ہے کہ تحلیلی نفسیات کے دقیق اصطلاحات اور مشکل مباحث عوام کی راہ مین کوئی روک نہین رہے،!

ان تعلیمات وخیالات نے مذہب و اخلاق کی بیخ کنی کر دی، نوجوانون کے قلوب مسخ ہو گئے، ان کے دماغ روشن لیکن "دل تیرہ" نگہ "بے باک" ہو گئی، ان کی عقل اور ان کا دل "طواف آب و گل" مین گرفتار ہو گیا، ان کے تن تو فربہ لیکن جانین لاغر ہو گئین، جاوید نامہ مین ان ہی کی حالت کو ان دردناک الفاظ مین پیش کیا گیا ہے،

گر خدا سازد ترا صاحب نظر — روزگارے را کہ می آید نگر
عقلہا بے باک و دلہا بے گداز — چشمہا بے شرم و غرق اندر مجاز
علم و فن دین و سیاست عقل و دل — زوج زوج اندر طواف آب و گل

کچھ آگے چل کر زیادہ وضاحت کی گئی ہے،

نوجوانان تشنہ لب خالی ایاغ — شستہ رو تاریک جان روشن دماغ!
کم نگاہ و بے یقین و نا امید — چشم شان اندر جہان چیزے ندید!
ناکسان منکر ز خود مومن بغیر — خشت بند از خاک شان معمار دیر!

یعنی دین و مذہب کو ہاتھ سے کھو کر عقل و استدلال کو اختیار کرکے نوجوانون نے کیا پایا،؟ مادی عقل نے ان کے قلوب مین کیا انقلاب پیدا کر دیا ؟ ان کے نقطۂ نظر کو کس طرح بدل دیا ؟ اور نقطۂ نظر کے بدل جانے سے جہان اور جہان کے چارسو ان کے لئے کیسے بدل گئے،؟ اقبال کو جو نظر آیا وہ یہ تھا،

جان لاغر و تن فربہ و ملبوس بدن زیب — دل نزع کی حالت مین خرد پختہ و چالاک!

قلب سے عشق و ایمان رخصت ہوا، اور تاریکی چھائی، دل تیرہ اور نگہ بے باک ہوگئی، روح اخلاقی اقدار سے محروم ہو کر لاغر ہونے لگی، اس کے عوض تن میں فربہی پیدا ہونے لگی، زاغ کی عمر بھی تو غلیظ کھا کر دراز ہوتی ہے اور وہ ہوتا بھی سرگین خوری کے لئے ہے،

عمر زاغ از بہر سرگین خوردنست، (رومی)

شاید اسی سرگین خوری نے انھیں شستہ رو روشن دماغ کر دیا، لیکن نگاہ کی وسعت اور یقین کا ذوق، ایمان کا گداز، روح کی پاکیزگی، اور عفت ان سے رخصت ہوگئی!!

اے مسلمانان فغان از فتنہ ہائے علم و فن اہرمن اندر جہان ارزان و یزدان دیریاب

(۲) جبریت:۔ علوم جدید (خصوصاً نفسیات تحلیلی) نے ہمارے نوجوانوں کو تعلیم دی کہ ہم اپنی سیرت کے آپ معمار نہیں، کیونکہ جیسا کہ ہم نے اوپر دیکھا تمام شعوری واردات و واقعات کا مبدا، غیر شعوری نفس ہے، ہماری شعوری خواہشات اور افکار عکس ہیں ہمارے غیر شعوری عناصر کا جن میں کم و بیش حذف و اضافہ کر لیا جاتا ہے، ہم نہیں جانتے، ہمارے غیر شعوری نفس کے دائرہ میں کیا ہو رہا ہے، اور جب نہیں جانتے تو ظاہر ہے کہ ان پر ہمارا کوئی تصرف بھی نہیں ہو سکتا، اور جب ان پر ہمارا تصرف نہیں تو ان کے ہم ذمہ دار بھی نہیں، لہذا ان غیر شعوری خواہشات میں سے کسی کا ظہور شعور میں ہوتا ہے، تو وہ ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی، اور ہم اس کے ذمہ دار نہیں قرار دئے جاسکتے، بالفاظ دیگر ہم اپنے شعوری افکار و خواہشات کے ذمہ دار نہیں، اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو کچھ ہم سوچتے ہیں، اور کرتے ہیں، ان کے ہم ذمہ دار نہیں قرار دیے جاسکتے، مختصر یہ کہ اگر شعور کو غیر شعوری اعمال کا نتیجہ قرار دیا جائے، تو صاف ظاہر ہے کہ اس کا تعین ان ہی اعمال سے ہوگا، جو اس کو پیدا کرتے ہیں، شعوری واقعات و حالات اس پوشیدہ و مستور نفسیاتی مشینری کے عمل کا محض دھوان اور شعلہ ہیں جس کا ہمیں شعور نہیں، علم نہیں،

پرستاران مذہب و اخلاق کا یہ کہنا صحیح نہیں، کہ ہمارا ارادہ آزاد ہے، اور وہ ہمارے افکار و خواہشات پر حکمرانی کرتا ہے، انھیں اپنے اقتدار میں رکھتا ہے، جو خواہشات کہ ہماری روح کے مفاد کے خلاف ہوتی ہیں، انھیں وہ ترک کر دیتا ہے، اور جو اس کی فلاح کے معاون ہوتی ہیں، انہیں کو اختیار کرتا ہے، صحیح یہ ہے کہ صرف جبلتیں ہی انسانی اعمال کی حقیقی محرکات ہیں، انہی جبلتوں کی تشفی کے لئے ہم عمل کرتے ہیں، جب تک کسی جبلت کی تشفی مقصود نہ ہو، نہ ہم سے عمل سرزد ہو سکتا ہے، اور نہ ہم غور و فکر ہی کر سکتے ہیں، جبلی میلانات اور ان کی زبردست مشینری نہ ہو تو ہماری عضویت کسی عمل کے قابل ہی نہ رہے، وہ اس گھڑی کی طرح بیکار ہو جائے جس کی کمانی ٹوٹ گئی ہو،

اگر ارادہ کوئی جدا اور مستقل شے بھی مان لیا جائے تو بھی وہ اس وقت تک بے عمل اور بے کار ہوگا، جب تک کہ کوئی جبلت اس سے کام نہ لے، لہذا جب تک کہ ہم ارادہ کو کسی ناجائز خواہش کے دبانے کے لئے استعمال کرنے کی خواہش نہ کریں اس وقت تک ہم اس ناجائز خواہش کو نسیاً منسیاً نہیں کر سکتے، اب ارادہ کو اس مقصد کے لئے استعمال کرنے کی خواہش دوسری خواہشات کی طرح اساسی طور پر جبلی ہوتی ہے جس کے وقوع اور جس کی قوت کے ہم کسی طرح ذمہ دار نہیں قرار دیے جاسکتے ہم اپنے اقتضا اپنی فطرت اور جبلت سے مجبور ہیں، اپنے اقتضا، اپنی فطرت یا اپنی جبلت پر ہمیں کوئی اقتدار نہیں، ع

اے شیخ پاک و امن معذور دار ما را!

مسلمانوں کی نئی پود میں جبریت کا اثر عقیدہ "تقدیر" کی غلط فہمی کی وجہ سے زہر کی طرح سرایت کر گیا ہے، اور

ان کے عمل کی قوت کو مفلوج کر دیا ہے، نہ صوفی میں مجاہدانہ حرارت رہی، اور نہ سالک میں مستی کردار، شاعر کی نوا، مردہ و افسردہ و بے ذوق ہو کر رہ گئی، مرد مجاہد مفقود ہو گیا!

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال ملا کی شریعت میں فقط مستی گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

تقدیر کے عقیدے نے مسلمان کو عمل سے غافل کر دیا، "شراب الست" بے عملی کا خوب بہانہ بنی، قسمت ہی کا لکھا ایسا تھا کہ کر مسلمان کشمکش زندگی سے بھاگ کھڑا ہوا، اور جمود و خمود نے اس کے تو اے عمل پر اپنا تسلط قائم کر لیا!

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست
فقیہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست

جس قرآن کی تعلیم نے مسلمانوں کو مرد و یر دین کا امیر بنا چھوڑا تھا، اب اسی قرآن سے ترک جہان کی تعلیم اخذ کی جا رہی ہے، غلاموں کو تفسیر بھی خوب آتی ہے، جس دین میں مصلحت، جنگ و شکوہ تھی، اب اس کی مصلحت غار و کوہ بھی جا رہی ہے، جبر ہی کے عقیدے اور تعلیم نے مسلمان کو عمل سے محروم کر دیا، مجاہدہ سے وہ غافل ہو گیا، اور اس کا لازمی نتیجہ غلامی کی صورت میں نمایاں ہوا، خودی مردہ ہو گئی "قفس حلال اور آشیانہ حرام ہو گیا"!

اسی قرآن میں ہے اب ترک جہان کی تعلیم جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز تھی نہان جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

غرض اقبال کی نظر میں مسلمان خود اپنے کو اور اپنے خدا کو فریب دے رہا ہے، جب وہ تقدیر کا بہانہ کر کے عمل سے بے پروا ہو رہا ہے،

عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی

(۳) لذت اندوزی: اگر ہم عمل و مجاہدہ سے اپنی زندگی کی تعمیر نہیں کر سکتے، اگر ہم اپنے مستقبل کو سنوارنے میں اتنے ہی مجبور ہیں، جتنے کہ اپنے ماضی کے بدلنے میں، تو پھر ہمیں اپنی موجودہ زندگی سے جیسی بھی کہ وہ ہے، پوری طرح بہرہ اندوز ہونا چاہئے، اور جو کچھ مل جائے (بغیر اس کے بدلنے کی کوشش کے) لطف اندوز ہونا چاہئے،

ایام جوانی و شباب او لی تر با خوش پسران جام شراب او لی تر
این عالم فانی چو خراب است بیاب در جائے خراب ہم خراب او لی تر (خیام)

زمانہ حاضر کے انسان نے یہ دیکھ کر کہ مستقبل نہ صرف نامعلوم ہے، بلکہ ہمارے حیطۂ قدرت سے بھی باہر ہے عقلمندی اور ہوشیاری اس میں دیکھی کہ حال سے پوری طرح تمتع حاصل کیا جائے، اپنی عمر کے موجودہ وقت کو خوش دلی سے بسر کیا جائے اس لئے شراب ناب اور بوس و کنار (Wine & Kisses) کو اس نے حیات آتیہ کی موعودہ لذتوں سے زیادہ غنیمت تصور کیا! عصر حاضر نے اس کو یہ تعلیم دی کہ مذہب کا یہ فرمان کہ انسان کو ہوائے نفسانی کی مخالفت کرنی چاہئے

اور خواہشات طبعی کو شرع کے تحت میں رکھنا چاہئے نہ صرف ناقابل عمل ہے، بلکہ شخصیت انسانی کے لئے قطعاً مضر بھی فرائڈ نے ذرا تفصیل سے بتلایا کہ موجودہ زمانہ کی بے شمار ذہنی بیماریاں عصبی امراض، ہسٹریا، اور زندگی سے بیزاری اور عدم طمانیت نتیجہ ہیں جوانی میں فطری خواہشات کو دبانے اور روکنے کا! صحت و طمانیت کے لئے انکار ذات نہیں اظہار ذات کی ضرورت ہے، انکار ذات ان لوگوں کا فلسفہ ہے جو خود لذت اندوزی کے قابل تو رہے نہیں، دوسروں کو بھی اس سے محروم کرنا چاہتے ہیں!! اپنے مصائب پر غم و حزن، واویلا اور سینہ کوبی خود رحمی (Self pity) آئندہ زندگی کے موہوم و تخیلی حادثات سے خوف اور ہول، نقد وقت کو ہاتھ سے کھونا اور شخصیت کی عمارت کو جڑ سے اکھاڑنا ہے!

لہذا عصر حاضر کی روح کا نوجوانوں سے خطاب یہ ہے:

تا کے ز غم زمانہ محزون باشی — باچشم پر آب و دل پر خون باشی
می نوش بعیش کوش و خوشدل باش — زان پیش کزین دائرہ بیرون باشی (خیام)

اسی لئے عصر حاضر کا نوجوان اس عقیدہ کا پورا قائل نظر آتا ہے، کہ اوقات فرصت کو لذت اندوزی میں صرف کرنا چاہئے، وہ ان افعال و اعمال کو لذت بخش تصور کرتا ہے، جو روح کی باطنی خواہشوں اور تمناؤں کی تکمیل کرتے ہیں، اور یہ جنسی خواہشات کے سوا کچھ نہیں!! رقص و سرود سے ان کی تکمیل ہوتی ہے، یہ اظہار ذات کے عمدہ ذرائع ہیں، زندگی کی آخری غرض و غایت کا تو ہمیں واضح علم نہیں لیکن اتنا تو صاف ہے کہ ع

حالے خوش باش و عمر برباد مکن!

اس طرح لذت اندوزی و اظہار ذات زندگی کی غایت قرار دی جاتی ہے، اور اصرار کیا جاتا ہے کہ ہمیں اپنے نفس کو خوش رکھنا چاہئے اور یہ خوشی اور راحت خود نفس کی خاطر ہے، زندگی کے فرائض کو انجام دینے کی خاطر نہیں، مختصر یہ کہ عصر حاضر کا نوجوان اقبال کے الفاظ میں بدن ہی میں غرق ہے، اور جان سے بے خبر!

ترسم این عصرے کہ تو زادی دران — در بدن غرق است و کم داند ز جان

اور بدن ہی کی راحت و لذت کو غایت تصور کیا جاتا ہے!

نژاد نو کا روشن دماغ مسلمان زادہ اقبال کی نظر میں سراپا تجلی افرنگ ہے، وہاں کی عمارت گروں کی محض ایک تعمیر ہے، از خود بیگانہ اور مست فرنگ ہے، لہذا اس نے بھی اپنی زندگی کا مقصود، طواف آب و گل کو قرار دے رکھا ہے اور ان ہی کے شعار کو اپنا شعار بنا لیا ہے، ان ہی کے علوم کو سیکھا، اور ان کو اپنے قلب میں ذخیرہ کر رکھا ہے، ان کے اثرات اس کے چہرہ پر صاف ظاہر ہیں، اب وہ پہچان تک نہیں پڑتا کہ وہ وہی خود ہے، یا کوئی اور!! اس کی عقل ان ہی کے افکار و آرا کی قید میں گرفتار ہے، اور اس کے گلے کا سانس تک غیر کا ہے، اس کا نہیں! اس کے دل کی آرزوئیں بھی اس کی نہیں غیروں کی ہیں، اور اس کی گفتگو جو اس کی زبان سے جاری ہے، وہ بھی اجنبیوں کی ہے اس کی کہاں! اس کا ساغر اپنا نہیں اس میں شراب بھی شراب فرنگ ہے، !! ان اشعار میں اس غیرت سوز حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

علم غیر آموختی اندوختی — روے خویش از غازہ اش افروختی!
ارجمندی از شعارش می بری — می ندانم تو توئی یا دیگری!
عقل تو زنجیری افکار غیر — در گلوئے تو نفس از تار غیر

برزبانت گفتگو ہا مستعار   در دل تو آرزو ہا مستعار
قمریانت را نوا ہا خواستہ   سرو ہایت را قبا ہا خواستہ
بادہ می گیری بجام از دیگران   جام ہم گیری بوام از دیگران

اقبال عصر حاضر کے اثرات مین اپنی قوم کے نوجوانون کو اس طرح ملوث دیکھ کر خون کے آنسو بہاتا ہے، درد و اضطراب کی حالت مین ان کے مہلک امراض یعنی ان کے ظلمت آباد بے چراغ ضمیر کو، ان کی غلامی اور حریت دشمنی کو، ان کی لادینی، اور الحاد کو، ان کی فرنگ مستی، اور اپنی عینیت و حقیقت سے بیگانگی کو، ان کی بزدلی اور موت سے خوف زدہ ہونے کو، ان کی لذت پرستی اور عیش کوشی کو، یورپ کے باطل علوم کو اپنے سینون مین جگہ دے کر ان کے بتون کے آگے سجدہ ریز ہونے کو، اس طرح اپنے دل و دماغ کو سومنات بنا لینے کو اپنے آقا سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور مین کس درد کے ساتھ پیش کرتا اور دعا کا طالب ہوتا ہے،

این مسلمان زادۂ روشن دماغ   ظلمت آباد ضمیرش بے چراغ
این غلام ابن غلام ابن غلام   حریت اندیشۂ او را حرام
مکتب از وے جذبۂ دین در ربود   از وجودش این قدر دانم کہ بود
این ز خود بیگانہ این مست فرنگ   نان جو می خواہد از دست فرنگ
مومن و از رمز مرگ آگاہ نیست   در دلش لا غالب الا اللہ نیست
از فرنگی می خرد لات و منات   مومن و اندیشۂ او سومنات

قم باذنی گوے او را زندہ کن،
در دلش اللہ ہو را زندہ کن!

نژاد نو کو خطاب کر کے جاوید نامہ مین اقبال نے جو نصیحت کی ہے، اس کا حاصل بس اتنا ہے، کہ دانش برہانی مین حیرت کی فراوانی ہے، سادہ دلون کے یقین کو فلسفیون کے نکتہ ہائے دقیق، پر ترجیح دے کر بے دلیل و برہان از روے جان یعنی قلب کی گہرائیون سے اپنے خالق کی الوہیت اور محمد عربی کی رسالت کا اقرار کرلے،

لا الہ گوئی بگو از روے جان   تا ز اندام تو آید بوے جان

الوہیت حق کے اقرار کے معنی یہ ہین کہ حق تعالیٰ ہی کو اپنا معبود و رب جانے یعنی سر نیاز ان ہی کے آگے خم کرے، دست سوال ان ہی کے آگے پھیلائے، ساری کائنات مین حق کے سوا نہ کسی کو نافع سمجھے، اور نہ نقصان پہنچانے والا، اپنی بندگی اور عبودیت کا رشتہ حق سے جوڑ کر سارے عالم سے غنی ہو جائے، اور بے نیاز! یہی معنی ہین اس شعر کے،

ماسوی اللہ را مسلمان بندہ نیست
پیش فرعونے سرش افگندہ نیست!

اپنی حاجتون کا رخ حق کی طرف پھیر دینے سے، اپنی احتیاج و ذلت کا رشتہ قادر مطلق سے جوڑ لینے سے انسان حقیقی معنی مین انسان بنتا ہے، بے خوف و بے جگر مجاہد، آزاد و بے باک مرد، مرد حر، جس کا سر کسی فرعون کے آگے جھکتا ہے، اور نہ سلطان و امیر سے وہ مرعوب ہوتا ہے، جس کی قوت بازو اور شوکت و جلال کا اندازہ آسان نہین جس کی نگاہ سے تقدیرین بدل جاتی ہین جس کی ہیبت سے کائنات لرزہ بر اندام ہو جاتی ہے!

اسی لئے اقبال لاالٰہ یعنی توحید الوہیت کو یعنی اس ایمان و اقرار کو کہ اللہ ہی ہمارے الٰہ ہیں، معبود و رب ہیں، محض گفتار نہیں قرار دیتا، بلکہ ایک بے پناہ تیغ قرار دیتا ہے، جس کی ضرب کاری ہوتی ہے، جو سارے عالم سے معبودیت کی نسبت کاٹ کر رکھ دیتی ہے، اور اس کے قائل کو سارے عالم سے غنی اور بے نیاز کر دیتی ہے!

این دو حرف لاالٰہ گفتار نیست لاالٰہ جز تیغ بے زنہار نیست
زیستن با سوز او قہاری است لاالٰہ ضرب است و ضرب کاری است

لاالٰہ کا کامل ذوق و فہم حاصل کرنے کے لئے کسی مردِ حق کی صحبت ضروری ہے۔ قلب میں اس کا اذعان و یقین کسی کی نگہ کی مستی پیدا کرتی ہے،

اے پسر ذوقِ نگہ از من بگیر سوختن در لاالٰہ از من بگیر!

یہی معنی ہیں شیخ جیلیؒ کے اس قول کے:-

خذ العلم من افواہ رجال اللّٰہ ولا من الصحائف والدفاتر، مردانِ حق کی زبان سے علم حاصل کرو، کتابوں اور دفتروں سے نہیں،

اہل اللہ کی صحبت خاک کو کیمیا کرتی ہے، قلوب کے زنگ کو دھوتی ہے، ظلمتوں سے نکال کر نور کی طرف لیجاتی ہے، اقبال کے مرشد معنوی عارفِ روم نے مردِ حق کی صحبت کے اثرات کو یوں بیان کیا تھا،

خواہی کہ درین زمانہ فردے گردی یا در رہ دین صاحب دردے گردی
این را بجز از صحبت مردان مطلب مردے گردی چو گرد مردے گردی

اسی لئے قرآن میں کونوا مع الصادقین کا حکم دیا گیا!

یہ یقین، انقلاب انگیز یقین و مستی، سوز و ساز کا یہ رنگ، یہ ذوق و سرور، یہ علم حق عصر حاضر کے مکتبوں اور مدرسوں یا یونیورسٹیوں سے حاصل نہیں ہو سکتا، مکتب اپنے مقصود سے بے خبر ہو گئے ہیں، یہاں وہ علم حاصل ہوتا ہے، جو تخمین و ظن ہے، سراپا حجاب ہے، جو قلب و نظر کا فساد پیدا کرتا ہے، فکر خام بخشتا ہے، جو انسان کو حیوان بنانے کا طریقہ ہے، اس کا عالم کتاب خوان تو ضرور ہوتا ہے لیکن صاحبِ کتاب نہیں،

مردانِ حق کی نگہ کے فیض سے قلب میں یقین و اذعان پیدا ہوتا ہے، شدتِ یقین و اذعان جو ایمان کا دوسرا نام ہے، ایمان کا لازمی نتیجہ شدتِ حب یا عشق ہے، الذین آمنوا اشد حباً للّٰہ اس پر صریح دلیل ہے، اور اقبال شدتِ حب یا عشق کے معنی توحید پر ایمان یا شدتِ یقین ہی کے لیتے ہیں،

عاشقی توحید را بر دل زدن وانگہے خود را بہر مشکل زدن!

یعنی لاالٰہ کا یقین جب قلب کی گہرائیوں میں سرایت کر جاتا ہے، تو عشق پیدا ہوتا ہے، عشق گویا سراپا یقین ہے، سکون و ثبات ہے، ام الکتاب ہے، حقائق حیات کی معرفت کا آلہ عشق ہے، علم نہیں، فتح باب عشق سے ہوتا ہے، علم سے نہیں، ع

علم ہے پیدا سوال عشق ہے پنہان جواب

قلب میں عشق کا شعلہ پیدا ہوتے ہی خودی بیدار ہوتی ہے، خودی نتیجہ ہے لاالٰہ کے اذعان و ایقان کا، توحید کا، ایمان کا، شدتِ حب یا عشق کا، حق تعالیٰ کی ربوبیت پر، ان کی معبودیت پر، ان کی مالکیت و حاکمیت پر یقین میں غیر اللہ

کی غلامی سے نجات دلاتا ہے، سارے عالم سے غنی بناتا ہے،

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

اسی یقین و ایمان سے ہم میں خودی یا "احساس نفس" پیدا ہوتا ہے، ذات کی تعیین ہوتی ہے، ہمارا ضعف قوت سے، ذلت عزت سے، فقر غنا سے بدل جاتا ہے، موجوداتِ عالم میں سے ہم نہ کسی سے ڈرتے ہیں، اور نہ کسی کو نافع و ضار سمجھتے ہیں،

فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اگر تم مومن ہو تو اُن سے خوف نہ کرو مجھ سے خوف کرو،

کا حکم ہمیں سارے عالم سے بے خوف کر دیتا ہے، ہمیں حق کے سوا نہ کسی سے امید و رجا ہوتی ہے، اور نہ کسی سے خوف و ترس،

أَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهُ کیا اللہ بندہ کے لئے کافی نہیں،

کہکر ساری کائنات سے مستغنی ہو جاتے ہیں، اور صحیح معنی میں مخاطب ہو جاتے ہیں، اس قول کے

أَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللّٰهُ مَعَكُمْ تم ہی بلند ہو اللہ تمھارے ساتھ ہے،

اسی خودی کی موت سے عرب و عجم پر جمود طاری ہے ع

خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام

خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بالوں پر قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور کہ بیچ کھائے مسلمان کا جامۂ احرام

ایمان کا نتیجہ عشق اور عشق کا نتیجہ خودی کی بیداری یعنی قوائے عمل کا جاگ اٹھنا! عشق سے عمل کی قوتیں کس طرح جاگ اٹھتی ہیں، صاف سمجھ میں آتا ہے، عشق کا ایک خاصہ تفرد ہے، یعنی عاشق کے لئے معشوق کے سوا سارے علائق منقطع ہو جاتے ہیں، وہ دونوں جہان سے فارغ ہو کر صرف معشوق ہی کا ہو جاتا ہے، معشوق کا ہر حکم عاشق کے لئے قضائے مبرم ہو جاتا ہے، اس کے ہر امر کے امتثال اور بجا آوری میں اس کو راحتِ جان میسر ہوتی ہے، اب اس کو نہ تیغ و خنجر کا خوف رہتا ہے، اور بحر و بر کا، وہ "شمشیر کی مانند برندہ و براق" ہو جاتا ہے، اسی شعلہ کی تنویر نے صحابہ (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کو اپنا سامان تن من دھن اسلام کی راہ پر قربان کرنے پر آمادہ کر دیا تھا، ان ہی کے کارناموں کی طرف اشارہ ہے اقبال کے ان اشعار میں:

عشق کے ہیں معجزات سلطنت و فقر و دین
عشق کے ادنیٰ غلام صاحبِ تاج و نگین
عشق مکان و مکین، عشق زمان و زمین
عشق سراپا یقین اور یقین فتح یاب!

عشق کا شعلہ قلب میں سلگ کر اس کی ظلمتوں کو نور سے بدل دیتا ہے، نفس کا تزکیہ ہو جاتا ہے، اور روح کا تجلیہ، رذائل اخلاق محاسن سے بدل جاتے ہیں، موت جیسی مبغوض شے اب محبوب ہو جاتی ہے، مومن مشتاق کو اپنے محبوب حقیقی کے بقا کی تڑپ ہوتی ہے، موت ہی کے پل پر سے گذر کر اس کو حق تعالیٰ کی رویت نصیب ہوتی ہے، اس لئے موت اس کے لئے ایک تحفہ ہے، جس کا وہ اشتیاق کے ساتھ منتظر ہوتا ہے، اسی معنی میں حضور انور کی اس دعا کے

اللّٰهُمَّ حَبِّبِ الْمَوْتَ إِلَى مَنْ يَعْلَمُ أَنَّ الٰہی موت کو اس شخص کے لئے محبوب کر دیجئے جو

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُكَ، جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تیرا رسول جانتا ہے،

کیونکہ اس کے لئے موت راہِ شوق کی آخری منزل ہے، یہ اس کو کوے دوست میں پہنچا دیتی ہے، دوست کو دوست سے ملا دیتی ہے؛

بگذر از مرگے کہ سازد با لحد | زانکہ این مرگ است مرگِ ام و دد
مرد مومن خواہد از یزدانِ پاک | آن دگر مرگے کہ برگیرد ز خاک
آن دگر مرگ انتہاے راہِ شوق | آخرین تکبیر در جنگاہِ شوق،
جنگ مومن چیست ہجرت سوے دوست | ترک عالم اختیارِ کوے دوست (رومی)

جس شخص کی نظر میں موت محبوب ہو جائے اس کے قلب پر مال و جاہ کی محبت کیسے غالب ہو سکتی ہے، حرص و بخل کی اس میں گنجایش کہاں، کبر و ریا و کینہ کیسے پیدا ہو سکتے ہیں، وہ بھی لا الہ پر ایمان و اذعان اس امر کا یقین ہے کہ زمین و آسمان اور ان کے درمیان جو کچھ ہے سب کے مالک اور حاکم حق تعالیٰ ہیں، لِلّٰهِ مَافِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، جب حقیقی مالک حق تعالیٰ ہیں تو ہم محض امین ہوئے، مال و دولت چند سال کے لئے جو ہماری عمر کی مدت ہے امانت ہے، امانت ملک نہیں، جب ملک نہیں تو اس سے محبت کیسی؟ سچا اور ایماندار امین ہر وقت استرداد امانت کے لئے تیار رہتا ہے، اور اس کو اپنے دل میں جگہ نہیں دیتا، اس کا دل تو دلداری کے لئے وقف ہے کیونکہ وہ جانتا ہے ع

یک دل داری بس است یک دوست ترا (جامی)

جب مال کی محبت کی جگہ اس کے قلب میں نہیں تو طمع یا حرص کے پیدا ہونے کا کیا سوال، اس فقر حاضر[۱] سے اس کا قلب فارغ ہوتا ہے،[۲] خوف مرگ، حُبّ مال و جاہ، حرص و طمع سے نجات غم و حزن سے نجات ہے، جس کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نصف الہرم[۳] یا نیمہ پیری سے تعبیر کیا ہے، اب ذوقِ توحید کا سرشار، عاشق اللہ است حق تعالیٰ ہی کے لئے زندہ رہتا ہے مال و گنج کے لئے نہیں حق تعالیٰ کے اوامر و احکام کے امتثال کے لئے زندہ رہتا ہے، جاہ و حشمت کے لئے نہیں، اس کا مرنا بھی حق تعالیٰ ہی کے لئے ہے، خوف، رنج سے نہیں ہم و غم سے نہیں،

بہر یزدان می زید نے بہر گنج | بہر یزدان می مرد نہ خوف و رنج
انگہاں خندد کہ او بیند رضا | ہمچو حلواے شکر او را قضا (رومی)

لا الہ کو بے دلیل و برہان اذر وے جان ماننے کا نتیجہ یہ ہوا کہ قلب میں حق تعالیٰ کی محبت و عشق کی آگ سلگ گئی خودی بیدار ہوئی، عمل کی دنیا آسان ہو گئی، علم میں وسعت پیدا ہو گئی، قلب میں محبت و سرور کا نشہ اٹھا، نفس کا تزکیہ دل کا تصفیہ روح کا تجلیہ ہو گیا، رذائل اخلاق صفاتِ حسنہ میں مبدل ہو گئے، لا متناہی ترقی کی راہ کھل گئی، زندگی لذت پرواز کا نام ہو گیا! یہ ہیں وہ اقدار اور اقدار کے حصول کی راہ جو اقبال عصر حاضر کے نوجوانوں کے آگے پیش کرتا ہے، خدا ہمیں فہم سلیم عطا کرے، اور ان اقدار کے تحقق کی توفیق دے، اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى،

---

[۱] حدیث: اِيَّاكُمْ والطمع فانّه الفقر الحاضر (جاوید نامہ ص ۲۴۵)

[۲] تمام صفاتِ قبیحہ سے قلب کا تزکیہ لا الہ الا اللہ کے ماننے اور اس پر عمل پیرا ہونے سے کس آسانی سے ہو جاتا ہے یہ معلوم کرنا ہو تو دیکھو میرا رسالہ "قرآن اور سیرت سازی" مطبوعہ معارف پریس اعظم گڑھ۔

[۳] ضعف ایمان است و دلگیری است غم | نوجوانا! نیمہ پیری است غم
(تلمیح بحدیث مشہور: الهمّ نصف الهرم (جاوید نامہ صفحہ ۲۴۵)

کی جنت ہے"

اے آر ہوپ مونرف (A. R. Hope moncriff) نے آج کی دنیا (The world of Today) میں ان جزائر کا اس طرح نقشہ کھینچا ہے :-

"دنیا کے کسی گوشہ میں فطرت کی گلکاریاں اس قدر مسحور کن نہیں جس قدر ملایا کا مجمع الجزائر ہے، فطرت سے اور بے نظیر حسن اور عجائبات کے متلاشی کے لئے وہ اپنے اندر دلچسپیوں کا بڑا سامان رکھتا ہے، سیاح اور شعراء کے رنگین ترین الفاظ بھی اس کے دلکش استوائی سمندر اور کنول سے لدے ہوئے ساحلوں کا ایسا نقشہ کھینچنے سے قاصر ہیں، اس کے دلفریب مناظر دیکھنے کے لئے Tenyson جیسی شخصیت بھی اس استوائی خطے میں سیر کرنے کی آرزومند تھی، استوائی جزیروں میں جاوا سب سے دولت مند اور مشرق کا باغ ہے"۔

ہندوستان کے پرانے صحیفوں "Brhut Katha" اور "Katha Kosa" Jatak کے اوراق میں سونے کا ملک یا سونے کا جزیرہ کے نام سے اب بھی اس کا تذکرہ ملتا ہے،

آبادی | ماہرین علم الاقوام کی رائے انڈونیشی باشندوں کی نسل کے بارہ میں مختلف ہے، کوئی انھیں نوسیلی (Fossil Man) نسل سے بتاتا ہے، کسی نے کالاپرنگ نسل سے کہا ہے، بعض نے منگول اور آسٹرالینو بتایا ہے، ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، کہ ان باشندوں کا اصلی مسکن انڈوچائنا تھا، آریوں کی مزاحمت سے وہ لوگ جزائر میں منتشر ہو گئے، یہ سب رائیں اپنی جگہ پر صحیح ہو سکتی ہیں، لیکن اس کا بھی امکان ہے، کہ کچھ لوگ ادھر ادھر سے آکر یہاں آباد ہو گئے ہوں اور بعد میں کسی سیاسی دباؤ نے ان سب کو ایک رشتہ میں منسلک کر دیا ہو، اور وہ آپس میں گھل مل کر ایک نسل بن گئے ہوں، بہر حال یہاں کی قدیم آبادی جس قوم سے بھی تعلق رکھتی ہو، قدیم تاریخوں کی چھان بین اور علمائے یورپ کے متفقہ بیان سے اتنی بات تو پایۂ تحقیق کو پہنچ چکی ہے، کہ انڈونیشیا کی آبادی ایک ہی نسل سے ہے، محققوں نے یہاں کے باشندوں کی تقسیم تین گروہ میں کی ہے،

(۱) اصلی ملایو (Prota malay) ان کا مرکز جزیرہ سماٹرا ہے، یہ شروع سے لے کر اب تک مختلف حیثیتوں سے ترقی کے منازل طے کر رہے ہیں، اور وہ تقریباً سارے جزائر میں پھیل گئے ہیں، ان کی آنکھ، بال اور چہرے کی ساخت منگول کے مشابہ ہے، قد میانہ اور رنگ گندمی مائل بہ سفیدی جسم کم و بیش گٹھیلا ہوتا ہے، جزائر کی تقسیم اور مقامات کے اختلاف سے وہ قدرتی طور پر مختلف گروہوں میں بٹ گئے ہیں، ان میں آچینہ گایو لیونگ (سماٹرا کے) سونڈا اور مدورا (جاوا کے) بنجر (بورنیو کے) اور بوگیس (سلیبس کے) مشہور ہیں،

(۲) غیر مہذب گروہ (Primitive) یہ جزائر کے گلزار جنگلوں اور دور دراز پہاڑوں میں آباد ہیں، یہ لوگ رفتہ رفتہ نئی روشنی میں قدم رکھ رہے ہیں، باتک، شاکی "شامنگ" اور تانگ ملایا، اور سماٹرا میں اور ایک بورنیو میں پائے جاتے ہیں،

(۳) نیگرٹیو (Negrito) یہ غیر مہذب گروہ کی ایک شاخ ہے، گو یہ آپس میں مختلف ہیں، لیکن ان کی عام خصوصیات بالکل یکساں ہیں، نیوگنی میں اپاپوا، اور ان کی خاص تعداد جزائر ملوکو اور شمالی سلیبس میں پائی جاتی ہے،

ان کے بال گھونگر والے اور رنگ سیاہ ہوتا ہے جنگلی جانور اور پھل ان کی غذا ہے، ان کے متعلق محققون کی تین رائین ہین

(۱) یہ جزائر کے اصلی باشندے ہین،

(۲) خاص ایشیائی خطہ (Asia main land) کے اصلی باشندے ہین،

(۳) افریقہ سے آئے ہوئے قبائل ہین، یہ آخری رائے سب سے زیادہ قابلِ قبول مانی جاتی ہے،

اقتصادیات | قدیم زمانہ مین ان جزائر کی اقتصادی اہمیت اتنی زیادہ تھی، کہ وہ سونے کے ملک یا سونے کے جزیرہ کے نام سے یاد کئے جاتے تھے، اور اب تو ان کی اہمیت اتنی بڑھ گئی ہے، کہ Dorothy woodman ان کے متعلق یون لکھتا ہے، کہ

"بحرالکاہل کے یہ ہزارون جزائر موجودہ اقتصادی دنیا مین بہت بڑی اہمیت رکھتے ہین، ان کی پیداوار یورپ اور امریکہ کے کروڑون آدمیون کی اقتصادیات پر اثرانداز ہوگئی ہے"

چونکہ وہ خطِ استوا پر واقع ہین، اس لئے خاص طور پر استوائی پیداوار کا خزانہ ہین، اور وسائل کے لئے شکر، کافی زہر، ناریل، سنکونا، تمباکو، سیاہ مرچ اور دیگر مصالحے ان کی مشہور پیداوار ہین، تقریباً ہر جگہ ان کی بہت بڑے پیمانہ پر کاشت کیجاتی ہے، اگر ضرورت پڑے تو یہ جزائر ساری دنیا کے لئے ربڑ اور شکر مہیا کرتے ہین، تمباکو، ۲۰ ہزار ٹن سیاہ مرچ ۳۰ ہزار ٹن، ناریل چار لاکھ ٹن، کم و بیش ہر سال ان جزائر مین پیدا ہوتے ہین امریکی ربڑ کمپنی (U.S.A (Good year Tire & Rubber & Tire Stone Tire Rubber Co) ان جزائر کے ربڑ کے چوتھائی حصہ پر قابض ہے، دنیا کی ربڑ کی تمام پیداوار کا نصف سے زیادہ حصہ صرف ملایا سے حاصل ہوتا ہے Murray Oulton نے یہ لکھا ہے کہ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ اگر سماٹرا کی پوشیدہ دولت کا استعمال کیا جائے اور اس کی زرخیز زمین کی کاشت کی جائے، تو وہ ساٹھ یا ستر ملین باشندون کی کفیل ہوسکتی ہے، ممالک متحدہ کی درآمد ۱۹۳۹ء مین ان جزائر سے ۹۹ فی صدی کونین، ۶۲ فی صدی کو ہو کا، فی صدی بکری کے چمڑے اور ۷۰ فی صدی تو ہو کا ہے، ان پیداوارون کے علاوہ انڈونیسا معدنیات کے لحاظ سے بھی کم نہیں ہے، یون تو Balikpapan Taaakan Tandjoely PURA PALEMBANG تیل کے لئے اہم جگہ ہے لیکن اس کے علاوہ بھی جگہ جگہ تیل کے چشمے ہین جس قدر تیل رومانیا اور ایران مین نکالا جاتا ہے، اس سے کہین زیادہ بورنیو مین نکلتا ہے، امریکی تیل کمپنی (No 20) Standard oil Co) کے (Jersey & California) کے ذریعہ جزائر کے تقریباً ۴۰ فی صدی تیل کے منافع حاصل کرتی ہے، (Bunka Malay Peninsula اور Belliton) ٹین کا خزانہ ہی، یہان سے تیس ہزار ٹن سالانہ برآمد ہوتا ہے، دنیا بھر مین جس قدر ٹین ملتا ہے، اس کا تہائی حصہ ملایا سے نکلتا ہے، لوہے کوئلے سونے، چاندی اور ہیرے کی کانین بھی یہان پائی جاتی ہین، ۱۹۳۵ء مین صرف جزیرہ نمائے ملایا سے 29000 آونس سونا نکالا گیا ہے، (Murray Oulton) نے سماٹرا کے متعلق لکھا ہے، کہ اس کا معدنی ذخیرہ بہت زیادہ مشہور رہے، لیکن یہ بھی سائنٹفک استعمال کا منتظر ہے اگرچہ حال ہی مین تیل کی نکاسی بہت بڑھ گئی تھی وہان قیمتی کوئلہ کا خزانہ ہے تانبے ٹین، لوہے جیسی معدنیات کے ساتھ ساتھ بیش قیمت دھات سونا اور چاندی بھی ملتی ہے، الغرض جزیرہ سماٹرا مین ہر وہ چیز موجود ہے جس سے وہ دنیا مین ایک امیر ترین ملک بن سکتا ہے،

جزائر کی یہ ساری پیداوار اور خام اشیا سنگاپور کے بازار مین یکجا ہوکر ساری دنیا کے مختلف حصون مین تقسیم ہوتی ہین، Dudley Stamp نے لکھا ہے، کہ جاوا ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے، لیکن اس کے باوجود بھی یہان کی تجارتی برآمد کلکتہ کی تجارتی برآمد سے زیادہ قیمتی ہے، انڈونیسا کی تمام اشیا کا ٹھیکہ باہر والون کے ہاتھ مین ہے، اور قابل افسوس بات یہ ہے، کہ ان مین یہان کے باشندون کا کوئی حصہ نہین، غرض ان جزائر کے گران مایہ ذخائر اقتصادی دنیا کے اہم ترین عنصر ہین،

سنہ ۱۶۰۲ء مین ڈچ ایسٹ انڈیز کمپنی (۱) (Dutch East Indies) کی بنیا دپڑی، اس کا خاص مقصد انڈونیسا مین تجارت اور اس سے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کرنا تھا، اس کو ملکی انتظام سے کوئی سروکار نہ تھا، بلکہ ان مین اس کی صلاحیت ہی نہ تھی، البتہ تجارتی مفاد کے لئے وہ مقامی عہدہ دارون پر اپنا تسلط جماتی تھی، یہ لوگ ولی عہد (Regent) یا نائب حکومت کہے جاتے تھے، کمپنی کے لئے قلی اور کارندے مہیا کرتے تھے، انامیون (۱) نے انڈوچائنا کی کاشت مین چاول کی پیداوار بڑھا کر فرانس کے لئے سرمایہ فراہم کیا، ایونہ (؟؟ ؟؟) کے مزدورون نے برطانیہ کے لئے اقبالمندی کا سامان تیار کیا، اورجاوا کے نہتون نے تیل کے کنوین کھود کرڈچ والون کی زندگی کا معیار بلند کردیا،

اس سے انڈونیسا کو فائدہ ضرور پہونچا، اس لئے کہ پڑتی زمینین بڑے پیمانہ پر کاشت کی جانے لگین، بڑے بڑے صنعتی کارخانے قائم ہونے لگے، کان کنی کی وجہ سے پہاڑی اور ویران مقامات آباد ہوگئے، بے شمار بندرگاہون کی تعمیر عمل مین آئی جس مین یورپ، امریکہ، آسٹریلیا اورجاپان کے بڑے بڑے تجارتی جہاز لنگر انداز ہوتے تھے، اس سے انڈونیسا کی رونق روز بروز بڑھتی گئی، اور سچ تو یہ ہے، کہ انھین کی بدولت انڈونیسا کی سرزمین دولت اگل رہی ہے، لیکن اصلی باشندون کی حالت یہ ہے کہ وہ دانہ دانہ کے محتاج اور آبادی چھوڑ چھوڑ کر غیر آباد جگہون مین سکونت اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے..........

انیسوین صدی کے وسط مین وہان ایک زبردست قحط پڑا، جس مین باشندون کی بڑی تعداد ضائع ہوگئی، کمپنی کی یہ پالیسی کسی حالت مین بھی اچھی نگاہون سے دیکھی نہین جاسکتی ہے، کہ اوس نے اپنے تجارتی مفاد کے مقابلہ مین باشندون کی فلاح وبہبود کی قطعی پرواہ نہ کی، اور اسی لئے جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی رفتہ رفتہ حکومت برطانیہ مین منتقل ہوگئی، اسی طرح ڈچ ایسٹ انڈیز کمپنی، ڈچ مشرقی مجمع الجزائر کے موجودہ نظام حکومت مین منتقل ہوگئی،

بٹاویا کے ابتدائی جمہوری عہد مین انقلاب فرانس کے اثرات نظر آنے لگے تھے، چنانچہ ڈچ ایسٹ انڈیز کمپنی کی نااہلی و ناانصافی Home Parliament مین پیش کی گئی، اس پر غور کرنے کے لئے سنہ ۱۸۱۸ء مین گورنمنٹ نے کمیشن اس ہدایت کے ساتھ مقرر کیا، کہ جن اصول اور طریقون پر مقبوضہ ممالک کی تجارت ہونی چاہئے، وہ ایسے ہون جو جزائر شرق الہند کے لئے عظیم ترین فلاح وبہبود اور سرکاری تجارت نیز ملکی مالیات کے لئے سب سے زیادہ منافع پیدا کرین؟

پھر رفتہ رفتہ گورنمنٹ کی جانب سے کئی ترمیمات ہوئین، ان مین سنہ ۱۸۵۳ء کا قانون ڈچ آبادکاری کی تاریخ مین انقلاب آفرین واقعہ (Land mark) کی حیثیت رکھتا ہے، انیسوین صدی مین انقلاب روس کا اثر اس ملک پر بھی پڑا، چند حریت پسند رہنماؤن نے آبادکاری کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی کہ وہ عام دلچسپی کا باعث بن گیا، نتیجہ سنہ ۱۹۰۱ء کا یہ فرمان کہ اہل جاوا کی فلاح وبہبود کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جائے گا" اسی کا نتیجہ تھا، کانفرن دو صدی حکومت

---

(۱) انڈوچائنا کا باشندہ ۔ (۲) Spuk ملایا مین ٹین کی سب سے مشہور کان کا نام ہے،

حکومت کرنے کے بعد ۱۹۰۰ء میں پہلی بار ہالینڈ گورنمنٹ نے براہ راست انڈونیسیا کے لئے ۴۰ ملیون ([illegible]) کی رقم اس شرط پر دینی منظور کی، کہ اس کو پندرہ سال کے اندر جاوا اور مدورا کی اقتصادی ترقی میں صرف کیا جائے،

سیاست انڈونیسیا کی سیاسی حیثیت ایک بڑی تاریخی اہمیت رکھتی ہے، اس پر ایسے ایسے فرمانرواؤں نے حکومت کی ہے جن کی اہمیت سلطنت کے رقبہ اور فتوحات کے لحاظ سے کسی طرح قدیم بڑے بڑے حکمرانوں سے کم نہ تھی، مغرب میں ہندوستان تک شمال میں فلپائن و جزیرہ نمائے کوریا تک مشرق اور جنوب میں دیگر جزائر تک ان کی سلطنت پھیلی ہوئی تھی، ان کا جنگی بیڑا اپنے وسیع نوآبادیات میں چکر لگاتا رہتا تھا، جو بحر الکاہل اور بحر ہند میں واقع تھے، جاپان، چین اور جزیرہ مڈگاسکر ان کے تجارتی بیڑے کے جولانگاہ تھے،

ہندو عہد جزائر شرق الہند، اپنے خزانوں کی وجہ سے دوسری قوموں کے لئے قدیم زمانہ سے آج تک جاذبیت کا باعث بنا ہوا ہے، ہندوستان کے تاجر اسی دولت کی تلاش میں وہاں پہونچے یہی تجارتی آمد رفت نوآبادیات کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، ہندوؤں کا نوآبادیاتی زمانہ پہلی یا دوسری صدی میں شروع ہو چکا تھا، لیکن ابوزیاد حسن (عربی مورخ) کا بیان ہے کہ ہندوؤں کی عظیم الشان سلطنت جو مجمع الجزائر کے بڑے حصہ اور جزیرہ نمائے ملایا پر حاوی تھی، وہ نویں صدی کے وسط سے لیکر دسویں صدی عیسوی کے اختتام تک پورے عروج پر تھی، چینی اور عربی مورخ دونوں کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دسویں صدی میں صرف "سایلینڈرا" کی زبردست سلطنت کو سیاسی اور تجارتی فوقیت حاصل تھی،

اس کے بعد اندوجادی عہد حکومت شروع ہوتا ہے، اس دور میں سلطنت ماتارام، پجاجارن، تادری اور سنگھاساری خاندان قابل ذکر اور پرشکوہ سلطنتیں تھیں، تیرہویں صدی میں "ماجاپاہیت" کی سلطنت سب سے آخری اور سب سے بڑی تھی جو تقریباً تمام انڈونیسیا پر حکمران تھی، اور اپنی تہذیب و تمدن کے لحاظ سے اور حکومتوں میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ حکومت مانی جاتی تھی، سیاسی، اقتصادی اور علمی حیثیت سے بیرونی انڈونیسیا میں بھی اس کا چرچا تھا، ہندو اور اندوجادی عہد حکومت کی تفصیل ایک ضخیم کتاب کی محتاج ہے، اس موقع پر اتنا لکھنا کافی ہے، کہ ان کے آثار کئی سو سال گذر جانے کے بعد آج بھی انڈونیسیا کے بعض بعض حصوں میں عالیشان مندروں اور بلند بالا بتوں جیسے (Mendoet Boroboedoer) وغیرہ کی صورت میں پائے جاتے ہیں، بلکہ جزیرہ بالی آج بھی ہندو عہد کی زندہ یادگار ہے، اور اندوجادی حکومت مٹتے ہی اسلام کا نیر اقبال طلوع ہوا،

اسلامی عہد انڈونیسیا میں اسلام کی روشنی کب اور کن لوگوں کے ذریعہ پہونچی اس کا قطعی طور پر بتانا ناممکن سا ہے، اس لئے کہ تاریخ کے صفحات اس باب میں خاموش ہیں لیکن جہاں تک قیاس رہنمائی کرتا ہے وہ یہ ہے کہ عرب تاجروں کے ذریعہ یہاں اسلام پہنچا، اہل عرب بہت قدیم زمانہ سے مشرقی ملکوں میں تجارت کرتے تھے، آٹھویں صدی عیسوی کے وسط میں چین کے صوبہ کانٹن میں عرب تاجر کثرت سے نظر آتے تھے، پندرہویں صدی میں جب کہ پرتگال والے ملایا کے جزائر میں پہونچے، تو مشرقی ملکوں کی تجارت پر اہل عرب کو قابض پایا، جو دسویں صدی سے یہاں تجارت کرتے تھے، انڈونیسیا کی بندرگاہوں میں ان کی خاصی تعداد آباد ہوگئی تھی، اور وہاں انھوں نے اپنے مذہب کا بیج بو دیا تھا، ان تجارتی تعلق نے رفتہ رفتہ سیاسی حیثیت اختیار کرلی، اور انڈونیسیا میں ہندو حکومت کے تباہ شدہ کھنڈر پر کئی اسلامی ریاستوں کی بنیاد پڑی، یہ بارہویں و تیرہویں صدی کا زمانہ تھا، اور ملکوں کے برخلاف انڈونیسیا کی اسلامی تاریخ

دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ان جزیرون مین اسلام کی کامیابی مسلمان فرمانرواؤن اور اسلامی مبلغین دونون کی یکجہتی اور پرخلوص کوشش کا نتیجہ ہے، مبلغون نے ان جزیرون مین اسلام کی تخم ریزی کی، اور مسلمان فرمانرواؤن کے ہاتھون اس کی آبیاری ہوئی، ابن بطوطہ کے سفرنامہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سماٹرا کے سلطان سمرانے شاہان دہلی سے دوستانہ تعلقات پیدا کرلئے تھے، اس سلطان کے دربار مین دو فقیہ موجود تھے، ان مین ایک شخص شیرازی اور دوسرا اصفہان کا باشندہ تھا، ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے اپنی کتاب اشاعتِ اسلام مین لکھا ہے کہ مسلمانون نے اندونیسیا مین اشاعتِ اسلام کے ساتھ ساتھ معاشرتی اصلاحین بھی کین، لیکن ان کے اندر فاتحانہ نخوت و پندار اور شاہانہ تعلّی و خودستائی نہ تھی، اور نہ انھون نے اپنے اور ہالینڈ کے عیسائی فاتحون کی طرح یہ دعویٰ کیا کہ ہم کسی زبردست قوم کے آدمی ہین، اور ہمین ہر قسم کی سرفرازی و برتری حاصل ہے تاکہ ملک کے باشندون کو ذلیل سمجھ کر اُن پر ظلم کیا جائے، بلکہ مسلمان صرف تاجر کی حیثیت سے یہان آئے اور اپنی لیاقت اور ذہانت اور بہترین تہذیب کی مدد سے اسلام کی خدمت مین مصروف رہے، حکومت کے بل پر لوگون کو آزار پہنچانا یا دولت سمیٹنا ان کا مقصد نہ تھا،

غرض ان مبلغون کی کوششون سے اسلام کی روشنی مختلف سمتون مین پھیل گئی اور یہان کے باشندے اسلام کی دولت سے سرفراز و سربلند ہوتے گئے، یہان تک کہ اب اندونیسیا کی زیادہ آبادی مسلمانون کی ہے، ۷ لاکھ ۳۵ ہزار ۲۶۸ مربع میل کے رقبہ مین، ۸ کروڑ، ۷ لاکھ، ۲ ہزار ۲۳۳ کی آبادی مین تقریباً ۷ کروڑ مسلمان ہین،

یورپین دور سمندری راستہ دریافت ہونے کے بعد جب یورپ والون کے لئے مشرقی ممالک کا دروازہ کھلا تو پہلے پہل پندرہوین صدی کے آغاز مین پرتگال والے پہونچے، پھر اسپین والون کی باری آئی، اور پندرہوین صدی کے وسط مین ہالینڈ کے بحری بیڑے (Cornelis de Houtman) کی زیر قیادت اندونیسیا کی طرف روانہ ہوئے، سولہوین صدی کے آغاز مین جاوا کے شہر Djakarta پر اپنا علم نصب کیا، اور شہر Batavia کی بنیاد ڈالی، جو اندونیسیا کا دار السلطنت تھا، اس کے بعد انگریزون کی آمد ہوئی، ان کے علاوہ چینیون نے بھی بڑی تعداد مین اندونیسیا کی آبادی مین اضافہ کیا، لیکن قسمت نے یہ موقع صرف اہل ہالینڈ کو دیا، کہ وہ بحیثیت حکمران اتنے دنون تک اندونیسیا کی سرزمین پر اپنا جھنڈا لہراتے رہے،

۱۹۲۳ء کے دستوری قانون کی رو سے شرق الہند ڈچ سلطنت کا ایک مستقل جز مان لیا گیا، اور اس دن سے حکومت کی باگ براہ راست تاج ہالینڈ کے ہاتھ مین منتقل ہوگئی، گورنر جنرل کا تقرر جس کے اختیارات اور جس کا عہدہ ہندوستان کے وائسرائے کے برابر ہے، براہ راست تاج ہالینڈ کے اختیار مین ہے، اور وہی ملک کے نظم ونسق کا ذمہ دار ہے، اس کا صدر مقام (Headquarter) بٹاویا (Batavia) کا شہر ہے، گورنر جنرل کی ایک کونسل ہے جو ایک وائس پریسیڈنٹ اور چار ممبرون پر مشتمل ہے، ان مین سے ایک ممبر اندونیسی ہوتا ہے، یہ لوگ نظم ونسق کے تجربے کے لئے منتخب ہوتے ہین، اس کے علاوہ آٹھ اور شعبے ہین، جنگی، سمندری، عدالتی وغیرہ، ہر ایک شعبہ کا ایک ڈائرکٹر ہے، جو گورنر کی طرف سے ان شعبہ جات کا ذمہ دار ہوتا ہے، بقیہ حصون مین ریزیڈنسی طریقہ رائج ہے، ہر ریزیڈنسی ایک ڈچ ریزیڈینٹ کے ماتحت ہوتی ہے، لیکن جاوا متعدد ریجنسیون پر منقسم ہے، ان مین سے ہر ایک ریجنسی مقامی نواب (Native Regent) کی ماتحتی مین ہے، اس کا ایک حصہ مقامی ریاست (Native State) ہے جو محدود

خود اختیاری حکومت کی حیثیت رکھتی ہے،

انڈونیسیا کی الگ اپنی پارلیمنٹ ہے، جس کو فولکسراد (Volksraad) کہتے ہین، اس کا پہلا اجلاس ۱۹۱۸ء مین ہوا تھا، فولکسراد صرف مشاورتی مجلس ہے، انتظامی امور سے اس کو عملی تعلق نہیں، سال مین اس کے دو اجلاس ہوتے ہین؛ ان مین سے ایک خاص بجٹ کے لئے ہے،

انڈونیسیا کی سیاسی اہمیت کا اندازہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کے سابق سکریٹری آف اسٹیٹ مسٹر Cordell Hull) کے اس بیان سے ہوسکتا ہے، جو انھون نے اپریل ۱۹۴۰ء مین دیا تھا، کہ نیدرلینڈ انڈیز کی سیاسی حیثیت مین کوئی تبدیلی براہ راست بہت سے ممالک کے مفاد پر اثر انداز ہوگی، کیونکہ بحرالکاہل کے بین الاقوامی سیاسی تعلقات مین یہ جزائر بڑی اہمیت رکھتے ہین، ان جزائر کی اندرونی زندگی یا اوس کی موجودہ سیاسی حیثیت کو برقرار رکھنے کی کوشش کی بنیاد اگر صلح و آشتی کے علاوہ کسی چیز پر ہوئی تو نہ صرف ان جزیرون کا امن وامان اور سکون خطرہ مین پڑ جائے گا، بلکہ اس کی لگائی ہوئی آگ سارے بحرالکاہل کے سکون کو جلا کر خاکستر کردیگی،

قومی تحریک انڈونیسیا مین جذبۂ قومیت کے ابھرنے کا باعث یہان کی غیر ملکی حکومت ہے، اٹھارہوین صدی کے آخر مین یہان ڈچ حکومت قائم ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب یورپ مین قومیت اپنی پوری نشو ونما کو پہنچ چکی تھی، انقلاب فرانس سے قومیت کی تاریخ مین ایک نئے باب کا اضافہ ہوا تھا، ان قومون کی بڑھتی ہوئی طاقت نے قومی خودغرضی کو قومیت کا معیار قرار دے رکھا تھا، اور دنیا کی کمزور اور غیر منظم قومین اس خودغرضی کا نشانہ بن رہی تھین قومیت کا نصب العین اقتصادی منفعت، سیاسی طاقت اور حکومت تھا، چنانچہ اسی نصب العین کے ماتحت انڈونیسیا پر بھی قبضہ کیا گیا، اور دوسرون کے قومی مفاد کی خاطر انڈونیسیا کے مقاصد پس پشت ڈال دیئے گئے، ۱۸۶۸ء مین جاپان مین زبردست انقلاب ہوا، اور نصف صدی کے مختصر عرصہ مین جاپان دول عالم کی صف اول مین شامل ہوگیا، ۱۹۰۵ء مین روس کی سلطنت سے اس کا تصادم ہوا، اور وہ جزیرہ نمائے کوریا پر قابض ہوگیا، پورٹ آرتھر مین توپون کے دھماکون نے ساری دنیا کو چونکا دیا، اور مشرقی اقوام اس آواز سے جاگ اٹھین، انڈونیسیا جو اس کا قریبی پڑوسی ہے، اس سے زیادہ متاثر ہوا، جنگ عظیم کے بعد انقلاب روس رونما ہوا، جو انڈونیسیا مین بڑی حد تک جذبۂ قومیت کا محرک ہوا، چینیون کی بڑھتی ہوئی آبادی، اور دوسری قومون کی دست درازیون نے بھی انڈونیسیا کے جذبۂ قومیت کی آبیاری کی،

ڈچ شہنشاہیت کے دوسوسالہ دور مین انڈونیسیا اقتصادی اور معاشرتی دوڑ مین دوسرے ملکون سے بہت پیچھے رہ گیا تھا، اس لئے بیرونی حکومت کا بوجھ انڈونیسیا والون کو کھلنے لگا، اور ان مین آزاد اور بااختیار ہونے کا جذبہ کام کرنے لگا، قومیت کا تصور انڈونیسیا والون کے دماغ مین جگہ پانے لگا، اور ان مین عام بیداری پیدا ہونے لگی، ملکی ادب وثقافت کو زندہ کیا جانے لگا، قومی زبانون کو ترقی ہونے لگی، مذہبی سرمایہ کو قومی زبانون مین منتقل کیا جانے لگا، ماضی کی بھولی ہوئی روایات کی یاد تازہ کی جانے لگی، غرض ملک مین ایک عام معاشرتی اصلاح کی کوششین شروع ہوگئین، اور اسی کے ذریعہ قومی تنظیم وجود مین آئی، اور بیرونی حکومت سے جمہوری حکومت کا مطالبہ کیا گیا، مغربی تعلیم وتہذیب کے اثر سے انڈونیسیا والون مین ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس نے اصلاح معاشرت کی طرف قدم بڑھایا، چنانچہ ۱۹۰۸ء مین انجمن بودی اوتومو (Budi Utomo) کی بنیاد پڑی، گو یہ انجمن شروع مین ایک ادبی انجمن تھی،

اور اس کا حلقہ جاوا کی ایک مختصر جماعت تک محدود تھا، لیکن بعد میں اس نے سیاسی حیثیت اختیار کر لی، اور اس کی وسعت رفتہ رفتہ بڑھتی گئی، یہان تک کہ ملک کی دوسری سیاسی جماعتین اسی انجمن کی شرمندۂ احسان ہین، قومی جماعتون مین شرکت اسلام، انڈونیشیا قومی لیگ اور انڈونیشیا اتحاد المسلمین قابل ذکر ہین، شرکت اسلام نے ۱۹۲۳ء میں فلکسرا دہ (Partija men) کے خلاف عدم تعاون کی تجویز پاس کی ۱۹۲۶ء مین انڈونیشیا کمیونسٹ پارٹی نے جاوا مین اور ۱۹۲۷ء مین سماٹرا کی سرزمین مین حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا، ۱۹۲۹ء مین بودی انومونے حکومت سے مکمل آزادی کا مطالبہ کیا، اسی طرح سے دوسری قومی جماعتین بھی اپنی حیثیت کے مطابق جنگ آزادی مین ہاتھ بٹاتی رہین، قومی تحریک کی بدولت انڈونیشیا کی سیاسی فضا مین ہر طرف قومی بیداری کے مظاہر نظر آنے لگے،

زبان جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، انڈونیشیا میں مختلف زمانون مین مختلف قومین آتی رہین، اس لئے فطری طور پر وہ مختلف تہذیبون کا مقام اتصال بن گیا، اور یہ تہذیبین نہ صرف انڈونیشیا والون کے عقیدہ، رسم و رواج اور آرٹ پر اثر انداز ہوئین، بلکہ اس کی زبان و ادب بھی ان سے متاثر ہوئے، اسی لئے انڈونیسی ادب مین دنیا کی مختلف تہذیبون اور تمدنون کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے،

انڈونیشیا کئی جزیرون کا مجموعہ ہے، ہر جزیرہ کی الگ الگ بولی ہے، ایک صوبہ کی زبان دوسرے صوبہ سے جدا ہے، یا کم سے کم لب و لہجہ تلفظ اور طرز گفتگو مین اختلاف ہے، ان زبانون مین زیادہ مشہور ملایو، جاوی، بوگیس، باتک اور آچینہ زبانین ہین، اور ہر زبان اپنا رسم الخط اور ادب رکھتی ہے، لیکن ان سب مین صرف ملایو زبان ایسی ہے جو صدیون سے انڈونیشیا مین قریب قریب بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے، اور وہ لوگ جن کی بولیان الگ الگ ہین کسی نہ کسی حد تک یہ زبان بولتے اور سمجھتے ہین، اب انڈونیسی قوم کی تحریک بیداری کو جس کی کوشش ہمیشہ سے یہ رہی ہے کہ انڈونیسی باشندون کی سعی و عمل کو متحد کیا جائے، ایک ایسی زبان کی ضرورت محسوس ہوئی، جو سب فرقون، جماعتون اور گروہون کے درمیان مشترک ہو، اور قومی تحریک کے مقاصد کی ترجمانی کر سکے، چونکہ انڈونیشیا ایک ایسا نام ہے، جو احساس وحدت اور جذبہ اتحاد کا صحیح ترجمان ہے، اس لئے جزائر ملایو کا نام انڈونیشیا رکھ دیا گیا، اور اس کی نسبت سے اس کی زبان بھی انڈونیسی زبان بن گئی، یہ تبدیلی جذبۂ قومیت کی پہلی جیت تھی، قومی وحدت کے لئے اتحاد زبان ضروری ہے، اور ملایو زبان عرصۂ دراز سے تمام جزائر کی مشترکہ زبان تھی، اس لئے وہی قومی زبان قرار پائی، اور اس کا نام ملایو زبان کے بجائے انڈونیسی زبان رکھ دیا گیا، ملایو زبان ایک حد تک تنگ و محدود تھی، لیکن اب انڈونیسی زبان نے اپنا دامن اتنا وسیع کر لیا ہے جتنی ایک قومی زبان کے لئے ضرورت ہے، اس کے الفاظ صرف سنسکرت اور عربی ہی زبان سے نہین لئے جاتے، بلکہ جزائر انڈونیشیا کی سب مقامی بولیان اور مغرب کی ساری زبانین خاصکر ڈچ زبان انڈونیسی زبان کا ماخذ ہین،

ملایو زبان کے انڈونیسی زبان بننے کے ساتھ ہی رسم الخط کا سوال بھی پیدا ہوا، اس کا پہلا رسم الخط عربی تھا، لیکن نام کے بدل جانے سے اس کی پہلی خصوصیت اور حیثیت باقی نہین رہی، وہ تمام انڈونیشیا کی واحد زبان تسلیم کر لی گئی، اس لئے عربی رسم الخط اب مناسب نہین رہا، انڈونیشیا مین جو مختلف زبانین رائج تھین، ان سب کے رسم الخط الگ الگ تھے، اگر انڈونیسی زبان کے لئے عربی رسم الخط اختیار کیا جاتا، تو اس قسم کے اختلافی سوالات پیدا ہونے کا امکان تھا کہ جاوی زبان کا رسم الخط کیون نہ اختیار کیا جائے، جب کہ اس رسم الخط کے جاننے والے کافی لوگ ہین، اس قسم کے صوبجاتی

سوالات کو جو ہر تحریک کے لئے خطرناک ثابت ہوتے ہیں، روکنے کے لئے تعلیم یافتہ گروہ اور انڈونیشی تحریک کے لیڈروں نے عربی حروف کے بجائے رومن حروف کو انڈونیشی زبان کے رسم الخط کی حیثیت سے پسند کیا، اس نازک مسئلے کو بہت احتیاط سے حل کیا گیا، اور بغیر کسی مخالفت کے آہستہ آہستہ رومن رسم الخط انڈونیشی زبان کا رسم الخط بن گیا، انڈونیشی زبان کے لئے رومن حروف اختیار کرنے کی یہ مصلحت بھی تھی، کہ وہ عربی حروف اور صوبجاتی زبانوں کے حروف کی بہ نسبت انڈونیشی زبان کی آوازوں اور لہجوں کو زیادہ بہتر اور زیادہ مکمل طور پر ظاہر کرتا ہے، اور رومن حروف کا سیکھنا بھی زیادہ آسان ہے، انڈونیشی زبان خود بھی سادہ اور آسان زبان ہے، اس رسم الخط کی بدولت انڈونیشی زبان کی مقبولیت اور بڑھ گئی ہے، وہ بہت جلد سارے انڈونیشیا کی بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے پھیل گئی،

ادب انڈونیشیا پر قدرت کی نوازشیں بے شمار ہیں، آب و ہوا نہایت خوشگوار ہے، کثرتِ بارش کی وجہ سے سارا ملک گھنے جنگلوں سے بھرا پڑا ہے، انڈونیشیا کی سرزمین میں بے انتہا نشیب و فراز ہیں جس میں شاندار پہاڑیاں، شاداب وادیاں، دلآویز ندیاں، نظر فریب آبشار اور بے نظیر ساحلی پیچ و خم پائے جاتے ہیں جن سے حسن مناظر کے علاوہ آبپاشی اور نقل و حمل میں بڑی امداد ملتی ہے، اور وہ بہترین بندرگاہ کے لئے بہت موزوں جگہ ہے، اس کے مناظر کے حسن و خوبی نے لوگوں کی سیرت، اخلاق و عادات اور رسم و رواج پر غیر معمولی اثر ڈالا ہے، ان کی روایات، ان کی تاریخ، ان کا فلسفہ، ان کے فنون لطیفہ سب اسی فطرت کی فیاضی کے زیر سایہ پیدا ہوئے ہیں، اس کے علاوہ اس کا اجتماعی ماحول، چین، ہندوستان، فارس اور عرب جیسے تمدن کے قدیم گہواروں کی مختلف تہذیبوں سے متاثر ہے، اس ماحول نے کچھ نہ کچھ جزوی طریقہ پر سہی انڈونیشی باشندوں کے احساسات جذبات اور خیالات پر بھی اثر ڈالا ہے۔

قدیم انڈونیشی ادب میں جمود و تعطل کے سوا کوئی اور چیز دکھائی نہیں دیتی، اور اس کا قدیم ادبی سرمایہ زیادہ تر ایسے قصے کہانیوں پر مشتمل ہے جو حیرت انگیز واقعات اور تعجب خیز حادثات سے پُر ہیں، اس کو علمی معلومات، اصلاحی پروگرام اور سماجی معاملات سے کوئی تعلق نہیں، اس میں یا تو محض دیو اور پریوں کی کہانیاں تھیں، جو ہندو مذہب کی روایات میں ملتی ہیں، یا الف لیلہ کے قصے اور امیر حمزہ کی داستان لیکن موجودہ ادب کا مطمح نظر تمام تر اصلاحی ہے، اس میں مذہبی، علمی، سیاسی، ادبی ہر قسم کا لٹریچر موجود ہے، جذبۂ حب الوطنی اور انقلاب کا علمبردار ہے، اس کا اسلوب نہایت آسان اور سہل ہے، نثر نگاروں میں بعض اہل قلم قدیم لٹریچر سے متاثر ہیں، بعض مغربی ادب کے دلدادہ ہیں، کچھ ایسے بھی ہیں، جن کی توجہ تمام تر صوبجاتی ادب کی جانب ہے، لیکن سب کے سب ایک ایسی راہ کی تلاش میں ہیں جس کے ذریعہ وہ اپنے خیالات کے تلاطم کا اظہار موزوں طریقہ سے کر سکیں، نظم کا بھی یہی حال ہے، غیر مانوس ترکیبوں، پیچیدہ اور دقیق استعاروں، مبہم اور دور از قیاس تشبیہوں، لغو اور بعض موضوعوں کو جو خاص پرانی شاعری کی خصوصیات ہیں، چھوڑ کر ادب میں جدت پیدا ہو رہی ہے، اس وقت کا ادب انقلابی خیالات، حب الوطنی کے جذبات، قوم کی زبوں حالی کی دلسوز فریاد، اور شاندار مستقبل کے ولولہ انگیز پیامات سے لبریز ہے نظم، غزل، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ہر صنف میں تجدید و اصلاح نظر آتی ہے، اور سائنٹ کا مذاق بڑھ رہا ہے، یہ تمام اصلاحات جدید اثرات کا نتیجہ ہیں، انڈونیشیا کے جدید شعراء تعلیم و تربیت، اعتقاد و مذہب، رنگ و نسل، وضع و قطع، مشاغل و مصروفیت اور طرز زندگی وغیرہ کے اختلاف کے باوجود صرف ایک انقلابی نظریہ رکھتے ہیں، روزنامہ اخبارات، ماہانہ رسالے، ہفتہ وار اور سہ روزہ اخبارات کافی تعداد میں نکلتے ہیں، اور مختلف النوع

کتابون کی اشاعت دن دونی رات چوگنی ہو رہی ہے، اگرچہ دوسری ترقی یافتہ زبانون کے مقابلہ مین ابھی اس کی رفتار سست ہے، تاہم پہلے سے بہت زیادہ ہے، مختلف علوم و فنون کو بھی انڈونیسی زبان مین منتقل کرنے کی کوشش جاری ہے، اور وہ دن دور نہین جب وہ علمی حیثیت سے ایک ممتاز درجہ حاصل کرلے گی،

تعلیم | ہندوؤن کے دور حکومت مین سنسکرت زبان کی اشاعت و ترقی سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہان قدیم زمانہ مین تعلیم کا اچھا خاصہ چرچا تھا، پھر مسلمانون کے عہد زرین مین تعلیم مین مزید ترقی و اصلاح ہوئی، خصوصاً مذہبی تعلیم نے بڑی تیزی کے ساتھ رواج پایا، مسجدین حلقۂ درس بن گئین، جگہ جگہ مدرسے قائم ہوئے، عربی زبان کا شوق صرف عام پبلک ہی تک محدود نہ تھا بلکہ بعض مسلمان فرمانروا بھی اس سے بڑی حد تک متاثر تھے، ابن بطوطہ سلطان سمدرا کے متعلق لکھتا ہے، کہ عربی زبان سے اوس کے شغف اور نظم و نثر مین شوق کا یہ حال تھا، کہ جب کبھی اس کے پاس کوئی عالم ادیب یا شاعر نہ ہوتا تو مکہ و مدینہ کے اکابر علما سے استفادہ کے لئے حجاز چلا جاتا، انڈونیسیا مین عربی زبان سے دلچسپی کا آج بھی یہی حال ہے، وہان کے طالب علم اپنے وطن اور اعزہ و اقربا کو چھوڑ کر سمندر پار محض عربی تعلیم حاصل کرنے کے لئے چلے جاتے ہین، دنیا کے تمام اسلامی مدارس خصوصیت کے ساتھ مصر و حجاز اور ہندوستان کے مدرسون مین ان کی خاصی تعداد ہے،

اسلامی عہد کے آخری دور مین مغرب کی بڑھتی ہوئی طاقت کے مقابلہ مین اسلامی سلاطین کی جنگی مشغولیت کی وجہ سے ملکی فلاح و بہبود کو بڑا نقصان پہنچا، اس سے تعلیم بھی متاثر ہوئی، اور مغربی اقوام کے برسراقتدار ہونے کے بعد ۱۹۲۹ء تک اس کی تلافی نہ ہوسکی، ۱۹۳۰ء مین جاکر پھر تعلیم کا نظام قائم ہوسکا، لیکن وہ ابھی ابتدائی منزل مین ہے، پرائمری اور مڈل اسکولون کے ساتھ چند ہائی اسکول بھی ہین، اور Batavia اور Surabaya مین ٹکنیکل کالج قائم ہوئے ہین ۱۹۴۰ء مین بٹاویا مین یونیورسٹی کی بنیاد پڑی، اس کے علاوہ تجارتی کالج، زراعتی کالج اور مڈیکل کالج بھی کھولے گئے، اس وقت گورنمنٹ کی توجہ سب سے زیادہ حفظان صحت کی جانب ہے، تاکہ انڈونیسیا سے بیماریون خاص کر متعدی امراض کا انسداد ہوجائے، ملک مین نئے طریقۂ تعلیم کا اجرا پہلے پہل پبلک کے ہیجان، اور بے اطمینانی کا باعث ہوا، اور وہ اسکو مشکوک نگاہون سے دیکھتی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نئی تعلیم کو خاطر خواہ فروغ حاصل نہ ہوسکا، اور اس سے ملک کو بڑی حد تک نقصان پہنچا، گو دو چار پڑھے لکھے لوگ پیدا ہوگئے لیکن ان کی حیثیت سرکاری دفاتر کے پرزے سے زیادہ نہ تھی، تاہم اس سے یہ فائدہ ضرور ہوا کہ لوگون مین نئی تعلیم کا شوق پیدا ہوگیا، نئے دور کا آغاز اسی نقطہ سے شروع ہوتا ہے، پھر قومی تحریک کے فروغ نے لوگون کو جدید تعلیم کی طرف زیادہ متوجہ کیا، اور وہ ادارے جو کچھ دنون پہلے شکوک و شبہات کی نظر سے دیکھے جاتے تھے، ان کی کمی شدت کے ساتھ محسوس کیجانے لگی، غیر سرکاری اور پبلک ادارون کا قیام اسی احساس کا نتیجہ تھا، غیر سرکاری ادارے اپنے مقصد مین نصاب تعلیم کے لحاظ سے تین طبقون مین تقسیم کئے جاسکتے ہین، ایک خالص مذہبی، دوسرا خالص عصری، تیسرا دونون مین مشترک،

مذہبی ادارے | انڈونیسیا کی آبادی مین تقریباً ۵۰ فی صدی مسلمان ہین، اس لئے وہان اسلام کی اہمیت مسلم ہے، اسلام ہی نے اہل انڈونیسیا کی ذہنیتون مین انقلاب پیدا کیا تھا، اسی نے ان کی اصلاح کی، اور اس کا اثر اہل انڈونیسیا کی زندگی کے تمام شعبون پر پڑا، اس کا یہ نتیجہ ہے، کہ ان مین تعلیم خصوصیت کے ساتھ مذہبی تعلیم جس تیزی سے پھیل گئی اسکی

مثال ملنی مشکل ہے، یہ اسلامی روح ہی کا اثر ہے، کہ انڈونیسیا مین نہضتہ العلما (جاوا) تربیۃ الاسلامیہ و طوالب (مغربی سماٹرا) اور جمعیتہ وصلیہ (مشرقی سماٹرا) جیسے بڑے مذہبی ادارے موجود ہین، اوران کی شاخین ملک کے مختلف گوشون مین پھیلی ہین، مدارس نصابیہ کے مقابلہ مین مدارس نظامیہ کی تعداد کم ہے، جن مین صرف اسلامی اور ثانوی درجون تک تعلیم ہوتی ہے، اس مین مذہبی لٹریچر اور اسلامی تاریخ کو خاص اہمیت دیجاتی ہے، ذریعۂ تعلیم انڈونیسی زبان ہے،

عصری ادارے | عصری ادارون کے روح رواں وطن پرست ہین، ان کا نظریہ قومیت ہے، ان کا مشہور ادارہ تامن سیوا (Yaman sizwa) ہے جس کا نام انڈونیسیا مین بڑی عقیدت کے ساتھ لیا جاتا ہے، اس کا نصاب تعلیم کم و بیش سرکاری کالجون اور اسکولون کے مساوی ہے، قومیت کے اثر سے ڈچ زبان کے بجائے انڈونیسی زبان اس کا ذریعہ تعلیم ہے، سارے انڈونیسیا مین اس کی شاخین پھیلی ہوئی ہین،

مذہبی و عصری ادارے | ان ادارون مین جمعیت محمدیہ، (Balai Pendidikan Pirgoe roean Rajat) اور (... Raajat) اپنی جامعیت کے لحاظ سے ممتاز ہین، موخر الذکر دونون ادارون کا اثر زیادہ تر جاوا مین اور کم تر دوسری جگہون پر ہے، لیکن جمعیۃ محمدیہ کا اثر سارے انڈونیسیا مین ہے، اس جمعیت کے مقاصد یون تو بہت وسیع ہین، لیکن ان مین دو زیادہ اہم ہین، ایک "اسلاف کے اعمال صالحہ اور اسوۂ حسنہ کی تجدید و احیاء اور دوسرے وقت کے مطابق لوگون کی تربیت" دوسرے "زمانہ کی ترقیون اور ایجادات و انکشافات سے مکمل واقفیت" اس سے متعلق پانچ شعبے ہین، ان مین ایک شعبہ تعلیم کا ہے، اس کے ماتحت دو قسم کے مدارس ہین،

(الف) ایک وہ جن مین دن کے وقت تعلیم ہوتی ہے، ان مدارس کی تعداد تقریباً سات سو ہے، ان مین ابتدائی تعلیم سے لیکر اعلیٰ تعلیم تک کا بہترین انتظام ہے، ان درسگاہون مین دینی و عصری دونون قسم کی تعلیم ہوتی ہے، عصری تعلیم انگریزی یا ڈچ زبان مین دیجاتی ہے، اور دینی تعلیم عربی اور انڈونیسی زبان مین،

(ب) دوسرے مدارس شبینہ جن مین رات کے وقت تعلیم دی جاتی ہے، ان کی تعداد بھی کئی سو ہے،

اس جمعیت کا ایک شعبہ اصلاح نسوان بھی ہے، اس کے ماتحت عورتون کی اصلاح کے لئے ایک انجمن قائم ہے، اس کا نام جمعیت عائشہ ہے، اس جمعیت کے ذریعہ عورتون کو ان کی ضروریات کے مطابق تعلیم دی جاتی ہے، اس میں کم سن اور نوجوان عورتون کے علاوہ بوڑھی عورتون کی تعلیم کا بھی انتظام ہے،

ان خاص خاص ادارون کے علاوہ اور بھی بہت سے پبلک اور پرائیوٹ مدارس ہین جن کی بدولت انڈونیسیا مین ۸ فی صدی تعلیم یافتہ ہین،

خاتمہ | انڈونیسیا کی قیمتی پیداوارون اور اس کی خام اشیاء نے اس کی جانب صنعتی ممالک کی ہوس کو بہت بڑھا دیا ہے، جاپان مشرق کا جدید ترقی یافتہ صنعتی ملک ہے، اس کو نہ صرف اپنی بڑھتی ہوئی آبادی کے توطن کے لئے زمین کی ضرورت تھی، بلکہ خام پیداوار کے حصول اور اپنی مصنوعات کی کھپت کے لئے بازار کا مسئلہ بھی اس کے لئے اہم تھا، مشرق بعید کے وسیع علاقے جاپان کی ان ضروریات کی تکمیل کر سکتے تھے، لیکن جاپان کی بیداری سے بہت پہلے یہان مغربی اقوام کا اقتدار قائم ہو چکا تھا اور اس کے لئے ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع باقی نہ رہا تھا، اس لئے اس نے ان ممالک سے بزور مغربی اقوام کے اثر کو زائل کرنے کی پالیسی اختیار کی، چنانچہ منچو اور چین کے دوسرے زرخیز علاقون پر قابض ہونے کے بعد

اس کی توجہ جزائر بحرالکاہل کی طرف مبذول ہوئی، بحرالکاہل مین جاپان کی جنگی کارروائی بڑی حد تک اسی پالیسی کا نتیجہ ہے،

۷ر دسمبر ۱۹۴۱ء میں مشرق اور مغرب کے تعلقات مین ایک نئے باب کا اضافہ ہوا، جاپانی مغرب کی تمام چالون کو سیکھ کر اس کی حقیقت سے پوری طرح آشنا ہو چکے تھے، جاپانی بم ٹھیک (Prince of wales) پر گرا، ایسا ہی برطانوی بم (Gneisenau) پر پڑا، جاپانی ٹینک ملایا کے جنگلون سے گذرے جن کے بارے مین برٹش جنرل کا عقیدہ تھا کہ وہ ناقابل گذر ہین، گھونگر والے سیاہ فام پاپوا جنھون نے کبھی پہیا (wheel) کی صورت تک نہ دیکھی تھی، ان کے لئے جاپانی غوطہ خور طیارے یورپین ایجادات کا ذریعۂ تعارف ثابت ہوئے، سائنس کی نئی نئی ایجادات و اختراعات کا ادنیٰ مظاہرہ جاپانی فوج کی بدولت ملایا کے ساکی (Sakai) اور سامنگ (Samang) نے حیرت سے دیکھا، بورنیو کے وحشی ڈائک (Dayak) نے جو دنیا کی ترقیون سے بالکل بے خبر جانورون کی کھال پہنے جنگلی شکارون مین مشغول رہتے تھے، جاپانیون کی آتشباری کا ہولناک تماشا دیکھا، مختصر یہ کہ جزائر والون نے گوری فوجون کو جاپانی سنگینون سے پیچھے ہٹتے ہوے دیکھا، اور چند ہفتون کے اندر اندر مغربی اقوام کی ساری کائنات لٹ گئی

قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ سمندر کی حفاظت Prince of wales اور Repulse کے سپرد تھی، سنگاپور کے خاص پھاٹک پر ۶۵۰۰۰ برٹش فوج کا پہرا تھا، آسٹریلیا اور امریکہ کے زبردست ہوائی بیڑے آسمان پر پرواز کر رہے تھے، ڈچ کا طاقتور بحری بیڑا سمندر مین سرگرم عمل تھا، ان تمام روک تھام اور سعی و کوشش کے باوجود جاپانی شہنشاہیت کا ہیبتناک اژدہا مشرق بعید کے تمام ڈچ برٹش امریکی و فرانسیسی نوآبادیات کو ایک ایک کرکے نگل گیا، اب آیندہ دیکھیے کیا ہوتا ہے، اندونیسیا کے متعلق ضروری حالات و معلومات پیش کرنے کے بعد ٹائمس (۲۸ فروری ۱۹۴۲ء) کے اس اڈیٹوریل نوٹ پر مضمون ختم کیا جاتا ہے،

"مشرق بعید مین برطانوی اقتدار اپنی پرانی شکل مین کسی طرح واپس نہین لایا جا سکتا، دنیا کے اس حصہ کے آیندہ خاکہ مین پرانے برطانوی استحصال کے لئے کوئی جگہ نہین، بیسوین صدی کی دنیا کو برطانیہ اب بھی دیکھ سکتا ہے، برطانوی نوآبادیاتی نظام کے اندر جو روح کارفرما رہی ہے، اور اس کے ساتھ اس نظام کو چلانے کے لئے جو وسائل اختیار کئے گئے، ان کو دنیا کی تنقیدی عدالت نے کچھ بہت اچھی نظرون سے نہیں دیکھا، ان سخت نکتہ چینیون کو دور کرنے کا اس کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہین، کہ برطانوی مدبرین اس مسئلہ پر پھر ایماندارانہ نظر ڈالین، اور دوررس اور نتیجہ خیز اصلاحات عمل میں لائین"۔

جس ملک کے حالات کا ذکر اور باشندون کا تعارف پچھلے چند صفحات مین کیا گیا ہے وہی "میرا ملک و میری قوم" ہے۔

چینی مسلمان

ایک دردمند صاحب قلم چینی مسلمان نے چین کے مسلمانون کے مذہبی، اخلاقی، تمدنی، سیاسی، اقتصادی، تعلیمی حالات ہندوستانی زبان مین لکھے ہین،

ضخامت ۲۴۲ صفحے: قیمت ہے

مینجر

استدراک بر ترجمۂ ابن خلکان

از

جناب مولانا سید ابو ظفر صاحب ندوی ریسرچ اسکالر گجرات ورنیکلر سوسائٹی

فروری ۱۹۴۵ء کے معارف مین تاریخ ابن خلکان کے فارسی ترجمہ کے عنوان سے ہمارے مکرم دوست قاضی احمد میان صاحب اختر جونا گڈھی کا جو مضمون شائع ہوا ہے، اس کے متعلق کچھ باتین میرے علم مین بھی ہین، افادہ عام کے خیال سے اس کو مندرجہ ذیل سطور مین تحریر کرتا ہون،

اس کتاب کا فارسی ترجمہ جو ہندوستان مین ہوا، اس کے چار نسخون کا ذکر کیا گیا ہے، دو برٹش میوزیم لندن مین ایک محکمہ دیوانی حیدرآباد اور ایک پروفیسر شیرانی کے پاس ہے، ۱۹۳۸ء مین جب کہ مین لکھنؤ مین مقیم تھا، اور شبلی اکیڈمی کی طرف سے تاریخ ہند کے لئے مواد حاصل کرنے کی غرض سے شمالی ہند کے کتب خانون کا دورہ کر رہا تھا، تو مجھے معلوم ہوا کہ راجہ صاحب سلیم پور کے پاس بھی قابل قدر کتب خانہ ہے،

راقم جناب راجہ صاحب بالقابہ کا بیحد مشکور ہے، کہ انھون نے اپنے کتب خانہ سے مستفید ہونے کا موقع عنایت فرمایا، اس کتب خانہ مین ابن خلکان کے فارسی ترجمہ کا ایک نسخہ نامکمل نظر سے گذرا، یہ کتاب وہان کی فہرست مین فن تاریخ کے نمبر ۱۰ پر ہے، اس کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے:-

"آرایش دیباچہ مناقب و مآثر سلاطین رفیع مقدار و نمایش روزنامچہ خصائص و مفاخر خواتین گردون اقتدار ...... الخ"

خط نستعلیق زبان فارسی، خوشخط ۱ ½ بالشت طویل، اور ایک بالشت عریض کل صفحات (۷۰۹) ہین، اس کا آخری حصہ مفقود ہے، یعنی آخر سے ناقص ہے،

اس کا اختتام "سلطان صلاح الدین یوسف کے خرابی عسقلان بوقت جنگ صلیبی" پر ہوتا ہے، ظفر الوالہ مین اس کا نام "منظر الانسان" لکھا ہے[1] لیکن کتاب مذکور مین اس کا نام منظر الاعیان لکھا ہوا پایا، چونکہ ظفر الوالہ مین طباعت کی متعدد غلطیان موجود ہین، مثلاً کئی مقامون پر افغان کو اوغان لکھا ہے[2] اسی طرح کہین ارابہ اور کسی جگہ عرابہ تحریر کیا ہے، اس لئے میرا خیال ہے کہ ظفر الوالہ مین جو منظر الانسان لکھا ہے وہ بھی طباعت کی غلطی ہے، در اصل اس کا نام منظر الاعیان ہی ہوگا

ظفر الوالہ مین مصنف کا نام یوسف بن احمد بن محمد بن عثمان دیا ہے[3] لیکن سلیم پور کے مخطوطہ مین یوسف بن احمد بن عثمان ہے یعنی عثمان اور احمد کے درمیان محمد کا نام نہین ہے، حضرت عثمان شمع برہانی کی وفات ۸۶۳ھ مین ہوئی ہے اور (۲۶) برس بعد اس کتاب کا ترجمہ ہوا، اس وقت مترجم کی عمر تقریباً تیس چالیس ہونی چاہئے، ان کے ایک اور پوتے تھے جن کا نام سید عالم تھا، اور ان کی شادی شیخ داؤد نبیرۂ حضرت رکن الدین شکر گنج کی لڑکی سے اس وقت

---

[1] ظفر الوالہ ص ۳۰ [2] کتاب مذکور ص ۲۳، [3] ظفر الوالہ ص ۳۲۔

ہوئی تھی، جب کہ عثمان پورہ شہر سے باہر ابھی آباد نہین ہوا تھا[1]

محمود اعظم گجرات کا بہترین بادشاہ گذرا ہے، جس طرح دوارکا فتح کرنے کے بعد اس کی یادگار مین شفائے محمود شاہی کے نام سے واگھ بھٹ کا ترجمہ کرایا، اسی طرح جاپانیر کی فتح کے بعد اس نے ابن خلکان کی تاریخ کا ترجمہ کرنے کا حکم صادر کیا،

ابن خلکان کی نسبت یہ لطیفہ سننے کے قابل ہے، کہ خلکان خاندان برامکہ مین سے تھا، وہ بات بات پر فخریہ کہتا، کہ میرے بزرگ برامکہ مین ایسے تھے، اور ویسے تھے، جب لوگ سنتے سنتے عاجز آگئے، تو انھون نے کہنا شروع کیا کہ "خل ما کان" (جو ہوگیا اس کو جانے دو) رفتہ رفتہ لوگ اس کو "خل ماکان" کہنے لگے، جو کثرت استعمال سے خلکان ہوگیا[2]،

مترجم نے دیباچہ مین لکھا ہے، کہ فتح جاپانیر کی تاریخ ۸۸۹ھ ہے، اور اسی سال ترجمہ کا حکم ہوا لیکن اس کی ابتدا ۸۹۳ھ مین کی گئی، افسوس ہے کہ ڈاکٹر ریو نے یہ نہین بتایا، کہ شاہی حکم کا اجرا پانچ برس تک کیون ملتوی رہا، شخصی حکومتون مین شاہی احکام کا التوا بغیر کسی مخصوص وجہ کے نہین ہو سکتا، اصل حقیقت یہ ہے کہ اُس زمانہ مین یہ کتاب بہت نایاب تھی، اتنی مدت اس کے متعدد نسخون کو تلاش کرنے مین صرف ہوئی ہوگی،

مولانا یوسف صاحب عثمان پورہ کے اس مدرسہ کے معلم تھے، جو شمع برہانی کے وقت مین قائم ہوا تھا، ان کی ساری عمر تعلیم و تعلم مین گذری، کسی کتاب کے ترجمہ کا تجربہ ان کو نہ تھا، اسی لئے پہلا ترجمہ ۸۹۴ھ مین کیا، اس مین اکثر جگہ متن کا خلاصہ اور اختصار کرڈالا، عربی اشعار یا تو حذف یا بغیر ترجمہ کے نقل کر دیئے، غالباً اسی وقت اس کی متعدد نقلین بھی ہوئین، چنانچہ بعض کتب خانون مین اسکی نقل موجود ہے، اس مین بہت ہی مختصر دیباچہ ہے، جس مین حمد ثنا، نام بادشاہ، اور تاریخ فتح جاپانیر کے سوا کچھ نہین ہے،

پھر جب ۸۹۵ھ مین اس پر نظر ثانی کی تو اپنا دیباچہ علحدہ لکھا جس مین دستور کے مطابق بادشاہ کی مدح لکھی، اور عربی اشعار کا ترجمہ بھی کر دیا، لیکن مصنف کے دیباچہ کو حذف کر دیا، ترجمہ کے پہلے نسخہ کی نقل راجہ صاحب سلیم پور کے کتب خانہ مین اور دوسرے نسخہ کی نقل برٹش میوزیم مین ہے،

---

[1] خاتمہ مرآۃ احمدی اردو لاہور ص ۴۸ [2] النور السافر عن اخبار القرن العاشر بغداد

شعر الہند جلد اوّل

جس مین قدما کے دور سے لیکر دور جدید تک اردو شاعری کے تمام تاریخی تغیرات و انقلابات کی تفصیل کی گئی ہے، اور ہر دور کے مشہور اساتذہ کے کلام کا باہم موازنہ و مقابلہ کیا گیا ہے، قیمت ہے

شعر الہند جلد دوم

جس مین اردو شاعری کے تمام اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ وغیرہ پر تاریخی و ادبی حیثیت سے تنقید کی گئی ہے، قیمت ہے، مکمل سٹ ہے

منیجر

اردو کی دو قدیم کتابین

از

جناب ڈاکٹر سید نورالحسن ہاشمی، لکچرار اردو، لکھنؤ یونیورسٹی

"دیوان منعم اور مثنوی واقعات امامیہ کے زمانہ تصنیف کے بارہ مین جو موافق اور مخالف مضامین معارف مین شائع ہوئے تھے، اس سلسلہ مین جناب سید نورالحسن صاحب ہاشمی کی یہ ذاتی اور فیصلہ کن تحقیق موصول ہوئی ہے، اس لئے اس کی اشاعت کے بعد آیندہ اس سلسلہ مین اور کوئی مضمون شائع نہ کیا جائے گا "م"

رسالۂ معارف شمارہ جنوری ۱۹۴۵ء مین دیوان منعم اور مثنوی واقعات امامیہ کے متعلق پھر محمد خلیل صاحب بی ایس سی علیگ کا مضمون نکلا ہے، چونکہ مین انجمن ترقی اردو کی طرف سے پچھلے سال ان کتابون کے جانچنے پر مامور کیا گیا تھا، اس لئے میرا فرض ہے کہ اپنے خیالات کا اظہار ان کتابون کے متعلق کرون،

پچھلے سال جناب ولی محمد صاحب سجادہ نشین خانقاہ تجارہ عرس حضرت نظام الدینؒ اولیا مین شرکت کی غرض سے تشریف لانے والے تھے، تو قبلہ مولوی عبدالحق صاحب نے انھین لکھ دیا تھا، کہ اگر آپ اپنے ہمراہ یہ دونون کتابین لیتے آئین تو یہان دیکھنے پر واضح ہو سکے گا، کہ یہ کس عہد کی کتابین ہین، چونکہ مولوی صاحب قبلہ اُس زمانہ مین دہلی سے باہر جانے والے تھے، اس لئے یہ کام میرے سپرد کر گئے تھے،

مین نے مسجد قاضی حوض دہلی مین سجادہ نشین صاحب موصوف سے ملاقات کی، وہ صرف دیوان منعم اپنے ہمراہ لائے تھے، اور وہ بھی اوّل و آخر سے ناقص، اور بیچ کے اوراق بھی جگہ جگہ سے غائب تھے، مثنوی واقعات امامیہ کے متعلق ارشاد فرمایا کہ ان کے برادر کلان اُسے دہرہ دون اپنے ہمراہ لے گئے ہین، بعد کو دکھائی جا سکے گی،

دیوان منعم کو ایک نظر ہی دیکھنے سے معلوم ہو گیا، کہ یہ وسط بارھوین صدی سے پیشتر کا کلام نہین ہو سکتا، ولی کی غزلون پر کئی غزلین اس مین موجود ہین، یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح ولی کے دیوان کے پہنچنے پر دلی مین، حاتم، آبرو، مضمون، احسن، فائز وغیرہ نے اردو مین شاعری اور دیوان سازی شروع کر دی تھی، اور شعر و شاعری کی دنیا مین ایک ہل چل مچ گئی تھی، منعم نے بھی اپنا دیوان دوسرے شاعرون کی طرح ترتیب دینا شروع کیا، یہ صحیح ہے کہ اس عہد کے شاعرون مین سے جس کا کلام یا مکمل دیوان دستیاب ہو جائے تو وہ اردو ادب و شعر مین ایک اچھا اضافہ کریگا، لیکن منعم کے دیوان کو دسوین صدی ہجری کا کلام بتانا سرتا سر غلط اور بے سر و پا بات ہے،

حالانکہ مثنوی واقعات امامیہ سجادہ نشین صاحب موصوف اپنے ہمراہ نہین لائے تھے، لیکن اس کی قدامت کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے محمد خلیل صاحب نے اپنے مضامین مین غلام رسول صاحب مصنف مثنوی مذکور کو منعم کا چچا تبلایا ہے ظاہر ہے کہ اگر چچا بھتیجے کی عمر مین چالیس پچاس یا زیادہ سے زیادہ ساٹھ سال کا فرق بھی فرض کر لیا جائے تو بھی غلام رسول صاحب کسی طرح ہمایون کے زمانہ تک نہین پہنچتے، اس کے علاوہ اُن اشعار سے بھی جو مثنوی کے نمونتہً پیش کئے گئے ہین، یہ مثنوی

فرخ سیر یا زیادہ سے زیادہ اواخر عہد عالمگیری سے پیشتر کی نہین معلوم ہوتی، خود محمد شاہ کے زمانہ تک اس قسم کے ریختون کا رواج رہا، اور جس کے نمونے بھی کافی ملتے ہین، جس مین افعال اور حروف روابط فارسی کے ہوتے ہین، خود میر نے بھی اس قسم کے ریختہ کا ذکر اپنے زمانہ کے اقسام ریختہ مین کیا ہے اور اس قسم ریختہ کو قبیح گردانا ہے،

مین نے اپنے یہ سب خیالات سجادہ نشین صاحب موصوف سے عرض کر دیئے تھے اور یہ بھی کہا تھا کہ باوجود اس کے کہ یہ چیزین خارجی اور داخلی شواہد کی بنا پر اتنی قدیم ثابت نہین ہوتین، جتنا کہ خیال تھا، پھر بھی اپنے عہد کا اچھا نمونہ ہین، بہتر ہوگا کہ آپ یا تو ان کی نقلین انجمن کو بھجوا دین نقل کی اجرت انجمن کے ذمہ ہوگی، یا انجمن کے ہاتھ یہ نسخے فروخت کر ڈالین، کیونکہ وہان یہ چیزین زیادہ محفوظ رہ سکین گی، سجادہ نشین صاحب موصوف نے وعدہ بھی فرمایا تھا کہ وہ اپنے برادر بزرگ سے مشورہ کے بعد اپنے فیصلہ سے مطلع کرین گے، لیکن بعد کو باوجود یاد دہانیون کے سجادہ صاحب نے کوئی جواب عنایت نہین فرمایا نہ خود ان چیزون کو شائع کرایا، نہ اس کے مزید نمونے کسی رسالہ میں شائع کئے،

مین اس کے بعد خاموش ہوگیا، کہ نصیر الدین صاحب ہاشمی کے مضمون اور راقم کی گفتگو کے بعد غالبًا سجادہ نشین صاحب اس کی قدامت کے متعلق مزید کاوش نہ کرین گے، لیکن معارف شمارہ جنوری ۴۵ء مین پھر اس کوشش کو دیکھکر یہ مضمون سپرد قلم کرنا پڑا،

بہرحال اب رسالۂ ہذا کے ذریعہ پھر سجادہ نشین صاحب موصوف سے گذارش ہے کہ ان دونون کتابون کی قدامت کو خواہ مخواہ قدیم ترین مشہور کرانے کی کوشش نہ کیجائے، اگر ان کے پاس خارجی و داخلی ثبوت واقعی اس کے ہون تو بہتر ہوگا کہ وہ ان دونون کتابون کو ارباب بصیرت کے سامنے پیش کرین، تاکہ عینی مشاہدہ کے بعد کھوٹے کھرے کی تمیز یقینی طور پر ہو سکے، مولوی عبد الحق صاحب قبلہ کے خط نمبر ۹۴۳۵ کا حوالہ قدامت کے ثبوت مین دینا بالکل غلط طریقہ ہے، مولوی صاحب کا مطلب تو یہ ہے کہ اگر مثنوی مذکور ہمایون کے عہد کی ہوئی تو واقعی قابل قدر ہوگی، اور چونکہ وہ نہین ہے اس لئے مولوی صاحب بھی اس کے قائل نہین ہو سکتے،

محمد خلیل صاحب نے یقین دلانے کی کوشش کی ہے، کہ مثنوی مذکور پر سنہ کتابت اور دیباچہ مین ہمایون کی تعریف وغیرہ درج ہے لیکن مجھے اب بھی گمان یہی ہے کہ خلیل صاحب کو مضمون کے سیاق و سباق نیز تاریخ کتابت مثنوی مذکور کو پڑھنے اور سمجھنے مین سہو ہوا ہے، بہتر ہوگا کہ وہ بالاستیعاب مطالعہ فرمائین، اور مکرر سہ کرر، کیونکہ قرائن ایسے ہین کہ کسی صورت سے یہ مثنوی اتنی قدیم نہین ہو سکتی جتنا کہ کہا جاتا ہے، رہا دیوان منعم تو اس کے متعلق تو کوئی گفتگو کی گنجائش ہی نہیں ہے، وہ وسط بارہوین صدی سے پیشتر کی چیز ہو ہی نہیں سکتی،

آخر مین پھر عرض کرون گا کہ ان چیزون کی صحیح قدر اسی وقت ہو سکے گی جب ان کی قدامت کے شواہد دوسرون کے سامنے عینی طور پر پیش کئے جائین،

گل رعنا

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز عہد بعہد کے اردو شعراء کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار، اردو مین شعراء کا یہ پہلا مکمل تذکرہ ہے جس مین آب حیات کی غلطیون کا ازالہ کیا گیا ہے قیمت ؎ ضخامت ۵۴۰ صفحے، مینیجر

ادبیات

تابشِ سہیل

از جناب مولوی اقبال احمد خان صاحب سہیل

قفس میں بھی میری سعیِ پرافشانی نہیں جاتی   یہ فطرت کی تڑپ ظالم بہ آسانی نہیں جاتی
نظر اسرار تک بے نورِ ایمانی نہیں جاتی   حقیقت پہلے مانی جاتی ہے جانی نہیں جاتی
بصیرت وہ ہے جو ادراک کو حدِ نظر سمجھے   حقیقت وہ حقیقت ہے جو پہچانی نہیں جاتی
رگِ سودا بہت کھولی جفائے حسن نے لیکن   مزاجِ عشق کی شوریدہ سامانی نہیں جاتی
شرر تک بجھ چکے خاکسترِ دل کے مگر اب تک   نگاہِ شوق کی آلودہ دامانی نہیں جاتی
اگر ڈوبے تو گمنامی جو بچ نکلے تو رسوائی   وہ کشتی جو قریبِ موجِ طوفانی نہیں جاتی
قیامت ہے جنون کی وادیِ پرخار میں مرنا   یہ خاکِ پاک ہر نااہل سے چھانی نہیں جاتی

رہِ سعی و طلب مسدود گم ہیں قافلے والے
سہیل اب تک مگر تیری حدی خوانی نہیں جاتی

غزل

از جناب عزیز احمد صاحب ہلال جھانسی

درد ہے، غم ہے، خلش ہے، آرزو ہے، یاد ہے   دل کے ہر گوشہ میں اک دنیا نئی آباد ہے
صرف تو ہے دل میں یا پھر اک جہان آباد ہو   قید ہے اتنا ہی انسان جس قدر آزاد ہے
بے نیازانہ چلا آیا ہوں بزمِ حسن میں   شکر کرنا ہے کہ شکوہ یہ مجھے کب یاد ہے
شادمانی کے لئے ناشاد رہتا ہے جہان   اور دل ناشاد رہنے کے لئے ناشاد ہے
شرحِ غم کچھ بھی نہیں، قیدِ محبت کچھ نہیں   آپ فرمادیں جسے برباد وہ برباد ہے
عشق گویا ظاہر و باطن پہ ہے چھایا ہوا   لب پہ تیرا نام ہے، دل میں بھی تیری یاد ہے
ڈوب کر دل سے نکلنا سحر ہے آواز کا   یہ خدا جانے کہ وہ نغمہ ہے یا فریاد ہے
جب چٹکتی ہے کلی جھکتا ہے سر دیوانہ وار   میں سمجھتا ہوں کہ شاید مجھ سے کچھ ارشاد ہے

موت کیا ہے ان کی رحمت کا فرشتہ ہے ہلال
زندگی کیا خون میں ڈوبا ہوا جلاد ہے

مطبوعات جدیدہ

The Road to Peace and Pakistan (انگریزی)

جناب ضیاء الدین احمد صاحب سولیری، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۲۰ صفحے، کاغذ اوسط، کتابت وطباعت بہتر، قیمت ۱۲؎ ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار، لاہور،

یہ کتاب یورپ کی موجودہ جنگ کے خاتمہ سے پہلے لکھی گئی، لیکن مؤلف نے کتاب کو تحریر کرتے وقت یہ خطرہ محسوس کیا تھا کہ بڑی طاقتین ایک بین الاقوامی نظام کا خواب دیکھ رہی ہین جس کے اقتدار سے کوئی ریاست باہر نہین ہوگی، گویا ایک دوسری مجلس اقوام (لیگ آف نیشنز) قائم ہوگی جس مین پھر وہی تفریق اور کمزورون پر طاقتورون کا غلبہ ہوگا، اور یہ نظام آیندہ ایک دوسری جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوگا، لایق مولف کا خیال ہے کہ گو سائنس کی ترقی نے دنیا کی ہیئت بدل دی ہے، اور دنیا کے مختلف ممالک پہاڑون، دریاؤن اور سمندرون کی حدبندیون سے علحدہ اور دور نہین کئے جا سکتے، لیکن ان ممالک کے باشندون کے خیالات مین اب تک اتحاد پیدا نہین ہو سکا، جس کا لازمی نتیجہ ان مین اختلاف ہے، چنانچہ آج دنیا کی فلاح وبہبود کا دعویٰ کرنے والے مفکرین کے سیاسی اتحاد سے پہلے انسانی خیالات کے اتحاد کا مسئلہ قابلِ غور ہے، مولف کی رائے ہے کہ دنیا کی بھلائی اس مین ہے کہ ان چھوٹے چھوٹے ملکون کا جو اپنے خیالات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے قریب تر ہون، ایک منطقہ قائم کیا جائے، سوویٹ روس کی متحدہ جمہوری ریاستین اسی کی مثال ہین، امریکہ اور برطانیہ کے اتحاد کی استواری اسی کا نتیجہ ہے، اسی اصول کے ماتحت مؤلف کا خیال ہے کہ اسلامی ریاستون کا وفاق بھی قائم ہو سکتا ہے، ان منطقیانہ دلائل سے ہندوستان مین پاکستان کی ضرورت کو ثابت کیا گیا ہے، گو پاکستان کے مخالفین کے لئے یہ دلائل ومباحث قابل قبول نہین کیے جا سکتے، مگر مولف کا طرزِ تحریر اور انداز بیان جذبات پر مبنی نہین، بلکہ ہر مسئلہ کو سنجیدگی سے حل کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اور یہ کتاب اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والون کے لئے لائق مطالعہ ہے،

Through Pakistan to Freedom (انگریزی) از جمیل الدین احمد لکچرار

شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی علیگڈھ، تقطیع چھوٹی، ضخامت ۱۱۳ صفحے، کاغذ اوسط، طباعت بہتر، قیمت ۱-۸؎ ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور،

جناب جمیل الدین احمد صاحب لکچرار شعبۂ انگریزی مسلم یونیورسٹی کو ہندوستانی مسلمانون کے سیاسی مسائل سے گہری دلچسپی ہے، اس سے پہلے وہ ہندوستان کی آئینی گتھی، اور محمد علی جناح کی تازہ تحریرین اور تقریرین مرتب کرکے پیش کر چکے ہین، اس لئے ہندوستانی مسلمانون کی سیاست پر ان کی رائے قابلِ غور ہے، زیرِ نظر کتاب مین مؤلف نے مسلمانون کی سیاسی بیداری کے اسباب وعلل کی تاریخ پر ہر زاویۂ نظر سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے، اور پاکستان کے مخالفین کے اعتراضات سے بھی بحث کی ہے، انداز بیان متین وسنجیدہ ہے، گو پاکستان کی حمایت مین کہین کہین استدلال کی بنیاد کمزور ہے، مثلاً کسی انگریز کا خواہ کیسا ہی ذمہ دار عہدہ دار یا سیاسی مفکر کیون نہ ہو، یہ کہدینا کہ مسلمان ایک علحدہ انفرادیت کے مالک ہین

کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، مسلمان خود ایک مستقل مذہبی، سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی نظام رکھتے ہیں، اس لحاظ سے وہ ایک علیحدہ قوم ہو سکتے ہیں، تو اسی اصول پر اس بحث کی بنیاد ہونی چاہئے، ورنہ ایک انگریز کی موافق رائے کو دوسرے انگریز کی مخالف رائے سے معترضین آسانی سے رد کر سکتے ہیں،

The Arab Civilization از جوزف ہیل، مترجمہ صلاح الدین خدا بخش تقطیع بڑی ضخامت ۱۶۰ صفحے، کاغذ اوسط طباعت بہتر قیمت ہے، ناشر شیخ محمد اشرف، کشمیری بازار لاہور،

یہ کتاب جرمنی کے مشہور مستشرق ڈاکٹر جوزف ہیل کی تصنیف ہے، جس کو صلاح الدین خدا بخش مرحوم نے جرمن زبان سے انگریزی میں ترجمہ کیا تھا، بعض یونیورسٹیوں میں یہ تاریخ اسلام کے نصاب میں داخل ہے، اس لئے شیخ محمد اشرف لاہور نے اس کا دوسرا اڈیشن شائع کیا ہے، اس کا اردو ترجمہ بھی جامعہ ملیہ دہلی سے ۲۹ء میں شائع ہو چکا ہے، مگر اس کتاب میں جرمن مصنف نے اپنے مستشرقانہ تبصرہ میں کچھ ایسے قیاسات و نتائج استنباط کئے ہیں جن کا مقصد دلنشین پیرایہ میں مسلمانوں کے مذہب، تاریخ اور تمدن کے خلاف محض زہر چکانی ہے، گو فاضل مترجم جناب صلاح الدین خدا بخش نے جابجا تردیدی حواشی ضرور لکھ دیئے ہیں، مگر وہ بالکل ناکافی ہیں، اسی لئے ہندوستان کے مسلمانوں میں جب انگریزی اور اردو کے ذریعہ سے اس کتاب کو روشناس کرنے کی کوشش کی گئی تو اس پر سخت تنقیدیں ہوئیں، چنانچہ معارف (مئی ۳۹ء) میں بھی اس پر ایک بہت ہی طویل تبصرہ شائع ہو چکا ہے جس کا اعادہ کرنا تحصیل حاصل ہے، لیکن جن یونیورسٹیوں میں یہ کتاب نصاب میں پڑھائی جاتی ہے، وہاں کے اساتذہ خصوصاً مسلمان اساتذہ سے یہ گذارش ضرور ہے، کہ اگر اسلام کی تاریخ کے سلسلہ میں اس کتاب کو اہمیت دی گئی تو یہ اسلام سے سراسر نادان دوستی ہوگی،

A Shi'ite Creed (انگریزی) مترجمہ جناب اے۔ اے۔ اے فیضی، ضخامت ۱۴۴ صفحے، کاغذ و طباعت بہتر، قیمت ندارد، ناشر اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن، بمبئی،

یہ رسالہ شیعوں کے مشہور مجتہد عالم ابو جعفر محمد بن علی ابن بابویہ القمی المعروف بہ شیخ صادوق کی کتاب رسالۃ الاعتقادات الامامیہ کا انگریزی ترجمہ ہے، مصنف اثنا عشری شیعوں کے بڑے مستند عالم سمجھے جاتے ہیں، اور ان کی یہ تصنیف شیعی عقائد کی تشریح و توضیح میں بڑی قدیم کتاب سمجھی جاتی ہے، مترجم نے کئی نسخوں کی مدد سے انگریزی ترجمہ کیا ہے، شروع میں مصنف کے حالات اور ان کی تصانیف پر مفید معلومات ہیں اور انگریزی متن کے ساتھ ضروری حواشی بھی ہیں،

پارلیمانی طرزِ حکومت از جناب منظور احسن صاحب ہاشمی بی اے تقطیع چھوٹی ضخامت ۴۹ صفحے، کاغذ کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱۲ ر پتہ دار الاشاعت سیاسیہ مجلس اتحاد المسلمین، اشاعت منزل اردو گلی حیدرآباد دکن،

موجودہ ضروریات کے پیش نظر حیدرآباد کے ادارہ دار الاشاعت سیاسیہ نے سیاسیات پر چھوٹے چھوٹے مفید رسالوں کا سلسلہ شروع کیا ہے، مذکورۂ بالا کتاب پارلیمانی طرز حکومت پر ہے، اس میں اس طرز حکومت کا اجمالی خاکہ بیان کر کے برطانیہ، فرانس، سوئٹزر لینڈ اور آسٹریلیا کی جمہوریتوں کے نظام اور اس کے اجزا پر روشنی ڈالی گئی ہے، جس سے پارلیمانی حکومتوں کے دستوری نظام کا اندازہ ہو جاتا ہے، برطانوی نظام کے حالات کسی قدر تفصیلی ہیں، آخر میں چند سیاسی اصطلاحات کی تشریح ہے جو اس کتاب میں استعمال کی گئی ہیں کتاب گو مختصر ہے لیکن مفید ہے،

"ع - ۱"

آخری درج شدہ تاریخ پر یہ کتاب مستعار
لی گئی تھی مقررہ مدت سے زیادہ رکھنے کی
صورت میں ایک آنہ یومیہ دیرانہ لیا جائیگا۔

[illegible]

[illegible]

۱- [illegible]

[illegible]

۲- [illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

۳ [illegible]

[illegible]

۴ [illegible]

۵- [illegible]

[illegible]

۶- [illegible]

[illegible]

۷- [illegible]

[illegible]

۸- [illegible]

[illegible]